رقصانِ سرِ بازار



انور احسن صدیقی

سرِ آغاز

اس مجموعے میں شامل یہ چار طویل کہانیاں چار مختلف اخباری خبروں پر مبنی ہیں۔ خبریں تو محض چند سطری اور نامکمل ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک خبر اپنے اندر اَن کہی داستانوں کے ایک پیچ در پیچ سلسلے کو چھپائے ہوئے ہے۔ مَیں نے اِن اَن کہی داستانوں کو حرف و صوت میں ڈھالنے کی اور ان کو ایک ہی موضوع کے تابع کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ ان چار الگ الگ عورتوں کی کہانیاں ہیں جو زندگی کے سفر کے دوران راستوں کے پیچ و خم میں الجھ کر کوٹھے پر پہنچ گئیں۔ یہ چاروں عورتیں مختلف راستوں سے کوٹھے تک پہنچیں لیکن ان میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ کہ یہ سب کی سب سماجی جبر کا شکار تھیں جو صدہا شکلوں کا حامل ہوتا ہے۔ کسی عورت کے لئے کوٹھے تک پہنچنے کے تو بہت سارے راستے ہوتے ہیں لیکن یہاں سے واپسی کا شاید کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

ہمارے مردانہ غلبے والے معاشرے میں عورت کی شخصیت کا تعین مرد کے ساتھ اس کے کسی نہ کسی رشتے کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ اسے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی قرار دیا جاتا ہے اور ان سارے رشتوں کو محترم گردانا جاتا ہے لیکن مرد کے ساتھ اس کا ایک اور ایسا رشتہ بھی ہے جس کے ذکر سے بہت سی ثقہ پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں جبکہ فی الحقیقت یہ رشتہ ایسا ہے جو مرد کی مکمل شرکت کے بغیر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہ طوائف کا رشتہ ہے۔

ان چاروں کہانیوں میں اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ناسازگار عوامل کتنے مختلف النوع ہو سکتے ہیں جو کسی عورت کو ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کے رشتوں سے الگ کر کے صرف طوائف کے رشتے کو اس کی پہچان مقرر کر دیتے ہیں اور پھر اس پہچان سے چھٹکارا حاصل کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔

انور احسن صدیقی

فرشتوں کا تحفہ

(متاثرین انویسٹرز کا مظاہرہ)

کراچی (پ ر) پاکستان انویسٹرز ایکشن کمیٹی کی اپیل پر جمعہ کو سرمایہ کار کمپنیوں کے متاثرین نے ریگل چوک پر زبردست مظاہرہ کیا ہے۔ مظاہرہ میں خواتین بھی بڑی تعداد میں شریک تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں بینرز اور پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے جن پر رقوم کی جلد واپسی کے مطالبات نمایاں تھے۔ مظاہرین اپنی رقوم کی جلد واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پاکستان انویسٹرز ایکشن کمیٹی کے رہنماؤں نے مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وفاقی وزیر داخلہ گیارہ ماہ سے محض گیارہ یا پندرہ کمپنیوں اور بعض قانونی پیچیدگیوں کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ بے ایمان سرمایہ کار کمپنیوں کے اسکینڈل میں صرف گیارہ یا پندرہ جعلی کمپنیاں ہی ملوث نہیں' ان کی صحیح تعداد تین سو اڑتیس ہے۔ انہوں نے کہا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ اٹھانوے جعلی سرمایہ کار کمپنیوں کے کیس سی آئی اے میں منتقل کئے گئے تھے جو سب کے سب عوامی حکومت کے نمائندوں کی ایما پر ایس ایس پی' سی آئی اے کراچی نے داخل دفتر کر دیئے جس کے ساتھ ساڑھے دس ہزار متاثرین کی شکایات بھی داخل دفتر ہو گئیں اور ان کے تقریباً ایک ارب روپیہ کی واپسی کے امکانات بھی ختم ہو گئے۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی - 28 اکتوبر 1989ء)

مشین میں خرابی ہوئی تو صفیہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ یہ ایسی منحوس مشین تھی کہ کسی طرح خراب ہی نہیں ہوتی تھی۔ ہفتے' بلکہ بسا اوقات مہینے گزر جاتے تھے اور اس میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ بس' چلے جاتی تھی۔ چلے جاتی تھی' کھٹاکھٹ' کھٹاکھٹ' کھٹاکھٹ اور اس کے ساتھ ہی صفیہ کے دونوں ہاتھوں کو بھی متحرک رہنا پڑتا تھا۔ مشین کی پیہم گردش کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی گردش کرتے رہتے تھے اور وہ سیل بند ہونے والی چھوٹی چھوٹی عود کی شیشیوں کو ایک خاص ترتیب سے لگاتی جاتی تھی۔

مشین بند ہوئی تو تیار شیشیوں کی آمد بھی رک گئی اور صفیہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے جھٹک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک گہری طمانیت آمیز مسکراہٹ تھی۔

مشین سے زیادہ وہ فورمین منحوس تھا جو اسے زیادہ دیر تک خراب رہنے ہی نہیں دیتا تھا۔ جیسے ہی مشین خراب ہوتی وہ اپنا سارا تام جھام لے کر وہاں آن موجود ہوتا۔ اس کے ساتھ کوئی ایک آدھ ہیلپر ہوتا اور وہ تھوڑی ہی دیر میں ٹھونکا پیٹی کر کے مشین کو دوبارہ چالو کر دیتا اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو کر نئے سرے سے چلنے لگتی تو وہ مسکرا کر' بڑی فاتحانہ اور پُرافتخار نظروں سے صفیہ کی طرف دیکھتا اور عام طور سے اس کی زبان سے ایک ہی نوعیت کے الفاظ ادا ہوتے۔ "لو صفیہ بی بی! بسم اللہ کرو۔ مشین ٹھیک ہو گئی ہے۔"

اور اس وقت صفیہ کا جی چاہتا کہ اس ادھیڑ عمر کے سانولے دبلے' پتلے فورمین کا منہ نوچ لے جو اسے اتنی جلدی مشین کے ٹھیک ہو جانے کی اطلاع دے کر دوبارہ کام سے لگا رہا تھا۔ کیا یہ بدبخت کچھ زیادہ دیر تک مشین کو خراب نہیں رکھ سکتا تھا؟ کیا نقصان ہو جاتا اس کا اگر یہ آدھے پونے گھنٹے مزید مشین کو بگڑا ہوا رہنے دیتا۔ اگر اتنی دیر تک مشین کام نہ کرتی تو کون سی قیامت برپا ہو جاتی؟ کیا فیکٹری کے مالک کنگال ہو جاتے؟ ان کی دولت میں کون سی کمی آ جاتی؟ وہ تو پہلے ہی دونوں ہاتھوں سے اس قدر دولت کما رہے تھے کہ اس کا کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ پیسہ تھا کہ آسمان سے برس رہا تھا اور زمین سے اُگ رہا

تھا۔ کیسا اندھیر مچا ہوا تھا۔ کہیں کوئی روک نہیں تھی، کوئی قدغن نہیں تھی۔ مکمل آزادی تھی، کمانے کی، پیسہ بنانے کی اور زیادہ سے زیادہ پیسہ بنانے کی۔ تو اگر فورمین عبدالقادر ایک مشین کو زیادہ دیر تک خراب رہنے دیتا اور اس کے نتیجے میں صفیہ کو کچھ زیادہ دیر تک آرام کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا؟ مگر اس لعنت کے مارے عبدالقادر کو تو ہر وقت اپنی کارکردگی دکھاتے رہنے کا جو شوق تھا، ادھر کوئی مشین خراب ہوئی اور ادھر وہ آ موجود ہوا اور بس دیکھتے ہی دیکھتے مشین ٹھیک .... دوبارہ چالو .... کام شروع۔

اس وقت مشین خراب ہوئی تو صفیہ نے پہلے تو خود اس کا جائزہ لے کر اس کی خرابی کا پتہ لگانے کی کوشش کی لیکن جب خرابی کا علم نہیں ہو سکا تو اس نے موٹر بند کر دی اور اطمینان سے ایک طرف کھڑی ہو گئی اور پھر چند منٹ کے بعد جا کر شفٹ انچارج کو مطلع کر دیا کہ مشین خراب ہو گئی ہے۔ شفٹ انچارج نے فورمین عبدالقادر سے رابطہ قائم کیا لیکن وہ اس وقت کسی دوسری مشین کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھا اور فوری طور پر نہیں آ سکتا تھا۔ صفیہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ فورمین عبدالقار فوری طور پر نہیں آ سکتا تو اس کو دلی مسرت ہوئی۔

مشین خراب تھی اور اس میں صفیہ کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو اپنا کام کر رہی تھی اور کرنے کے لئے تیار تھی۔ اب یہ تو مشین کا قصور تھا کہ وہ چلتے چلتے بند ہو گئی، اس میں صفیہ کیا کرے؟

صفیہ کچھ دیر تک مشین کے پاس کھڑی رہی اور پھر اس کے بعد وہ وہاں سے ہٹ آئی اور ایک دوسری مشین کے پاس جا کر روبینہ سے باتیں کرنے لگی جو اپنی مشین پر کام کرنے میں مصروف تھی لیکن اس کا کام ایسا تھا کہ باتیں کرنے سے اس میں کوئی خاص رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی تھی۔

صفیہ کو ان مشینوں پر کام کرنا ذرا بھی پسند نہ تھا۔ اسے اپنے اس کام سے ذرہ برابر بھی لگاؤ نہیں تھا اور اس کا بس چلتا تو وہ آج ہی اس مشین پر لات مار کر اور اس فیکٹری کو چھوڑ کر سیدھی اپنے گھر کا راستہ لیتی لیکن اس صورت میں وہ ایک ہزار آٹھ سو پچھتر روپے کی رقم اس سے محروم رہ جاتی جو اسے ہر ماہ یہاں سے ملتی تھی اور جس سے اس کا گھر چلتا تھا۔

ایک ہزار آٹھ سو پچھتر روپے کی اس رقم کے عوض، جو وہ ہر ماہ یہاں سے حاصل کرتی تھی، اسے یہاں روزانہ آٹھ گھنٹے مسلسل ایک ایسا کام کرنا پڑتا تھا جس سے اسے

کبھی کوئی دلچسپی نہیں پیدا ہو سکی۔

فیکٹری میں ایک صبح سے لے کر شام تک جو کچھ وہ کرتی تھی وہ اس کے لئے کسی مسرت یا طمانیتِ قلب کا باعث کبھی نہ بن سکا۔ یہ سب کچھ اس کے لئے ایک ایسا بوجھ تھا جس کے تلے اس نے اپنے وجود کو ہمیشہ کچلا ہوا اور زخم خوردہ محسوس کیا اور وہ اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے اس وجہ سے مجبور تھی کیونکہ اس کے عوض اسے ایک ہزار آٹھ سو پچھتّر روپے ماہانہ کی رقم ملتی تھی۔

اگر وہ اس بوجھ کو اپنے وجود کے اوپر سے اتار کر پھینک دیتی تو ہر ماہ پابندی سے ملنے والی یہ رقم اس کے ساتھ ہی بند ہو جاتی اور صفیہ کے لئے گھر کا چلانا مشکل ہو جاتا۔

پیسے بنانے کا یہ کام صفیہ صرف خود ہی نہیں کرتی تھی، فیکٹری میں موجود سارے مزدور ہر صبح ساڑھے آٹھ بجے سے لے کر شام کے ساڑھ پانچ بجے تک یہی کام کرتے تھے۔ وہ سب مشینوں کے پہیوں کو گھماتے رہتے تھے اور پیسے بناتے رہتے تھے۔ وہ سارا دن پیسے بناتے تھے۔

اس کے برخلاف، مالکان میں سے کوئی بھی ساڑھے نو، دس بجے سے پہلے دفتر نہیں آتا تھا اور پھر وہ اپنی مرضی کے مالک تھے، جب جی چاہتا تھا آتے تھے اور جب چاہتا تھا چلے جاتے تھے۔ وہ تو کسی کے سامنے جواب دہ تھے اور نہ کسی کے پابند۔

سیٹھ اور اس کے دو بیٹے .... تین مالک تھے اس فیکٹری کے جو کوئی پہیہ نہیں گھماتے تھے .... پہیہ تو صرف کارکن گھماتے تھے، مزدور گھماتے تھے اور پہیوں کے گھومنے کے ساتھ ساتھ پیسے بنتے جاتے تھے، دولت کی بارش ہوتی جاتی تھی آسمان سے ہن برستا تھا اور یہ سارے کا سارا ہن مالکوں کی جیب میں چلا جاتا تھا اور کارکن تو خالی پہیہ گھماتے رہ جاتے تھے۔

مالکوں کو حاصل ہونے والی آمدنی کے مقابلے میں کارکنوں کو جو کچھ ملتا تھا وہ صفیہ کی نظروں میں ایک حقارت آمیز تمسخر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اور صفیہ نے اس عمل کو ہمیشہ نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔

تینوں مالکان میں سے ہر ایک بیک وقت کئی کئی کوٹھیوں اور کاروں کا مالک تھا۔ ہر ایک کے پاس کراچی اور ملک کے دوسرے شہروں اور حصوں میں نہ جانے کتنے کتنے پلاٹ موجود تھے۔ بینکوں میں خدا معلوم کتنی رقم تھی اور کتنی رقم وہ تھی جس کا کوئی حساب درج نہیں تھا۔

اور اس کے برخلاف صفیہ کے لئے تو ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے مکان کے کرائے کے لئے بھی پیسے نکالنا ایک مسئلہ بن جاتا تھا۔ اس کا کوئی چھوٹا سا بھی ذاتی مکان نہیں تھا۔ اس کے پاس کراچی کے کسی دوردراز گوشے میں بھی کوئی پلاٹ نہیں تھا اور نہ وہ اس بات کا تصور کرسکتی تھی کہ اپنی تنخواہ سے اپنے موجودہ وسائل سے اپنے لئے کوئی چھوٹا سا ہی گھر حاصل کرسکے۔

وہ سارا دن پہیہ گھماتی رہتی تھی لیکن پیسے بنانے والا یہ پہیہ اس کے لئے نہیں دوسروں کے لئے گھومتا تھا۔ پہیہ مسلسل گھومتا رہتا تھا اور پیسے بناتا رہتا تھا لیکن اس میں صفیہ کا حصہ ایک ہزار آٹھ سو پچھتر روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں تھا۔ جس پہیے کو صفیہ چلاتی تھی' اس سے اتنی رقم تو شاید کچھ دیر میں ہی بن جاتی تھی' پھرباقی تمام وقت اسے دوسروں کے لئے پہیہ گھمانا پڑتا تھا۔

کل ہی اس نے آفس میں اکاؤنٹنٹ کو کسی سے چپکے چپکے یہ کہتے سنا تھا کہ اس بار مالکوں نے انکم ٹیکس کمشنر کوپانچ لاکھ روپے کی رشوت دی ہے۔

"جب پانچ لاکھ روپے کی رقم صرف رشوت کی مد میں دی گئی ہے تو کتنا انکم ٹیکس بچایا گیا ہو گا۔" صفیہ نے دل میں سوچا تھا۔ "اور جب اتنا انکم ٹیکس واجب الادا ہو گا تو انکم کتنی ہو گی.........." اور یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اس کا دماغ چکرانے لگا تھا۔

صفیہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے اس نے ایک نامہربان' روکھی پھیکی' بے کیف' تلخ اور بوجھل زندگی کو اپنے ہمرکاب پایا تھا اور تب سے اب تک طرح طرح کے آزار جھیلتے جھیلتے دل و دماغ جیسے کند ہو گئے تھے اور وہ خود پتھرا کر رہ گئی تھی۔

ایک ہلکا سا' دھندلا دھندلا سا غیرواضح اور مبہم سا منظر اب بھی کبھی کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرتا تھا۔ اس منظر میں کوئی چیز بھی واضح اور متعین نہیں تھی' سوائے اس بات کے کہ یہ ایک موت کا منظر تھا۔

فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی اور اس چٹائی پر ایک سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش رکھی تھی۔ لاش کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اس چہرے کو دیکھ سکتی تھی لیکن اسے وہ چہرہ اب بالکل یاد نہیں تھا۔ اس منظر میں وہ لاش کے قریب کھڑی ہوئی رو رہی تھی' اس کے دونوں چھوٹے بہن بھائی قریب ہی زمین پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اتنے چھوٹے تھے کہ موت کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس گھر پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور کون مرگیا ہے اور خود صفیہ کو بھی ٹھیک سے کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا ہوا ہے۔ ہاں

اُسے اتنا معلوم تھا کہ ابا مرگئے ہیں اور اماں زار و قطار رو رہی ہیں اور وہ خود بھی ان کے ساتھ رونے میں شریک ہے' وہ اس لئے رو رہی تھی کیونکہ اماں رو رہی تھیں اور اماں اس لئے رو رہی تھیں کہ ابا مرگئے تھے۔ پوری فضا گریہ زاری سے بوجھل ہو رہی تھی۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس وقت گھر میں بہت سے لوگ تھے' وہ کمرہ جہاں چٹائی پر اس کے ابا کی سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش پڑی تھی' طرح طرح کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا' جن میں آدمی اور عورتیں' دونوں شامل تھے' لیکن صفیہ کو ان میں سے کسی کی شکل یاد نہیں تھی۔

اور پھر دھیرے دھیرے گھر خالی ہوتا گیا تھا۔ جو عزیز رشتے دار وغیرہ رکے تھے' وہ چلے گئے' پُرسہ دینے والے آتے تھے اور تھوڑی دیر تک بیٹھ کر اپنے دلی افسوس کا اظہار کرکے وہاں سے چلے جاتے تھے۔

یہ سب کچھ تو صفیہ کو بہت دھندلا دھندلا یاد تھا۔ وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی جب اس کے باپ کا جو ایک پرائیویٹ فرم میں کلرک تھا' اپنڈکس کے پھٹ جانے کی وجہ سے اچانک انتقال ہوگیا تھا اور یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور غیرمتوقع طور پر ہوا تھا کہ اس کی ماں ایک عرصے تک اس صدمے سے سنبھل نہیں پائی تھی۔

امداد حسین کے پیٹ میں اس شام کو ہلکا ہلکا درد اٹھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا گیا تھا۔ اس کی بیوی اور صفیہ کی ماں' صائمہ پڑوس کے ڈاکٹر کے پاس چلی گئی اور اسے حال بتا کر دوا لے آئی' امداد حسین نے دوا پی لیکن اس کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

آدھی رات کے قریب درد ناقابل برداشت ہو گیا اور امداد حسین مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور تب صائمہ کچھ پڑوسیوں کی مدد سے اسے ایک ٹیکسی میں ڈال کر سول ہسپتال لے گئی۔

جب آر ایم او آیا اور اس نے مریض کا معائنہ کیا تو وہ بھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ اپنڈکس کا درد ہے۔ وہ ایک نوجوان ڈاکٹر تھا اور اس کا علم اور تجربہ' دونوں بہت کم تھے۔ تاہم اس نے سینئر ڈاکٹر کو بلوایا اور یہ تشخیص ہو گئی کہ مریض کو اپنڈکس کا درد ہے اور اس کا فوراً آپریشن کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس آپریشن کی نوبت نہیں آئی۔ سرجن کے آنے سے پہلے ہی اپنڈکس پھٹ گیا اور امداد حسین مرگیا۔ وہ لوگ ہسپتال سے اس کی لاش ہی لا سکے تھے۔

صفیہ کو یہ سب کچھ اس کی ماں عاصمہ نے بتایا تھا اور وہ رو رو کر یہی کہتی تھی کہ اگر ان لوگوں کے پاس پیسے ہوتے اگر وہ امداد حسین کو سرکاری خیراتی ہسپتال کے بجائے کسی پرائیویٹ ہسپتال میں لے جانے کے اہل ہوتے تو امداد حسین نہ مرتا۔ اگر اس کا بروقت آپریشن ہو جاتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ زندہ نہ رہتا لیکن اسے تو ہسپتال والوں نے مار دیا تھا۔

عاصمہ ایک بالکل معمولی پڑھی لکھی عورت تھی' بس اردو لکھ پڑھ سکتی تھی' وہ بھی معمولی سی۔ باقاعدہ اسکول جانے اور ٹھیک سے پڑھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ ماں باپ نے جلدی جلدی شادی کر کے اپنے سر سے بوجھ اتارا اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر مطمئن ہو گئے۔ اب آگے وہ جانے اور اس کی قسمت اور جہاں تک قسمت کا تعلق تھا تو وہ تو کبھی بھی عاصمہ پر مہربان نہیں رہی۔

شوہر کے مرنے کے بعد وہ کیا کر سکتی تھی؟ اگرچہ وہ نوجوان تھی' خوبصورت تھی' دلکش تھی اور اس کے لئے دوسری شادی کرنے کے امکانات ختم نہیں ہوئے تھے لیکن اب وہ اپنی محبتوں کو تقسیم نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی' جو ابھی بہت چھوٹے تھے۔ اگر وہ دوسری شادی کرتی تو اسے اپنی شخصیت کو' اپنی محبت کو' دو الگ الگ خانوں میں بانٹنا پڑتا۔

عاصمہ پڑھ لکھی تو نہیں تھی لیکن ذاتی زندگی کے ان مسائل اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لئے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے بارے میں' اپنے بچوں کے بارے میں' ان سب کے مستقبل کے بارے میں بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ سوچا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ دوسری شادی اس کے بچوں کے لئے اور خود اس کے لئے بھی ایک خسارے کا سودا ہو گا۔

چنانچہ شوہر کے مرتے ہی اس نے سلائی کی مشین سنبھال لی۔ ابتدا میں پاس پڑوس والوں کے کچھ کپڑے سینے شروع کئے اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ پھیلتا گیا۔

وہ ہاتھ سے چلنے والی سلائی کی مشین کے اوپر جھکی جھکی اپنے آپ کو مٹاتی رہی' اپنے آپ کو ملیامیٹ کرتی رہی اس مشین کا پہیہ گھومتا رہا اور اس کے ساتھ ہی عاصمہ کی زندگی کا پہیہ بھی گھومتا رہا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشین کے پہیے کے مقابلے میں زندگی کے پہیے کے گھومنے کی رفتار زیادہ تیز ہو گئی ہے۔

اپنی زندگی کے تلخ تجربات کی روشنی میں وہ اس ٹھوس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے

بچوں کو پڑھانا ضرور چاہئے' انہیں اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہئے' عمران تو خیر لڑکا تھا اور لڑکے کے لئے تو تعلیم کے بغیر کسی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن صفیہ اور روبینہ کے لئے بھی' جو دونوں لڑکیاں تھیں' عاصمہ نے تعلیم کو اشد ضروری سمجھا۔

"اگر آج میں لکھی پڑھی ہوتی تو مجھے یوں آدھی آدھی رات تک مشین پر جھکے جھکے اپنی آنکھیں نہیں پھوڑنی پڑتیں۔" وہ اکثر بڑی گہری اداسی کے ساتھ سوچتی۔ "کوئی تعلیم میرے پاس ہوتی' کوئی ہنر میرے ہاتھ میں ہوتا تو مجھے کہیں اچھی سی نوکری مل سکتی تھی۔ نہ بہت اچھی سہی' معمولی نوکری تو مل ہی سکتی تھی۔ کتنی لڑکیاں ہیں جو آج کل دفتروں میں کام کر رہی ہیں۔"

چنانچہ اس نے صفیہ' روبینہ اور عمران' تینوں کو اسکول میں داخل کروایا۔

"کبھی تو وہ وقت آئے گا جب میں آرام کر سکوں گی۔" وہ اپنے تھکے ماندے شکستہ و ریختہ وجود کے ساتھ سوچتی۔ "بچے بڑے ہو جائیں گے' صفیہ اور روبینہ کی تو شادیاں ہو جائیں گی اور وہ اپنے اپنے گھروں کو چلی جائیں گی' عمران میرے ساتھ رہے گا۔ اس کی بیوی ہو گی اور وہ دونوں مجھے سہارا دیں گے۔" عمران کے بچوں کے تصور کے ساتھ ہی اس کے دل میں جیسے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

گھر کے کام کاج کے علاوہ اس کے پاس جتنا بھی وقت ہوتا تھا وہ سارے کا سارا سلائی میں صرف ہوتا تھا۔ وقت بھاگتا تھا اور وہ اسے پکڑنے کی بے سود کوشش کرتی تھی۔ سینے والے کپڑوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے اور وہ جلدی جلدی انہیں نمٹانے کے لئے ایک ایک لمحے کا حساب کرتی' ایک ایک لمحے کے پیچھے بھاگتی' لمحوں کو چراتی' ان کی چھین جھپٹ کرتی' کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے' کچھ اس کام سے' کچھ اس کام میں سے۔ ابھی چولہے پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا ہے۔ جتنی دیر میں پانی ابلے گا اتنی دیر میں اس دامن کا بخیہ مکمل ہو سکتا ہے۔ کھٹاکھٹ کھٹ کھٹ .... چاول دھو کر بھگو دیئے ہیں جب تک ذرا پھول لیں گے' تب تک یہ گلے کی پٹی لگ جائے گی .... کھٹاکھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔ آٹا گوندھ کر توا چولہے پر رکھ دیا ہے۔ جب تک توا گرم ہو گا' تب تک اس پائنچے کی سلائی ہو جائے گی .... کھٹاکھٹ کھٹ کھٹ کھٹ اور یہی سب کچھ زندگی کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ دوڑتے ہوئے' بھاگتے ہوئے' گریز پا لمحے اور ان لمحوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتی ہوئی عاصمہ۔ ان کو پکڑ لینے کی' انہیں قید کر لینے کی' انہیں اپنی مرضی کا تابع بنا لینے کی خواہش میں حیران و سرگرداں۔

اور یوں پہیئے گھومتے رہے، گھومتے رہے۔ سلائی کی مشین کا پہیہ، عاصمہ کی زندگی کا پہیہ۔

پہیوں کی اس گردش میں لمحوں کی اس بھاگ دوڑ میں، جوانی اس قدر خاموشی سے، ایسے چپکے سے غائب ہو گئی کہ عاصمہ کو اس کا احساس بھی نہ ہو پایا۔

عاصمہ کے بالوں میں بڑی تیزی کے ساتھ چاندی کے تار نمودار ہو رہے تھے، اس کے حسین اور خوبصورت چہرے پر جھریوں کی المناک تحریریں ابھر رہی تھیں۔ اس کی روشن اور شفاف آنکھوں کے گرد رونما ہونے والے سیاہ حلقے ڈھلتی ہوئی عمر کے خاموش نوحہ گر تھے۔

عاصمہ نے بوجھل، جان لیوا اور کمر توڑ مشقت کی گراں باری سے "آزاد شب و روز کا جو خواب دیکھا تھا، وہ پورا تو ضرور ہوا لیکن ایک بالکل مختلف اور نہایت اذیت ناک انداز میں۔ اسے اس خون آشام محنت سے نجات تو مل گئی لیکن اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کی روح سر تا سر خون میں نہا گئی۔

وہ شام کا وقت تھا اور عاصمہ اپنے سر میں بہت گرانی محسوس کر رہی تھی۔ یہ گرانی صرف سر میں نہیں تھی، بلکہ ایک عرصے سے اس کے سارے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ تھکاوٹ اور ایک عجیب قسم کی بے چینی کا مریضانہ احساس ہر وقت اس کے اعصاب پر غالب رہتا تھا۔

دو بار وہ پڑوس کے ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنے لئے دوا بھی لائی تھی۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے معائنے کے بعد اسے ہائی بلڈ پریشر بتایا تھا اور دوائیں تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ آرام کیا کرے، خوش رہنے کی کوشش کیا کرے اور زیادہ پریشان نہ ہوا کرے لیکن عاصمہ کے لئے ان تینوں مشوروں پر عمل کرنا ناممکن تھا۔ آرام اس کے مقدر میں نہیں تھا۔ صفیہ اس سال میٹرک کا امتحان دینے والی تھی۔ روبینہ آٹھویں میں آ گئی تھی۔ عمران چھٹی میں تھا۔ تینوں کی بڑھتی ہوئی عمریں تھیں اور اس کے ساتھ ہی بڑھتی ہوئی ضروریات بھی، نیز تعلیمی ضروریات بھی تو بڑھ رہی تھیں۔

آرام کرنے، خوش رہنے اور زیادہ پریشان نہ ہونے کی گنجائش کہاں تھی؟ بس زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی دوا کھا لی جائے اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ دیگر اہم ترین ضروریات سے پیسے بچ رہیں۔ عاصمہ نے اپنے لئے دوا کی ضرورت کو

کبھی اہم ترین ضروریات میں شامل نہیں کیا۔

چنانچہ ہر شام کی طرح اس شام بھی وہ بڑی گرانی محسوس کر رہی تھی اور اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ پھر سر کا بھاری پن اچانک بہت زیادہ شدت اختیار کر گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سارے جسم کے خون نے اچانک نہایت تیزی کے ساتھ سر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا ہے اور پھر اس پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس نے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اس نے گھبرا کر صفیہ کو آواز دینی چاہی لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ وہ اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر کے اٹھی۔ ایک بار اٹھ کھڑی ہوئی لیکن پھر فوراً گر گئی۔

صفیہ اس دھماکے کی آواز پر متوجہ ہوئی جو اس نے اماں کے کمرے کی طرف سے آتی ہوئی سنی تھی۔ وہ تیزی سے بھاگ کر اس کمرے میں گئی اور وہاں اس نے اپنی ماں کو مشین کے قریب، بہت سے سلے، بے سلے کپڑوں کے ڈھیر پر گرے ہوئے پایا۔ اماں کے ہاتھ پیر عجیب انداز میں ٹیڑھے ہو رہے تھے۔ صفیہ نے چلا کر روبینہ اور عمران کو آواز دی اور ان تینوں نے نیم بے ہوش نیم جاں عاصمہ کو اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔

صفیہ نے دونوں چھوٹے بہن بھائی کو ماں کے پاس چھوڑا اور خود دوڑ کر ڈاکٹر نذیر احمد کے گھر گئی۔ وہ اس وقت اپنے کلینک جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ صفیہ کی زبانی عاصمہ کا حال سن کر ڈاکٹر نذیر احمد اور اس کی بیوی جہاں آرا فوراً عاصمہ کے پاس اس کے گھر آ گئے۔

"انہیں ہسپتال لے جانا پڑے گا۔" ڈاکٹر نذیر احمد نے عاصمہ کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا ہے۔ مگر تم لوگ گھبراؤ نہیں، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ عاصمہ کوئی ہفتہ بھر تک ہسپتال میں رہی اور اس کے بعد اس کی چھٹی کر دی گئی اور وہ جس حال میں گھر واپس آئی اس کے خیال کے مطابق اس سے ہزار درجہ بہتر ہوتا کہ وہ مر جاتی۔ جو وجود گھر واپس آیا تھا، وہ اس کے اصلی وجود کا محض ایک عکس تھا۔

عاصمہ حرکت کرنے کی قوت سے اور بولنے کی قوت سے محروم ہو گئی تھی۔ البتہ اس کا دماغ سوچ سکتا تھا۔ اس کے محسوسات زندہ تھے۔ باقی تمام جسم مفلوج، بے حس و حرکت اور معطل ہو گیا تھا۔

ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ اب وہ جب تک زندہ رہے گی، اسی طرح، اسی حالت میں زندہ رہے گی۔ یعنی نہ تو وہ بول سکے گی، نہ حرکت کر سکے گی، نہ اپنے ہاتھ سے کھا پی سکے گی۔ وہ صرف ایک لوتھ کی طرح بستر پر پڑی رہے گی اور اسے چمچے سے غذا دینی ہو گی۔ اس کی صفائی ستھرائی کا بھی بندوبست کرنا ہو گا۔

عاصمہ کے لئے سب سے زیادہ خوفناک اور الم انگیز بات یہ تھی کہ اس کا ذہن پوری طرح بیدار تھا اور کام کر رہا تھا۔ اگر اس کا دماغ بھی ماؤف ہو جاتا تو وہ اس ناقابل بیان کرب اور اذیت سے نہ گزرتی، جس سے اب اسے گزرنا پڑ رہا تھا۔ وہ زندہ تھی، مگر مُردوں سے بدتر۔ وہ مُردہ تھی مگر اسے دفن نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ پورے طور سے نہیں مری تھی۔

جس وقت یہ سانحہ پیش آیا اور عاصمہ کے نیم مردہ بدن کو گھر میں لا کر ایک کمرے میں چارپائی پر ڈال دیا گیا، اس وقت صفیہ میٹرک میں تھی اور امتحان میں چند ماہ باقی تھے اور اب اچانک یہ ایک ایسی آفت آ پڑی تھی جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

صفیہ اب اس گھر کی سب سے بڑی تھی اور سربراہِ خاندان کی حیثیت سے اب صفیہ کو ہی یہ ذمہ داری سنبھالنی تھی۔ حالات کی ستم ظریفی نے میٹرک کی ایک کم سن اور نوعمر طالبہ کو چار جانوں کا پیٹ بھرنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔

صفیہ نے سلائی کی اس مشین کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا جس کے پہیئے کو چلاتے چلاتے عاصمہ کی یہ حالت ہو گئی تھی اور اس نے غصے، جھلاہٹ اور نیم دیوانگی کے عالم میں مشین کو ایک زور کی لات رسید کی۔

مشینیں کس طرح انسان کو کھا جاتی ہیں، صفیہ نے بہت کم عمری میں ہی یہ بات جان لی تھی اور مشین اس کے نزدیک اندھی اور بے لگام مشقت کی ایک سفاک اور وحشی علامت تھی اور اب صفیہ کے لئے اس کی زندگی کے سب سے زیادہ کرب ناک، الم انگیز اور صدمات سے بھرپور دَور کا آغاز ہوا۔ روبینہ اگرچہ اس سے صرف دو سال ہی چھوٹی تھی لیکن بہرحال چھوٹی تھی۔

اس موقع پر ڈاکٹر نذیر احمد اور اس کی بیوی جہاں آرا نے ان بچوں کو کافی سہارا دیا اور انہیں آئندہ کے بارے میں فیصلے کرنے میں مدد دی۔ زندگی کی شاہراہ پر اکثر ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو بغیر کسی ذاتی مفاد یا لالچ کے محض انسانی دوستی کے ناطے دوسروں کے بہت کام آتے ہیں اور ان کے مصائب کا ازالہ کرنے کی جدوجہد میں ان کے ساتھ شریک ہو

جاتے ہیں۔

ان دونوں میاں بیوی نے صفیہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فی الحال تعلیم کو ترک نہ کرے اور کسی نہ کسی طرح میٹرک پاس کرے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے صفیہ سے وعدہ کیا کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اس کے لئے کہیں نہ کہیں نوکری کا بندوبست کر دے گا۔

یہ ساری گفتگو عاصمہ کی موجودگی میں ہوئی۔ عاصمہ سب کچھ سن سکتی تھی، سمجھ سکتی تھی اور صرف رو سکتی تھی۔ آنسو بہا سکتی تھی۔ جتنی دیر تک وہ لوگ اس بارے میں باتیں کرتے رہے، عاصمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا رواں رہے۔

صفیہ نے روبینہ اور عمران کے ساتھ بیٹھ کر گھر کی ساری صورت حال کا جائزہ لیا۔ بہرحال اتنا کیش موجود تھا کہ کافی عرصے تک اس سے کام چلایا جا سکتا تھا۔

"بس، میں کسی طرح امتحان دے دوں۔" اس نے ان دونوں سے کہا۔ "امتحانوں تک ہمیں انہی پیسوں میں کسی نہ کسی طرح گزارہ کرنا ہے۔ بس گزارہ کر لو۔ اس کے بعد تو میں نوکری کر لوں گی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ وہ مجھے نوکری دلوا دیں گے۔"

صفیہ کی عمر میں یکلخت کئی برس کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک نوعمر لڑکی نہیں رہی تھی، بلکہ اچانک جیسے ایک ایسی عمر رسیدہ عورت بن گئی تھی جو کئی افراد پر مشتمل کنبے کی واحد پالن ہار ہو۔

اور پھر زندگی نے اپنا ایک خاص رنگ اختیار کر لیا اور معمولات زندگی خود بخود متعین ہوتے چلے گئے۔ کپڑوں کی سلائی کا سلسلہ تو اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا اور صفیہ بڑی محنت کے ساتھ میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی، روبی اور عمو بھی پڑھائی میں لگے رہتے تھے۔ ان تینوں سے کوئی یہ کہنے والا نہیں تھا کہ وہ پڑھیں، پڑھائی پر توجہ دیں اور اپنا وقت اِدھر اُدھر برباد نہ کریں۔ ان کو نصیحت کرنے والا کوئی نہیں تھا لیکن ان تینوں کو خود اس بات کا احساس تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ چھوٹی سی عمر میں ہی زندگی کی سختیوں نے انہیں بہت سی نصیحتیں کر ڈالی تھیں اور ان کی ذہنی اپج ایسی تھی کہ انہوں نے ان نصیحتوں کو قبول کیا تھا۔

عاصمہ کی بیماری اور معذوری کو کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا اور اس دوران میٹرک کے امتحانات ہو گئے تھے۔ صفیہ نے کافی محنت کی تھی اور اپنے ناساز گار حالات کے باوجود بہت پڑھائی کی تھی اس کے سب پرچے اچھے ہوئے تھے اور اسے امید تھی کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے گی۔ امتحان کا مرحلہ تو گزر گیا تھا اور اب اسے نوکری کی ضرورت تھی۔

بیمار معذور ماں کی خدمت اور دیکھ بھال کرنا صفیہ کے لئے شروع شروع میں ایک رقت آمیز اور الم انگیز فریضہ تھا جسے وہ گہری دردمندی کے ساتھ ادا کرتی تھی۔ اماں کی حالت دیکھ کر اس کا دل بے ساختہ بھر آتا تھا اور وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو ضبط کر پاتی تھی۔

اور پھر رفتہ رفتہ یہ فریضہ ایک میکانکی معمول کی صورت اختیار کرتا گیا۔ آنکھوں کے آنسو تو کب کے خشک ہو چکے تھے اور وہاں گہری اداسی اور ویرانی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ صفیہ اپنی معذور اور بے حس و حرکت ماں کو دیکھتی اور کڑھتی رہتی اور جب اسے اپنی ماں کی خاموشی اور گدلی گدلی آنکھوں میں رنج و حسرت کی ایک پوری دنیا ماتم کرتی ہوئی نظر آتی تو وہ کانپ جاتی۔ اماں کی آنکھوں کی طرف تو واقعی دیکھا نہیں جاتا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے وہ وقت آ گیا جب صفیہ کے دل میں یہ احساس جڑ پکڑنے لگا کہ اماں کی زندگی صرف ان کے لئے ہی نہیں دوسروں کے لئے بھی تکلیف اور عذاب کا باعث بن گئی ہے۔

یہ خیال جب پہلے پہل اس کے دل میں پیدا ہوا تو اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی، اپنے آپ سے نفرت کی۔ خود گویا اپنے منہ پر تھوکا اور اس شرمناک اور ذلت آمیز خیال کو اپنے دل و دماغ سے جھٹک کر دور کرنے کی کوشش کی لیکن یہ خیال اب کسی سرکش، بدلگام اور منہ زور گھوڑے کی طرح اس کے دل و دماغ کی جولان گاہ میں دندناتا پھرتا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر شرم سے پانی پانی ہونے لگتی کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں، دور کہیں ایک قابل نفرت اور خفیہ خواہش ابھر رہی ہے .... اماں کو اب مر جانا چاہئے۔

ہاں، یہ خواہش، جو پہلے اس کے لاشعور میں ابھری، اب خفیہ طور پر آہستہ آہستہ، بڑی رازداری کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے شعور میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ اس ملعون خواہش کو پوری طرح دبا دبا کر رکھتی، اس کو کچلنے کی پوری کوشش کرتی لیکن یہ پھر بھی کسی زہریلے سانپ کی طرح بل کھا کھا کر اپنے پھن کو لہراتی رہی۔

میٹرک کا امتحان ختم ہوتے ہی ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے اثر رسوخ سے کام لیتے ہوئے اسے ایک مقامی دواساز کمپنی میں ملازمت دلوا دی جو سائٹ ایریا میں واقع تھی۔ یہاں صفیہ کا تقرر ایک غیر ہنرمند صنعتی کارکن کی حیثیت سے ہوا تھا اور اسے تین ماہ کی تربیت حاصل کرنی تھی۔

پہلے ہی دن اسے بتایا گیا کہ یہ مشین ہے جس پر اسے کام کرنا ہو گا اور پہلے ہی دن

سے اس نے اس مشین کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا اور پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ویسے ویسے اسے اس مشین سے نفرت ہوتی گئی۔

اس نے کام سیکھا، درجنوں مختلف قسم کی مشینوں کو چلانا اور ان سے کام لینا سیکھا اور تین ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد اس کی نوکری پکی ہو گئی۔ اس دوران اس کا رزلٹ بھی آ چکا تھا اور اس نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا تھا۔ اس کی تنخواہ اور ترقی وغیرہ کا تعین اس کی تعلیمی صلاحیت کے مطابق کیا گیا۔ وہ انگریزی پڑھ سکتی تھی اور یہ چیز اس کے بہت کام آ رہی تھی۔

مشین کا ہی تو پہیہ تھا جسے گھماتے گھماتے اس کی ماں نے اپنی ساری زندگی تج دی تھی اور اب ویسا ہی ایک اور پہیہ صفیہ کے مقدر میں لکھ گیا تھا۔ اس کی ماں جو پہیہ گھماتی تھی، اس میں سے تو بہت تھوڑے سے پیسے نکلتے تھے لیکن جو پہیہ صفیہ چلا رہی تھی اس میں سے تو پیسے ابلتے تھے اور جیسے جیسے اس سسٹم کے تمام اسرار و رموز اس پر منکشف ہوتے گئے ویسے ویسے اس پہیے سے اس کی نفرت اور زیادہ بڑھتی گئی۔

اور ہر روز صبح تڑکے بیدار ہونے کے بعد وہ سب سے پہلے حسب معمول اپنی ماں کے کمرے میں جاتی اور اسے ایک نظر دیکھ کر واپس آ جاتی۔ ہر روز وہ ایک شرمناک امید کے ساتھ کمرے کے اندر جاتی اور ایک ملاحت آفریں مایوسی کے ساتھ واپس آتی۔

لیکن عاصمہ نے اسے بہت زیادہ عرصہ تک اس باطنی جہنم کی آگ میں نہیں جلنے دیا۔ صفیہ کو نوکری کرتے ہوئے ابھی چھ ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ عاصمہ نے اس دنیا سے رختِ سفر باندھ لیا۔ عاصمہ کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کا کام اب زیادہ تر روبینہ کے ذمے تھا کیونکہ اس کے پاس زیادہ وقت ہوتا تھا اور صفیہ تو ایک صبح کی گئی شام ڈھلے گھر واپس آتی تھی۔

اس شام جب وہ فیکٹری سے گھر واپس پہنچی تو اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھلا پایا اور پڑوس کی کئی عورتوں کو آتے جاتے دیکھا۔ اندر سے روبینہ کے ہولے ہولے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں، ایک پڑوسی عورت نے اسے بتایا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے..........

ان تینوں کو بھی یہ احساس تھا کہ اماں کا مر جانا خود اماں کے حق میں بھی بہتر تھا لیکن پھر بھی .... مرنے والی کی یاد میں آنسو تو نکل ہی آتے ہیں۔

"ہاں صفیہ بی بی!" اچانک صفیہ اپنے خیالات کی رو سے چونک اٹھی اور اس نے

نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ "کیا ہو گیا مشین کو' پھر کچھ گڑبڑ کر رہی ہے۔"

صفیہ کی نظروں کے سامنے عبدالقادر فورمین کا منحوس چہرہ موجود تھا جس پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اسے زہر لگ رہی تھی۔ چھٹی ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ یہ کمبخت عبدالقادر کچھ زیادہ دیر سے نہیں آ سکتا تھا۔ اب تھوڑی دیر کے بعد پھر کام شروع کر دینا ہو گا۔

عبدالقادر نے مشین کو ٹھیک کرنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں لیا۔

☆======☆======☆

اماں کو مرے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا اور یہ مدت ایسی پلک جھپکتے گزری تھی کہ صفیہ کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہونے پایا کہ اس کے حصے میں آئی ہوئی جوانی کی عمر میں سے' دو سال کم ہو چکے ہیں۔

وہ تو اسی طرح فیکٹری میں پہیہ گھماتی رہی تھی اور جبر کے جوتے تلے دبی ہوئی اس جدوجہد میں مصروف رہی تھی جو اس کو' اس کے بھائی بہن کو زندہ رکھنے کے لئے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ضروری تھی' اس دو سال کے عرصے میں بظاہر تو کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ اس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ پچھلے دو سال سے اس کے دماغ میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ میٹرک کرتے ہی روبی کی شادی کر دے۔ وہ روبی' کا بوجھ زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ روبی کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جائے۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ روبی کو اعلیٰ تعلیم دلوائے گی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ ایک خوف کا شکار ہوتی گئی تھی اور یہاں تک کہ اس خوف نے اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ مستقبل کی بے یقینی کا اور زندگی کی بے ثباتی کا خوف تھا۔

روبی اور عمو کا اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ عمو کی کوئی بات نہیں تھی' وہ لڑکا تھا۔ کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا لیکن روبی تو بالکل اکیلی تھی۔ زندگی کا کیا بھروسہ تھا؟ ابو کس طرح دیکھتے دیکھتے چٹ پٹ ہو گئے تھے اور اماں .... انہیں موت نے کتنی جلدی آ دبوچا تھا اور ان دونوں کے مرنے کے بعد اس گھر کا ان تینوں بہن بھائیوں کا کیا کیا حشر ہوا تھا۔ "نہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی جلدی کرو۔ کل کی آس میں مت بیٹھے رہو۔ کون جانے' آنے والے کل کے دامن میں تمہارے لئے کیا ہے۔ دوڑو......... دوڑو......... جلدی کرو۔ انتظار مت کرو' جلدی کرو تاکہ تمہارے اوپر لدے ہوئے بوجھ کم سے کم ہوتے

جائیں اور تم خود کو ہلکا محسوس کر سکو۔" وہ اسی انداز سے سوچتی تھی۔

پھر اس نے روبی کی شادی کر دی۔ روبی نے اسی سال میٹرک پاس کیا تھا اور وحید انٹر پاس تھا۔ وہ بڑا اچھا لڑکا تھا اور ان لوگوں کے پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ صفیہ کو معلوم تھا کہ وحید اور روبی ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ وحید کا ایک بڑھیا ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور وحید ایک عرصے سے باہر ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک ایجنٹ سے معاملہ کر کے اسے رقم وغیرہ بھی دے دی تھی۔

شادی سے کچھ دن پہلے وحید کو مڈل ایسٹ میں ملازمت مل گئی تھی اور شادی کے بعد چھ ماہ کے اندر اندر اس نے روبی کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ اپنی بڑھیا ماں کی رہائش کا اس نے ایک اور جگہ بندوبست کر دیا تھا۔

اور یوں صفیہ روبی کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد خود کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگی۔

اور اسے یوں لگا جیسے وہ تازہ ہوا میں نکل کر پہلی بار آزادی کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔

عمو اب آٹھویں کلاس میں تھا اور دو سال کے بعد اس نے بھی میٹرک کر لیا۔ ان دو برسوں کے دوران اگرچہ دنیا میں بہت ساری تبدیلیاں آ گئیں لیکن صفیہ کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی' سوائے اس کے کہ اس کی جوانی کی عمر کے دو سال اور کم ہو گئے۔ وہ اسی طرح پہیہ گھما رہی تھی اور نفرت کی آگ میں جل رہی تھی۔

ان دو برسوں کے دوران روبی اور وحید مڈل ایسٹ میں بہت اچھی طرح رہنے لگے تھے۔ وحید کے پاس الیکٹرونکس میں ڈپلومہ تھا جو اس کے بہت کام آیا تھا اور وہ وہاں اچھی طرح کام کر رہا تھا۔ پیسے بھی مناسب مل رہے تھے اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ عمو کو بھی اپنے پاس بلا لے۔ اس کا اور روبی کا ارادہ تھا کہ عمو کو اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی یورپی ملک بھیج دیں گے۔

چنانچہ وحید نے سارا بندوبست کر لیا اور میٹرک پاس کرنے کے بعد عمو بھی چلا گیا اور اب صفیہ بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔

اس روز عمو کے چلے جانے کے بعد جب وہ اپنے فلیٹ میں اپنے بستر پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی تو زندگی میں پہلی بار اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ تو بالکل تنہا ہے' وہ تو اس وقت سے تنہا ہے جب اماں بیمار ہو کر بستر سے لگ گئی تھیں اور تنہائی کا یہ عذاب جھیلتے

ہوئے اسے کئی برس گزر چکے ہیں۔ نہیں اس سے بھی زیادہ۔ وہ تو شاید اس وقت سے تنہا ہے جب اماں زندہ تھی اور کام کرتی رہتی تھی' ہمیشہ ہی وہ راتوں کو دیر دیر تک ٹیبل لیمپ جلائے کتابوں پر جھکی رہتی تھی' تب بھی دل ہی دل میں یہ خیال رہتا تھا کہ جلدی جلدی پڑھ کر اچھے نمبروں سے پاس ہو کر اماں کو اس کڑی مشقت سے نجات دلانا ہے' اس وقت بھی اس کی نہ کوئی بچپن کی سہیلی تھی نہ دوست' نہ سنگی نہ ساتھی۔

وقت تھا کہ ایک ہوا کے سبک رو جھونکے کی طرح گزر گیا تھا اور اب وہ زندگی کی شاہراہ کے اس موڑ پر کھڑی ہو کر جب پیچھے کی طرف دیکھتی تھی تو اسے اڑتی ہوئی گرم ریت کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وقت .... وقت .... وقت .... گزر گیا تھا' گزر رہا تھا۔ لمحات ریت کے ذرے بن کر اڑ رہے تھے اور ماضی کے صحرا میں محض بگولوں کا رقص باقی رہ گیا تھا۔

لیکن پھر اچانک اس کی ڈھنڈار' ویران' اجاڑ' تنہا اور محرومیوں سے بھرپور زندگی کے صحرا میں بہار کا ایک خوشبو سے بھرا ہوا جھونکا داخل ہوا اور اس نے اس صحرا کو گلزار بنا دیا۔

شہاب الدین اس کی فیکٹری میں اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹو آفیسر کی حیثیت سے آیا تھا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور اس سے پہلے کسی دوسری جگہ کام کرتا تھا۔ بہتر ملازمت کی جدوجہد کے دوران وہ اس فارماسیوٹیکل کمپنی میں آ پہنچا' جہاں کسی بڑی سفارش کے باعث اسے فوراً ملازم رکھ لیا گیا اور اس نے اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹو آفیسر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔

اس وقت یہ بات نہ تو شہاب الدین کو معلوم تھی اور نہ صفیہ کو کہ مستقبل کے میاں بیوی ایک ہی ادارے میں کام کر رہے ہیں۔

معلوم نہیں شروعات کیونکر ہوئی' کیسے ہوئی' کس کی طرف سے ہوئی' شاید کسی مہربان اور پُرمعنی مسکراہٹ سے اس کا آغاز ہوا یا دل میں اتر جانے والے تکلم کی مٹھاس سے' یا نگاہوں کی دل کو پگھلا دینے والی گرمی سے لیکن کسی نہ کسی طرح یہ آغاز بس ہو ہی گیا۔

صفیہ جوان اور خوبصورت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے کبھی اپنے آپ پر توجہ نہیں دی تھی' اچھے کپڑے پہننا' بننا سنورنا' اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ پُرکشش بنانے کی کوشش کرنا' ان سب باتوں کا اس کی زندگی میں دخل ہو ہی نہیں پایا تھا۔ نہ تو

اماں کو زندگی نے اتنی مہلت دی کہ اسے کچھ بتا سکیں' سکھا سکیں اور اماں کی بیماری کے بعد سے وہ اگر زندہ تھی تو محض ایک خاندان کے کفیل کی حیثیت سے۔ اس کی اپنی زندگی تھی ہی کہاں جو وہ اس کے بارے میں کچھ سوچتی۔

لیکن شہاب الدین کو پہلے دن ہی سے صفیہ بہت اچھی لگی تھی اور پھر ان دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم ہو گئے' جنھوں نے بہت جلد گہری اور اٹوٹ محبت کی شکل اختیار کر لی۔

شہاب الدین کا تعلق بھی نچلے متوسط طبقے سے تھا اور اس نے اپنی محنت سے تعلیم حاصل کر کے کسی نہ کسی طرح اپنے لئے معاشرے میں جگہ بنا لی تھی اور اب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ شادی کر کے ازدواجی زندگی شروع کر دے۔ اس کی بیوہ بہن حمیدہ بیگم نے جو اس کی واحد سرپرست تھی اور اس کے ساتھ رہتی تھی' اب تک کئی جگہ اس کے رشتے کی بات چلانے کی کوشش کی تھی لیکن شہاب الدین کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی اور جب اس نے صفیہ کو دیکھا تو وہ اسے بہت اچھی لگی۔ وہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی تھی اور جب شہاب الدین کو فیکٹری کے دوسرے لوگوں کی زبانی صفیہ کے گھریلو حالات کا علم ہوا تو اس کے دل میں اس بہادر نوجوان لڑکی کے لئے تعظیم اور احترام کے جذبات بھی بیدار ہوئے۔ صفیہ نے واقعی کمال کیا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے اپنے کنبے کی کفالت کرتی چلی آئی تھی اور اس نے ان لوگوں کی خاطر اپنے آپ کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

صفیہ کو پہلی بار کسی کی محبت کا یہ انوکھا تجربہ ہوا تھا اور اس نے پہلی بار سچائی کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ زندگی اس قدر بری' اس قدر کٹھن اور اس قدر قابل ملامت بھی نہیں ہے جتنا وہ اس کو ہمیشہ سمجھتی رہی ہے۔ شہاب الدین کی محبت نے اس کو زندگی اور دنیا کی خوبصورتی کا احساس دلایا اور یہ احساس دلایا کہ دنیا میں سب کچھ بدصورت نہیں ہے۔ اس طرح محبت کے جذبے نے صفیہ کے سامنے زندگی کے اس روپ کو خوشی خوشی قبول کیا۔ اسے تو اب معلوم ہوا کہ صبح کو بادِ نسیم کے جھونکوں کی نرم و پُراسرار سرگوشیاں کیا معنی رکھتی ہیں اور شام کو ڈھلتے ہوئے سورج کی گہری نارنجی اور ٹھنڈی شعاعیں نشاط و انبساط کے کیسے کیسے انمول خزانوں کو لٹاتی ہیں۔

صفیہ اور شہاب الدین کی شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مخلص تھے کوئی کسی کو دھوکا نہیں دے رہا تھا۔

اگلے چند ماہ کے دوران صفیہ اور شہاب الدین کی شادی ہو گئی۔ وحید' روبی اور عمو

میں سے کوئی بھی اس شادی میں شریک نہیں ہو سکا۔ وحید کو چھٹی نہیں مل سکتی تھی اور روبی امید سے تھی اور طویل سفر کے قابل نہیں تھی۔ عمو کو ان لوگوں نے کچھ نہ کچھ بندوبست کر کے فرینکفرٹ مغربی جرمنی بھجوا دیا تھا' جہاں سے فی الحال اس کی آمد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عجیب حالات تھے جن لوگوں کے لئے وہ اب تک جیتی رہی تھی اور جن کی زندگیاں بنانے میں وہ اپنے آپ کو گنواتی چلی آئی تھی' ان میں سے کوئی بھی اس خوشی کے موقع پر اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ سب کے اپنے اپنے مسائل تھے' سب نے اپنی الگ الگ دنیائیں بسالی تھیں۔

بہرحال' شادی تو ہونی تھی' سو اپنوں کے بغیر بھی ہو گئی۔ شہاب الدین کی بہن حمیدہ بیگم نے اور فیکٹری کی بعض دوسری خواتین اور لڑکیوں نے صفیہ کی پوری طرح مدد کی اور یوں صفیہ شہاب الدین کی بیوی بن کر اس کے گھر آ گئی۔

شہاب الدین اور اس کی بیوہ بہن حمیدہ بیگم عزیز آباد میں ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں تھا۔ صفیہ نے شادی سے پہلے ہی شہاب الدین کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ شادی کے بعد وہ سب لوگ عزیز آباد کا کرایہ کا مکان چھوڑ کر صفیہ کے فلیٹ میں آ جائیں جو شہر میں واقع تھا اور جہاں صفیہ اب بالکل اکیلی رہ رہی تھی۔

"ہم فلیٹ کو بیچ بھی سکتے ہیں۔" صفیہ نے کہا تھا۔ "مگر پگڑی کے اتنے پیسے نہیں ملیں گے کہ ان سے کوئی مکان خریدا جا سکے۔ تو پھر اس کو بیچنے سے کیا فائدہ؟ ہم تینوں اس میں آرام سے رہ سکتے ہیں۔"

شہاب الدین پہلے تو اس بات کے لئے تیار نہیں تھا اور حمیدہ تو بالکل ہی راضی نہیں تھی لیکن صفیہ کو اپنی تجویز کی معقولیت پر اتنا زیادہ اصرار تھا کہ ان دونوں نے بالآخر اس کی بات مان لی۔

اور اس طرح شادی ہونے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد صفیہ واپس اپنے فلیٹ میں آ گئی اور اب وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر' اس کا محبوب' اس کا عاشق شہاب الدین تھا اور شہاب الدین کی بیوہ بہن حمیدہ بیگم تھی۔ مکان وہی تھا لیکن مکین بدل گئے تھے' مکینوں کی خوشبو بدل گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی صفیہ کی دنیا بدل گئی تھی۔

شہاب الدین نے صفیہ کی خالی اور ویران زندگی کو محبتوں کے خزانوں سے مالامال کر

دیا۔ صفیہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اس سے اس قدر شدت کے ساتھ پیار کر سکتا ہے اور وہ خود کسی سے یوں والہانہ طور پر محبت کر سکتی ہے۔ شہاب الدین اب اس کی زندگی کا اس کے وجود کا ایک حصہ بن گیا تھا اور اب تو وہ ایک ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جو شہاب الدین کے وجود سے خالی ہو۔ حیرت تو اسے اس بات پر ہوئی تھی کہ وہ اب تک شہاب الدین کے بغیر زندہ کس طرح تھی؟

ان دونوں نے فیکٹری سے تین تین مہینے کی چھٹی لے لی تھی اس میں سے کچھ عرصہ دونوں نے کراچی سے باہر گزارا۔ صفیہ بیچاری تو کبھی حیدرآباد تک نہیں گئی تھی' اس نے جب سے آنکھ کھولی تھی' وہ کراچی میں اپنے اسی فلیٹ میں رہتی چلی آئی تھی اور اب پہلی بار اسے کراچی سے باہر نکل کر پاکستان کے دوسرے شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ زندگی کے کتنے مختلف رنگ تھے' ایک ہی دنیا میں کتنی بہت سی الگ الگ دنیائیں آباد تھیں .... اور صفیہ کے لئے یہ سب کچھ کس قدر نیا' کتنا انوکھا تھا۔ صحیح معنوں میں تو اپنی زندگی اس نے اب گزارنی شروع کی تھی۔ اس زندگی کا تو ڈھنگ ہی کچھ اور تھا۔

شادی کے کوئی سال بھر کے بعد جب صفیہ ایک بچے کی ماں بن گئی تو اس نے ملازمت چھوڑ دی۔

بالآخر اس نے اس منحوس مشین کے پہیے کو گھمانا بند کر دیا تھا اور جس دن اس نے اپنا استعفیٰ تحریر کیا اس دن وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اسے عمر قید سے چھٹکارا مل رہا ہے اور وہ جبری اور بے فیض مشقت کی کڑی بندشوں سے آزاد ہو رہی ہے۔

صفیہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا اور یہ ایک ایسی خوشی تھی جو اس نئے انکشاف کے ساتھ آئی تھی کہ اس سے بڑی کوئی خوشی نہیں ہے۔ صفیہ اب ماں بن گئی تھی' ایک بیٹے کی ماں اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ آج اس کے وجود کی تکمیل ہو گئی' اس نے ایک انسان کو جنم دے کر اپنے عورت ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ یہ اس کا اپنا بچہ تھا' اس نے اسے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا اور یہ بچہ اس کے لئے اب کائنات کی سب سے حسین شے تھا۔

انہی دنوں وحید اور روبی چند دنوں کے لئے کراچی آئے اور دونوں بہنوں کی ایک طویل عرصے کے بعد یہ ملاقات ہوئی۔ روبی کس قدر بدل گئی تھی اور وحید بھی .... نچلی منزل کے سامنے والے فلیٹ میں رہنے والا وہ احمق سالڑکا اب نکھر کر کیا سے کیا بن گیا تھا اور روبی تو جیسے کسی پرستان کی پری معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بال کٹوا لئے تھے' اس کا

وزن پہلے کے مقابلے میں کچھ بڑھ گیا تھا اور وہ اس کے چہرے سے جوانی کا خون جیسے چھلکا پڑتا تھا۔ اس کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں ساری دنیا کی خوشیاں سمٹی آ رہی تھیں۔

عمو کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ فرینکفرٹ میں پڑھ رہا ہے اور تعلیم ختم کرنے کے بعد اسے وہیں نوکری بھی مل جائے گی۔

"اچھا ہے آپا!" روبی نے کہا۔ "کیا کرے گا یہاں آ کر؟ یہاں تو لوگ دو دو پیسے کی نوکری کے لئے دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا۔ لاکھ صلاحیت ہو' تعلیم ہو' تجربہ ہو' علم ہو' سب کچھ ہو لیکن اگر سفارش نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔ ایسا اندھیر تو کہیں نہیں ہے آپا! میں اب تک کئی ملکوں میں جا چکی ہوں' یورپ بھی گئی ہوں۔ واہ .... کیا انسانی اقدار کا احترام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں واقعی انسان بستے ہیں یعنی مَیں اور وحید بھی اب پاکستان واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم یورپ میں ہی کہیں رہ جانے کی کوشش کریں گے۔ وحید تو ٹیکنیکل آدمی ہیں' شاید معاملہ کچھ بن جائے گا۔"

"میں تو کہتا ہوں آپا! کہ آپ اور شہاب الدین بھائی بھی یہاں سے نکلیں۔" وحید نے صفیہ سے کہا۔ "یہ ملک بھی بھلا کوئی رہنے کے قابل ہے؟؟"

"افسوس کہ میں ٹیکنیکل آدمی نہیں ہوں۔" شہاب الدین نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "ورنہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔"

"عمو سے کہنا کہ ایک بار تو کراچی آ کر مجھ سے مل جائے۔" صفیہ نے کہا۔ "میں تو اس کی صورت دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ کتنا عرصہ ہو گیا اسے گئے ہوئے۔" اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں کوشش کروں گی کہ اگلے سال وہ ایک چکر کراچی کا لگا لے۔" روبی نے کہا۔

لیکن عمو نے اگلے سال بھی کراچی کا چکر نہیں لگایا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی جرمن لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی جو اس کے ساتھ ہی پڑھ رہی تھی اور اب وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کچھ کام بھی کر رہا تھا۔ اس کا جرمنی میں مستقل طور پر قیام کرنے کا ارادہ اٹل تھا۔

روبی اور وحید چند روز قیام کرنے کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ زندگی کی شاہراہ پر سب کے الگ الگ سفر تھے اور سب اپنے اپنے سفر میں مصروف تھے' روبی اور وحید' عمو اور اس کی جرمن بیوی اور خود صفیہ اور شہاب الدین۔

شادی کو اب تین سال گزر چکے تھے اور صفیہ دو بچوں کی ماں تھی۔ بیٹے کا نام

نصیرالدین اور اس سے چھوٹی بہن کا نام فردوس تھا اور زندگی میں اتنا سکون تھا' اتنی طمانیت تھی کہ اس سے زیادہ سکون و طمانیت کا صفیہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ عرصہ ہوا' وہ اس کڑی مشقت سے نجات پا چکی تھی جو اس کے لئے ایک عذاب مسلسل اور سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ جتنے عرصے تک وہ فیکٹری میں کام کرتی رہی تھی اپنے آپ کو اپنی تقدیر کو کوستی رہی تھی' شکر تھا کہ وہ اس عذاب سے چھوٹ گئی تھی اور اب اس کی پوری توجہ اپنے گھر اور اپنے بچوں کی طرف تھی' کیونکہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی نند حمیدہ بیگم کا تو دو سال پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا اور اب اس فلیٹ میں وہ اور شہاب الدین اپنے دونوں بچوں کے ساتھ تنہا رہتے تھے' اس صورت میں صفیہ کے لئے ملازمت کو جاری رکھنا' یا کسی دوسری جگہ ملازمت کرنا' بہت مشکل تھا۔

شہاب الدین کو سالانہ ترقیاں ملتی رہی تھیں اور اس کی تنخواہ اب اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے ساتھ فراغت اور اطمینان کی زندگی گزار سکتے تھے اور گزار رہے تھے۔ ابھی تو بچے چھوٹے تھے' ان کے اخراجات بھی کم تھے لیکن ان بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اخراجات میں بھی اضافہ لازمی طور پر ہونا تھا' بچوں کو اچھے اور اعلیٰ درجے کے اسکول کی ضرورت تھی اور پھر دیگر بے شمار ضروریات تھیں ان سب کے لئے پیسہ چاہئے تھا۔

اور پھر فردوس تھی' لڑکی۔ اس کی شادی کرنا تھی۔

"ہمارے طبقے کے لوگ تو اسی دن سے بیٹی کا جہیز جوڑنا شروع کر دیتے ہیں جس دن وہ پیدا ہوتی ہے۔" ایک روز شہاب الدین نے ہنس کر اپنی بیوی سے کہا۔ "اور تب کہیں جا کر اس کی شادی کے وقت تک کام پورا ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کے دو چار بیٹیاں ہوتی ہیں ان کو تو خدا جانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں' یہ تو شاید ان کا ہی دل جانتا ہو گا۔"

"ہماری ایک بیٹی ہے اور ایک ہی رہے گی۔" صفیہ نے شہاب الدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بس اتنا بہت ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو ایک اچھی زندگی دینی ہے۔ ہمیں ان پر ظلم نہیں کرنا ہے۔" اچانک اس کی آواز بھرانے سی لگی اور بھاری ہو گئی۔ "تم نہیں اندازہ لگا سکتے کہ میں نے اپنا بچپن کیسا گزارا ہے' کس قدر غریب تھے ہم لوگ۔ بس یوں سمجھ لو کہ نیم فاقہ کشی کا سا عالم رہتا تھا۔"

"ہم لوگ بہت غریب تھے۔" اس نے مزید کہا۔ "تین بہن بھائی اور ایک ہماری

ماں۔ ہم نے بہت بُرا وقت گزارا ہے۔ میں خوب جانتی ہوں شہاب کہ مفلسی اور محتاجی کیا ہوتی ہے۔ میں ان دِنوں کو کبھی نہیں بھول سکتی جب ہم لوگ چھوٹی چھوٹی معمولی معمولی چیزوں کے لئے ترستے رہتے تھے اور اتنی چھوٹی چھوٹی عمروں میں بھی ہمارے اندر اتنی سمجھ پیدا ہو گئی تھی کہ ہم اپنی اماں سے کچھ نہیں کہتے تھے' ان سے کوئی فرمائشیں نہیں کرتے تھے' کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہماری اماں کے پاس ہماری فرمائشیں پوری کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں .... نہیں شہاب نہیں' مَیں اپنے بچوں کو ایسی زندگی نہیں دینی چاہتی۔ اف' اس سب کے بارے میں سوچتی ہوں تو دل کانپ اٹھتا ہے۔ اماں ہماری کام کرتے کرتے' ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہو گئیں۔ مسلسل تفکر و آلام نے ان کے اعصاب کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ ٹھیک سے علاج بھی نہیں ہو سکتا تھا اور پھر وہ مفلوج ہو گئیں۔ فالج نے انہیں بستر سے لگا دیا اور پھر میں نے ان کی جگہ سنبھال لی۔ وہ سلائی کی مشین کا پہیہ گھماتی تھیں' میں نے فیکٹری کی مشین کا پہیہ گھمانا شروع کر دیا............"

بولتے بولتے صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ دوپٹے کے پلو سے انہیں پونچھنے لگی۔

"بھول جاؤ صفو!" شہاب الدین نے اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر اس کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے محبت کی گہرائیوں میں ڈوب کر کہا۔ "بھول جاؤ صفو! ان تمام باتوں کو کسی بُرے خواب کی طرح بھول جاؤ۔ وہ وقت گزر گیا۔ بُرا وقت گزر گیا اور اب تو اچھا وقت ہے۔ اب تمہیں کسی مشین کا پہیہ گھمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو ہوں صفو! میں موجود ہوں۔"

اور صفیہ نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگی۔

شہاب الدین کے پاس اب ایک موٹر سائیکل تھی اور وہ اس سے دفتر آیا جایا کرتا تھا۔ صفیہ بھی دونوں بچوں کو ساتھ لے کر اکثر اس کے پیچھے بیٹھتی اور یوں یہ چھوٹا سا خاندان ایک موٹر سائیکل میں سما کر خوب سیر سپاٹے کرتا پھرتا۔ پہلے تو شہاب الدین کو بس سے دفتر جانا پڑتا تھا اور یہ اس قدر تکلیف دہ عمل تھا کہ بعض اوقات تو وہ پاگل سا ہونے لگتا۔ اسے دفتر تک پہنچنے کے لئے دو بسیں بدلنی پڑتی تھیں اور اس غرض سے بہت پہلے گھر سے نکلنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود بھی اکثر اسے دیر ہو جاتی تھی اور اپنے افسر کی لال پیلی آنکھیں دیکھنی پڑتی تھیں۔ اسی طرح شام کو واپس آتے آتے بھی کافی دیر ہو جاتی تھی اور سردیوں کے دنوں میں تو رات ہو جاتی تھی۔

لیکن جب اس نے آفس سے قرض لے کر موٹر سائیکل خریدی تھی تب سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا تھا اور اب نہ صرف اسے دفتر آنے جانے کی آسانی ہو گئی تھی بلکہ صفیہ اور بچوں کو آنے جانے کی بہت سہولت ہو گئی تھی۔ یہ کم خرچ سواری تھی۔ ایک لیٹر پیٹرول میں بڑے لمبے لمبے سفر کر سکتی تھی اور اس طرح وقت اور پیسے' دونوں چیزوں کی بچت ہوتی تھی۔

صفیہ کو شروع شروع میں تو موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بہت ڈر لگا' کیونکہ وہ زندگی میں کبھی بھی موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کا ڈر نکل گیا اور وہ اس کی عادی ہو گئی اور پھر تو وہ دونوں بچوں کو سنبھال کر اطمینان سے موٹر سائیکل پر بیٹھ جاتی اور پورا خاندان خوب گھومتا پھرتا۔ انہوں نے اپنے ٹرانسپورٹ کے مسئلے کو کراچی کے لاکھوں مڈل کلاس خاندانوں کی طرح حل کر لیا تھا۔

وہ گرمیوں کی شام تھی اور آج صفیہ کو شہاب الدین کے ساتھ بازار جانا تھا۔ کچھ ضروری خریداری کرنی تھی۔ اکثر یوں بھی ہوتا تھا کہ شہاب الدین کے ساتھ اکیلی جاتی تھی۔ اتنے چھوٹے بچوں کو ہر جگہ تو نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ اس صورت میں وہ دونوں بچوں کو میرن خالہ ک پاس چھوڑ جاتی۔

میرن خالہ کا پورا نام تو مہرالنساء تھا لیکن سب لوگ انہیں میرن خالہ کہتے تھے اور وہ صفیہ کے پڑوس میں رہتی تھیں اور اب سے نہیں بلکہ ایک عرصہ دراز سے رہتی تھیں۔ صفیہ کے گھرانے سے ان کے مراسم بہت پرانے تھے۔ میرن خالہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ وہاں رہتی تھیں اور وہ بہت نرم مزاج اور بامروت انسان تھیں۔ ایک بہت پرانی پڑوسن ہونے کے ناتے وہ صفیہ کے بچوں کو بھی بہت عزیز رکھتی تھیں۔

گذشتہ روز شہاب الدین کو تنخواہ ملی تھی لیکن اس کو دفتر سے واپسی میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ طے پایا تھا کہ وہ دونوں ضروری خریداری کے لئے اگلے دن یعنی آج جائیں گے۔

صفیہ نے سارے ضروری کام کر لئے تھے۔ اس نے دونوں بچوں کی چیزیں' جن کی ضرورت پڑ سکتی تھی' ایک ٹوکری میں رکھ دی تھیں اور میرن خالہ کو پہلے سے بتا بھی دیا تھا کہ وہ شہاب الدین کے ساتھ خریداری کے لئے جائے گی اور بچوں کو ان کے پاس چھوڑ جائے گی۔ میرن خالہ تو فوراً ہی اس کے لئے راضی ہو گئی تھیں۔

شہاب الدین کے آنے کے بعد وہ لوگ چائے پیتے اور اس کے بعد بچوں کو میرن

خالہ کے حوالے کر کے وہاں سے چل دیتے۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد واپس آ جاتے۔ کہیں دور دراز کے سفر پر تو جانا نہیں تھا۔

صفیہ نے گھڑی دیکھی' چھ بج کر دس منٹ ہو گئے تھے۔ "چائے کا پانی رکھ دینا چاہئے۔" اور اس نے باورچی خانے میں جا کر چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھا دی۔

اس کے بعد وہ ہاتھ منہ دھو کر خود تیار ہونے لگی۔ کچھ دیر میں وہ تیار ہو گئی۔ اس اثنا میں پانی بھی کھول گیا تھا اور اس نے اس میں پتی ڈال دی۔

اور چائے کی کیتلی کو ٹی کوزی سے ڈھک کر رکھ دیا۔ پیالیاں پہلے ہی دھلی ہوئی' صاف ستھری وہاں رکھی تھیں۔

شہاب الدین کسی بھی وقت' کسی بھی لمحے آ سکتا تھا۔ صفیہ نے اپنے پرس میں روپے بھی رکھ لئے تھے اور اب وہ چائے پینے کے فوراً بعد چلنے کے لئے تیار تھی۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی ساڑھے چھ بج گئے تھے اور وہ جھلا اٹھی۔ "لگتا ہے آج پھر دفتر میں انہیں دیر ہو گئی ہے۔"

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ صفیہ نے دونوں بچوں کو بھی تیار کر دیا تھا تاکہ انہیں میرن خالہ کے پاس چھوڑ سکے۔ کیتلی میں چائے تیار تھی۔ سب کچھ ہی تیار تھا لیکن شہاب الدین کا پتہ نہیں تھا۔

سات بج گئے' پھر ساڑھے سات بجے اور صفیہ نے سمجھ لیا کہ آج شاپنگ کے لئے جانے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ آٹھ بجے تو دکانیں بند ہونا شروع ہو جاتی تھیں اور آٹھ تو گھر سے نکلتے نکلتے ہی بج جاتے۔ اگر شہاب الدین ابھی فوراً بھی آ جاتا تو بھی اس کو دوبارہ وہاں سے نکلنے میں چند منٹ تو لگ ہی جاتے۔ اس طرح کم از کم پونے آٹھ بج جاتے پھر جانا بیکار تھا۔

رات کے آٹھ بج گئے تو اس نے جان لیا کہ اب تو باہر جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اس کے ساتھ ہی اس نے بچوں کے سامان کی ٹوکری کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ اب بچوں کو میرن خالہ کے پاس چھوڑنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی تشویش کی ایک لہر بھی اس کے دل میں اٹھنے لگی۔ اتنی دیر تو آج تک نہیں ہوئی تھی اور اگر ہوئی تھی تو صرف اس صورت میں جبکہ پہلے اس کے بارے میں معلوم تھا لیکن شہاب الدین نے تو آج کے بارے میں واضح طور پر یہ کہا تھا کہ وہ وقت پر گھر واپس آ جائے گا۔

ساڑھے آٹھ بجے وہ پڑوس کے اس فلیٹ میں گئی جہاں فون تھا اور اس نے فیکٹری فون کیا۔ وہاں چوکیدار سے اس کی بات ہوئی جس نے بتایا کہ فیکٹری میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا اور شہاب الدین کے بارے میں اس نے یہ بتایا کہ وہ تو ساڑھے پانچ بجے ہی فیکٹری سے نکل گیا تھا۔

صفیہ یہ سن کر حواس باختہ ہو گئی۔ آخر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا کہ شہاب الدین فیکٹری سے نکلنے کے بعد کہیں اور چلا جائے' جب کہ وہ یہاں اس کا انتظار کر رہی ہے اور آج کا پروگرام پہلے سے طے ہے؟ نہیں شہاب الدین تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

اب وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ کس سے پوچھے؟ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا اور اس پر سخت سراسیمگی کی کیفیت طاری تھی۔ فون کرنے کے بعد وہ سیدھی میرن خالہ کے پاس آئی اور اس نے انتہائی پریشانی کے ساتھ یہ بات بتائی۔

"بچوں کو میرے پاس چھوڑ دو۔" میرن خالہ نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اور رحمٰن کو ساتھ لے کر جاؤ۔ جہاں بھی تم جاؤ گی وہ تمہارے ساتھ جائے گا اور اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ شہاب الدین خیریت کے ساتھ گھر واپس آ جائیں گے۔"

لیکن شہاب الدین خیریت سے گھر واپس نہیں آیا۔ میرن خالہ کے بیٹے رحمٰن کے ساتھ مل کر اس کو تلاش کرتے ہوئے رات کے تقریباً بارہ بجے سول ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اس کی موجودگی کا پتہ چلا۔ ناظم آباد کے علاقے میں کوئی نامعلوم گاڑی اس کو ٹکر مار کر بھاگ گئی تھی۔ شہاب الدین بری طرح زخمی ہو کر مع اپنی موٹر سائیکل کے گر پڑا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی چور چور ہو گئی تھی اور وہ خود بھی۔ مارنے والی گاڑی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا' البتہ شہاب الدین کو ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ شدید طور پر زخمی' بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

صفیہ کا پورا جسم کسی خزاں رسیدہ زرد پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ زخمی اور بے ہوش شہاب الدین کے بستر کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور اس نے بیڈ کے سرہانے کی آہنی پٹی کو بڑی مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کی ٹانگیں اس بری طرح کانپ رہی تھیں کہ اسے لگتا تھا کہ وہ ابھی گر پڑے گی۔ اس کے دماغ میں سناٹے گونج رہے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

رحمٰن نے کچھ دیر کے لئے اس کو وہیں چھوڑا اور جلدی سے واپس گھر آیا۔ یہاں

سے وہ کچھ اور پڑوسیوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ صفیہ اور اس کا شوہر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اکیلے اس فلیٹ میں رہتے تھے اور ان کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ صرف پڑوسی ہی تھے جو ان کی مدد کر سکتے تھے اور کئی پڑوسیوں نے صفیہ کی مدد کی، جن میں میرن خالہ کے گھر والے سب سے آگے آگے تھے۔

اس رات کو تین بجے شہاب الدین نے سول ہسپتال کے شعبہ حادثات میں دم توڑ دیا۔

صفیہ کے لئے یہ سب کچھ اس قدر بھیانک، اس قدر اندوہناک اور ناقابلِ یقین تھا کہ اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے دل کو کسی نے چھری سے کاٹ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا اور اس کی آنکھوں سے خون کے دریا رواں تھے۔

صفیہ نے اب تک اپنے عزیزوں کی چار لاشیں دیکھی تھیں جنہیں اسی فلیٹ میں کفنایا گیا تھا اور یہاں سے ان کے جنازے اٹھائے گئے تھے۔ سب سے پہلا جنازہ تو اس کے باپ کا اٹھا تھا لیکن اس وقت صفیہ کو ٹھیک سے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ اسے تو وہ منظر بس دھواں دھواں سا یاد تھا۔ دوسری موت اس کی ماں کی ہوئی تھی اور وہ موت ایسی تھی جس کی وہ دل ہی دل میں متمنی تھی، اس کے دل میں یہ خفیہ خواہش موجود تھی کہ اماں مر جائیں اور خود انہیں اور دوسروں کو بھی اس دُکھ سے چھٹکارا ملے، چنانچہ اس موت میں بھی غم کا عنصر بہت زیادہ شامل نہیں تھا، تیسری موت حمیدہ بیگم کی تھی، جو صفیہ کی نند تھی اور جس کے ساتھ کوئی گہرا دلی اور جذباتی لگاؤ نہیں تھا لیکن یہ چوتھی موت .... اس موت نے تو اس کے سارے وجود کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ صدمے کی انتہا تھی جس کی وسعتوں اور گہرائیوں کو الفاظ کی چار دیواری میں قید نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ شدتِ غم کی وہ منزل تھی جہاں پہنچ کر انسان کا سارا وجود صرف ایک لرزتے ہوئے نوحے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جہاں ہر لمحہ سانس روک لیتا ہے، ساری کائنات ایک نقطے پر سمٹ کر تھم جاتی ہے، نبضِ ہستی رک جاتی ہے اور اندھیروں اور دھند لکوں کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا۔

جب شہاب الدین کے جنازے کو اس کے فلیٹ سے اٹھا کر لے جایا گیا تو صفیہ اپنے خون میں تر بتر، ریزہ ریزہ وجود کو بڑی مشکل سے گھسیٹتی ہوئی دروازے تک لا رہی تھی۔ دو پڑوسی عورتیں اسے سہارا دیئے ہوئے تھیں، وہ جا رہا تھا۔ وہ جا رہا تھا، ہمیشہ کے لئے،

ہمیشہ کے لئے۔ وہ جس کے وجود سے صفیہ کا اپنا وجود روشن تھا۔ صفیہ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

اور جب کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو جنازہ جا چکا تھا۔ شہاب الدین کا جنازہ۔ آج گھر اس کے وجود سے خالی ہو چکا تھا۔ ہمیشہ کے لئے .... ہائے .... ہائے وہ چہرہ .... وہ آنکھیں، وہ تکلم، وہ تبسم، وہ نرمی، وہ محبت، وہ چاہت .... مٹی .... مٹی .... سب مٹی ہو گیا، خون میں لتھڑی ہوئی مردہ مٹی .... خون اور مٹی .... مردہ گوشت مردہ مٹی .... مردہ خون .... خون۔

کسی نہ کسی طرح دن تمام ہو گیا اور شام ہو گئی اور رات آ گئی اور پھر رات بھی گزر گئی اور دوسرا دن آ گیا۔ دوسرے دن کا سورج طلوع ہو گیا۔

اور صفیہ کو اس بات پر حیرت تھی کہ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے، وہ خود بھی زندہ ہے، سلامت ہے، سانس لے رہی ہے اور شہاب الدین اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ کیا شہاب کے بغیر بھی دنیا قائم رہ سکتی تھی؟ مگر دنیا تو قائم تھی۔ سب کچھ بالکل اسی طرح تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک اسی طرح رواں دواں تھا۔ سارا کاروبارِ حیات اسی طرح جاری و ساری تھا۔ دُکانیں کھلی ہوئی تھیں، لوگ آ جا رہے تھے۔ زمین قائم تھی، آسمان قائم تھا، دنیا زندہ تھی اور وہ خود بھی زندہ تھی۔ ہاں، وہ خود بھی زندہ تھی، وہ شہاب کے بغیر زندہ تھی۔ نہیں .... نہیں، یہ زندگی نہیں تھی۔ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ تو صرف ایک مجبوری تھی۔

تقریباً ہفتہ بھر گزرنے کے بعد جب اس کے اعصاب کچھ اعتدال پر آئے تو اس نے اب نئے حالات کی روشنی میں سوچنا شروع کیا۔ مرنے والا تو چلا گیا تھا، ہمیشہ کے لئے، کبھی واپس نہ آنے کے لئے اور اب جو مسائل تھے، ان سے صفیہ کو تنہا نمٹنا تھا۔ اگر وہ تنہا ہوتی تو شاید اس کے سوچنے کا انداز دوسرا ہوتا لیکن اس کے ساتھ دو معصوم بچے بھی تھے۔ ان کے مستقبل کا سوال تھا۔ انہوں نے تو ابھی دنیا میں پوری طرح سانس لینا بھی نہیں سیکھا تھا، اب زندہ تو رہنا تھا، خواہ جیسے بھی ہو، زندگی کی گاڑی کو آگے گھسیٹنا تھا۔

گھر میں کچھ تھوڑا جمع جتھا تو تھا جس سے کچھ دن گزارہ ہو سکتا تھا لیکن یہ گزارا صرف کچھ دن ہی ہو سکتا تھا اور مستقل گزارے کے لئے تو مستقل آمدنی کی بھی کوئی صورت چاہئے تھی اور یہ مستقل صورت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی کہ صفیہ خود کہیں نوکری کرے۔

اور اس خیال کے ساتھ ہی اس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی' اسے مشین کے آگے آٹھ گھنٹے تک مسلسل کھڑے رہنے کی وہ بے فیض مشقت یاد آ جاتی جس نے اس کے وجود میں زہر گھول دیا تھا۔ نہیں نہیں' یہ اب اس سے نہیں ہو سکے گا۔ اس سے اب مشین پر کام نہیں ہو سکے گا۔

تو پھر کوئی اور کام لیکن وہ دوسرا اور کون سا کام کر سکتی تھی؟ اس کی تعلیمی صلاحیت برائے نام تھی۔ اس نے محض میٹرک کیا تھا۔ اسے تو کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچری بھی بمشکل مل سکتی تھی اور اگر مل بھی جاتی تو تنخواہ چند سو روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس تنخواہ میں کیا کرتی؟ نہیں نہیں۔ یہ بھی نہیں .... تو پھر کیا' پھر کیا؟ اس کے آگے سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں دھند سی بھر جاتی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگتا۔ اس کے آگے جو کچھ تھا' وہ صرف دھندلکوں میں لپٹا ہوا غیر واضح اور مبہم تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ آگے کیا ہے۔

شہاب الدین کے دفتر کے بہت سے لوگ تعزیت کے لئے اس کے پاس آئے تھے جن میں سے زیادہ تر کو وہ ذاتی طور پر خود بھی جانتی تھی۔ ان میں اکاؤنٹس آفیسر منظور الحق بھی شامل تھا۔ منظور الحق شہاب الدین کے چالیسویں والے دن بھی آیا تھا اور اس نے دورانِ گفتگو صفیہ کو یہ بتایا تھا کہ وہ مرحوم شہاب الدین کے واجبات کی تفصیل تیار کر رہا ہے اور اس کے اندازے کے مطابق تقریباً ایک لاکھ روپے کی رقم بنتی ہے۔

شہاب الدین کے واجبات کی وصولی کے لئے صفیہ عدت کی مدت گزارنے کے بعد ہی آفس جا سکی۔ فیکٹری کا مینجر اس کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ اس کے دل میں اس نوجوان عورت کے لئے گہری ہمدردی تھی جو اتنی کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھی اور جو چھوٹے بچوں کی ماں بھی تھی۔

"تم پہلے بھی یہاں کام کر چکی ہو صفیہ!" سفید بالوں والے مینجر نے اس سے کہا۔ "اور تم ایک بہت اچھی کارکن تھیں۔ کسی کو تم سے کوئی شکایت نہیں تھی' کیونکہ تم اپنا کام دیانت داری کے ساتھ انجام دیتی تھیں۔ پھر تم نے اپنی مرضی سے ہی استعفیٰ دے دیا تھا۔ بہرحال' اب اگر تم دوبارہ آنا چاہو تو آ سکتی ہو۔ میں تمہاری اتنی مدد تو ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہیں دوبارہ ملازمت دلوا دوں لیکن یہ ہے کہ ملازمت کا آغاز نئے سرے سے سمجھا جائے گا۔ پچھلی مدت ملازمت کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال' وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ تم اس کے بارے میں سوچنا۔ اگر تم دوبارہ واپس آنا چاہو تو آ جانا۔ تمہیں اپنی پرانی

جگہ واپس مل جائے گی۔"

"بہت بہت شکریہ سر!" اس نے ممنونیت کے احساس کے ساتھ کہا۔ "میں اس بارے میں ضرور سوچوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" مینجر نے کہا۔ "اور اب تم اکاؤنٹس میں منظور الحق کے پاس چلی جاؤ۔ میں ابھی ان کو فون بھی کئے دیتا ہوں۔ میرے خیال میں انہوں نے شہاب الدین کا حساب کتاب تیار کر لیا ہے اور چیف اکاؤنٹینٹ کے دستخط بھی کروا لئے ہیں۔"

منظور الحق ایک عمر رسیدہ اور بال بچے دار آدمی تھا اور اس فیکٹری میں کافی طویل عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس کا شمار ان چھوٹے افسروں میں ہوتا تھا جنہیں کارکنوں میں بڑی عزت حاصل تھی۔ منظور الحق ایک مخلص اور دردمند انسان تھا اور اس سے جہاں تک ممکن ہوتا تھا' کارکنوں کی مدد کر دیتا تھا۔ صفیہ اس کے دفتر میں پہنچی تو اس نے بڑی عزت کے ساتھ اسے بٹھایا۔

مرحوم شہاب الدین کا حساب تیار ہو چکا تھا۔ صرف مینجر کے دستخط ہونے باقی تھے۔ منظور الحق نے چیک کو مینجر کے دستخطوں کے لئے بھجوا دیا اور خود صفیہ کو اس رقم کی تفصیلات کے بارے میں بتانے لگا۔ کل رقم کم و بیش ایک لاکھ روپے بنتی تھی۔

"یہ بتاؤ بیٹی کہ اب تم اس رقم کا کیا کرو گی؟" منظور الحق نے اس سے پوچھا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ماشاء اللہ دو بچوں کا ساتھ ہے اور یہ ایک لاکھ روپے کی رقم آج کل کے حالات میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر بیٹھے بیٹھے کھاؤ گی تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

"میرا ارادہ ہے منظور صاحب کہ میں اس رقم کو این ڈی ایف سی میں ڈال دوں۔" صفیہ نے کہا۔ "وہاں پہلے سے میرے پچاس ہزار روپے جمع ہیں۔ میں نے جب نوکری چھوڑی تھی تو کچھ پیسے ملے تھے۔ پھر ہم لوگ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا لیتے تھے اور اسے این ڈی ایف سی میں ڈال دیتے تھے۔ آخر ہمارا بھی بچوں کا ساتھ ہے منظور صاحب! بیٹی بھی ہے۔ جس کے بارے میں سوچنا تھا۔ چنانچہ ہم شروع ہی سے کچھ نہ کچھ بچاتے رہے ہیں اور آپ تو جانتے ہی ہیں' بچت تو اسی وقت ہوتی ہے جب ذرا ہاتھ روک کر خرچ کیا جائے اور ہم لوگ تو کچھ زیادہ ہی ہاتھ روکتے تھے۔"

"مجھے اندازہ ہے بیٹی!" منظور الحق نے کہا۔ "تم نے اچھا کیا کہ پیسے جمع کرتی رہیں۔ اب یوں سمجھو کہ پچاس ہزار وہ اور ایک لاکھ یہ۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ روپے ہو گئے۔ این ڈی

ایف سی سے تمہیں اس رقم پر ہر ماہ تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ یہ رقم کم نہیں ہے، لیکن بعض ایسے ادارے بھی موجود ہیں جہاں سے تمہیں منافع کی رقم اس سے کہیں زیادہ مل سکتی ہے۔"

"میں نے ان میں سے بعض کے بارے میں سنا ہے منظور صاحب!" صفیہ نے کہا۔ "لیکن میں کسی کے بارے میں جانتی کچھ نہیں اور دوسرے یہ کہ میں اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ یہ تو میری زندگی بھر کی جمع پونجی ہے۔ میں اسے کس طرح یوں ہی کسی کے حوالے کر سکتی ہوں؟"

"تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے بیٹی!" منظور الحق نے کہا۔ "پرائیویٹ فنانس کمپنیاں تو کئی ایک ہیں لیکن میں ان سب کی بات نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کے بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتا اور نہ میں ان میں سے کسی کو قابل اعتماد سمجھتا ہوں لیکن ایک کمپنی ایسی ہے جس پر میں آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں اور کرتا ہوں اور میں تمہیں بتا دوں، خود میری بیوی نے وہاں کوئی ستر ہزار روپے کی رقم جمع کر رکھی ہے۔ اس پر وہاں سے ہر ماہ تقریباً دو ہزار روپے یا اس سے کچھ زیادہ کی رقم منافع کے طور پر ملتی ہے۔ ان لوگوں کے منافع کی فکسڈ شرح نہیں ہوتی۔ ان کے کاروبار کے اپنے منافع کی طرح انویسٹرز کے منافع کا حصہ بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ تاہم، یہ کم و بیش تین فیصد ماہانہ کے آس پاس ہی رہتا ہے۔"

"واقعی؟" صفیہ نے حیرت سے کہا۔ "تین فیصدی ماہانہ؟ یہ تو اچھی خاصی شرح منافع ہے اور کیا آپ کو ان لوگوں پر پورا پورا بھروسہ ہے؟ کون ہیں یہ لوگ؟ مجھے ان کے بارے میں کچھ بتائیے منظور صاحب!"

"ہاں، کیوں نہیں۔" منظور الحق نے کہا۔ "میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔ یہ سب کے سب بڑے اللہ والے متقی، پرہیزگار، دین دار اور پابند شریعت لوگ ہیں۔ ان کی ایمانداری میں شک کرنا گناہ ہے۔ ہر کام خدا اور رسولؐ کے احکامات کی روشنی میں کرتے ہیں اور ان کا سارا کاروبار دینی اور شرعی ضابطوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یہ انویسٹرز کو ان کی لگائی ہوئی رقم پر سود نہیں، منافع دیتے ہیں، سود کی تو ایک مقررہ شرح ہوتی ہے اور وہ اسی کے مطابق ادا کیا جاتا ہے لیکن یہ لوگ اس منافع میں سے جو انہیں حاصل ہوتا ہے، چالیس فیصد حصہ انویسٹرز کی رقم پر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ منافع ہر ماہ بدلتا رہتا ہے اور اس کی کوئی مقررہ شرح اور رقم نہیں ہوتی۔"

"اچھا!" صفیہ نے حیرت آمیز مسرت کے ساتھ کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے کہ ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ ویسے ان کا کاروبار کیا ہے؟ اور نام کیا ہے؟"

"یونیورسٹی روڈ پر ان کا بہت بڑا کاروں کا شو روم ہے۔" منظور الحق نے بتایا۔ "کمپنی کا نام اتحاد موٹرز ہے، اور یہ ڈی کے افراہیم کمپنی کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ بلاشبہ، ان کے پاس لوگوں کا کروڑوں نہیں اربوں روپیہ جمع ہے اور یہ مکمل دیانتداری کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں۔ ان کے بہت سے مختلف نوعیت کے کاروبار ہیں، سب سے پہلے تو گاڑیوں کا بزنس ہے۔ پھر شپ بریکنگ کا کاروبار، گڈانی بیچ پر ان کے خریدے ہوئے جہاز موجود رہتے ہیں۔ اسٹیل ری رولنگ کا کاروبار ہے۔ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار ہے اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے کاروبار ہیں جن سے خوب منافع حاصل ہوتا ہے اور یہ دیندار اور پابند شریعت لوگ انویسٹروں کی امانتوں کا پورا پورا تحفظ اور احترام کرتے ہوئے ان کو باقاعدگی کے ساتھ منافع ادا کرتے ہیں اور جو کوئی انویسٹر اپنی رقم واپس لینا چاہے، وہ دو ماہ کے نوٹس پر اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔"

منظور الحق صفیہ کو اس دیندار اور پابند شریعت فنانس کمپنی کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا اور صفیہ دل ہی دل میں حساب لگا رہی تھی کہ اگر وہ اپنی کل جمع پونجی، یعنی ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم ان قابلِ اعتماد اور نیک لوگوں کی کمپنی میں لگا دے، تو اندازاً اسے ہر ماہ چار سے ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ کی رقم بآسانی مل سکتی ہے تو پھر اور کیا چاہئے؟

"آپ لوگوں کی رقم وہاں کتنے عرصے سے جمع ہے منظور صاحب؟" صفیہ نے پوچھا۔

"بھئی یوں سمجھ لو کہ ہماری ستر ہزار روپے کی رقم وہاں جمع ہے اور اس میں سے اب تک کوئی پچیس ہزار روپے کی رقم ہم ماہانہ منافع کی شکل میں واپس لے چکے ہیں اور جب ہم پوری رقم منافع کی شکل میں واپس لے لیں گے، تو بھی ہماری رقم جوں کی توں جمع رہے گی۔"

"تو پھر آپ کا کیا مشورہ ہے منظور صاحب!" اس نے کہا۔ "کیا آپ کے خیال میں مَیں بھی اس کمپنی میں رقم جمع کرا دوں؟"

"ویسے تو تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔" منظور الحق نے کہا۔ "اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ تمہاری رقم قبول کر لیں گے.........."

"کیا مطلب؟" صفیہ نے چونک کر کہا۔ "کیا وہ رقم قبول کرنے سے انکار بھی کر سکتے

ہیں؟"

"ہاں۔" منظور الحق نے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا نا کہ وہ بڑے دیندار اور پابند شریعت لوگ ہیں۔ کاروبار میں بھی خالص اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہیں اور جس شخص کی بھی رقم قبول کرتے ہیں پہلے اس بات کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ وہ جائز کمائی کے پیسے ہیں۔ وہ لوگ غیر مسلموں کی رقم قبول نہیں کرتے۔ بینکوں میں کام کرنے والوں کی رقم قبول نہیں کرتے۔ چوری' ڈکیتی' بدمعاشی' سمگلنگ وغیرہ کا پیسہ قبول نہیں کرتے۔ وہ خالص حلال طریقوں سے کمایا ہوا پیسہ قبول کرتے ہیں۔ جیسا تمہارا پیسہ ہے اور جیسا میرا پیسہ ہے اور ہم جیسے بہت سے دوسروں کا پیسہ ہے۔"

صفیہ یہ سب کچھ سن کر دنگ رہ گئی' اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آج کل کے دور میں بھی فرشتوں کا وجود ہے اور انسانی شکلوں میں پائے جانے والے یہ فرشتے خود اسی کے اپنے شہر میں موجود ہیں اور وہ کیسی بدقسمت تھی کہ ان فرشتوں کے وجود سے اب تک ناواقف تھی۔

"ہر ماہ کو پہلی سے لے کر دس تاریخ تک کے درمیان کسی بھی دن کمپنی والوں کا اپنا آدمی گھر پر آ کر منافع کا لفافہ دے جاتا ہے۔" منظور الحق بتا رہا تھا۔ "خود جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بس ایک بار اکاؤنٹ کھلوانے کے لئے جانا ہوتا ہے اور بس۔ پھر ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر تو ہر ماہ گھر بیٹھے منافع کی رقم آتی رہتی ہے۔ بھلا اس سے زیادہ آسانیاں اور کیا ہو سکتی ہیں؟ وہ لوگ تو اس قدر شریف ہیں کہ اپنے انویسٹر کو آفس میں آنے کی زحمت ہی نہیں دیتے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے منظور صاحب!" اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ "آپ میرے پیسے بھی وہیں جمع کروا دیجئے۔ میں این ڈی ایف سی سے بھی اپنے پیسے نکلواؤں گی اور سارے پیسے اتحاد موٹرز میں جمع کرا دوں گی۔"

"تم اچھی طرح سوچ لو۔" منظور الحق نے اس سے کہا۔ "جلدبازی مت کرو اور دو چار لوگوں سے مشورہ کر لو .... اور ویسے بھی' ابھی تو رقم ملنے میں تمہیں کئی دن لگ جائیں گے۔ چیک فوراً ہی تو نہیں کلیئر ہو جائے گا۔ بہرحال' اگر تم جمع کرانا ہی چاہو گی تو مجھے پہلے اُن سے بات کر کے رکھنی ہو گی۔ وہ لوگ یوں فوری طور پر پیسہ قبول نہیں کر لیتے۔"

صفیہ چیک لے کر واپس گھر آ گئی۔ اس نے راستے ہی میں چیک کو اپنے چھوٹے

سے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروایا تھا اور پھر اس رات اس نے میرن خالہ کی بہو امینہ سے مشورہ کیا اور اس نے تقریباً ان ساری باتوں کی تصدیق کی جو منظور الحق نے صفیہ کو بتائی تھیں۔

"ہر ماہ گھر بیٹھے لفافہ آ جاتا ہے۔" امینہ نے اسے بتایا۔ "کبھی ناغہ نہیں ہوتا اور کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔ خود میرے پچاس ہزار جمع ہیں۔"

"کمال ہو گیا۔" صفیہ نے اپنے دل میں کہا۔ "اس شہر میں ایسی دیندار اور قابل اعتماد کمپنی موجود ہے اور مجھے اس کی کوئی خبر نہیں۔ حد ہو گئی۔ لعنت بھیجو این ڈی ایف سی اور خاص ڈیپازٹ پر۔ بس اس کمپنی میں ساری رقم جمع کرا دوں گی۔"

یہ سوچ سوچ کر صفیہ خود کو بہت زیادہ مطمئن محسوس کر رہی تھی کہ وہ مشین کے عذاب سے بچ گئی تھی' ورنہ اسے تو یہی نظر آ رہا تھا کہ ایک بار پھر اسے وہی نوکری کرنی پڑے گی۔ ایک میٹرک پاس لڑکی کو بھلا اور کون سی نوکری مل سکتی تھی؟

چار سے ساڑھے چار ہزار روپیہ ماہانہ تک کی آمدنی اس کے لئے آئیڈیل تھی۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے؟ وہ اور دونوں بچے خوب ٹھاٹ سے بسر کر سکتے تھے اور پھر' اس میں سے ہر ماہ اچھی خاصی رقم بچائی بھی جا سکتی تھی۔

☆======☆======☆

ایک ہفتہ کے بعد صفیہ نے ایک جگہ سے منظور الحق کو دفتر فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی میں رقم جمع کرانا چاہتی ہے۔ منظور الحق نے اسے بتایا کہ وہ دو تین روز بعد اس کے گھر آ کر اس سے بات کرے گا۔

منظور الحق کوئی ہفتے بھر کے بعد آیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ جیسے کوئی معرکہ سر کر کے آیا ہو۔ "مبارک ہو صفیہ بیٹی!" اس نے کہا۔ "میں نے تمہارے لئے بات کر لی ہے۔ وہ لوگ تمہاری رقم قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اب کسی وقت میرے ساتھ چلو اور رقم جمع کرا دو۔"

اس کے دو دن کے بعد صفیہ منظور الحق کے ساتھ اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی کے دفتر واقع یونیورسٹی روڈ آ گئی اور پہلے تو باہر سے ہی اس دفتر کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ کئی ہزار گز کے پلاٹ پر واقع عمارت کا نچلا حصہ گاڑیوں کا شو روم تھا اور یہاں بلاشبہ اس وقت بھی کروڑوں روپے کی مالیت کی گاڑیاں موجود تھیں۔

منظور الحق' صفیہ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوا اور وہ

لوگ سیڑھیاں چڑھ کر ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئے اور یہاں پہنچتے ہی صفیہ کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی سرمایہ کار کمپنی کے دفتر میں نہیں بلکہ کس جدید وضع کی خانقاہ میں آ گئی ہو۔ اس کے سامنے وہاں دفتر کے جتنے بھی لوگ موجود تھے۔ خواہ وہ نوجوان ہوں' درمیانہ عمر کے ہوں یا بوڑھے' سب کے چہروں پر داڑھیاں اور سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنے وہ لوگ' عورتوں کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کرتے ہوئے' اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ بڑا تقدس آمیز ماحول تھا۔ یہ تو کوئی ایسی جگہ معلوم ہوتی تھی جہاں زور سے بولتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔

صفیہ نے کئی برس تک ایک بڑی فیکٹری میں کام کیا تھا' جس کا آفس بھی خاصہ بڑا تھا۔ فیکٹری میں اور آفس میں بہت سے لوگ کام کرتے تھے۔ دفتری ماحول صفیہ کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھا لیکن یہاں کا دفتری ماحول اسے واقعی نیا لگ رہا تھا۔

مرکزی طور پر ایئرکنڈیشنڈ اس بہت بڑے اور وسیع و عریض ہال میں اسے کارکنوں میں سے کوئی ایک شخص بھی قمیض پتلون یا بش شرٹ پتلون میں نظر نہیں آیا۔ سارے کے سارے کارکن شلوار قمیض یا کُرتے میں ملبوس تھے۔ کسی ایک بھی کارکن کا سر ننگا نہیں تھا۔ سب ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور دوسرے لوگ بھی یہاں اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔

صفیہ نے یہاں کئی بڑے اعلیٰ افسروں کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی وردیوں میں ملبوس اندر سے باہر آتے دیکھا۔ کچھ باوردی باہر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ "اگر یہ لوگ بھی اس ادارے میں اپنے پیسے رکھتے ہیں تو پھر بھلا اس کی معتبری میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟"

معتبری میں شبہ تو پہلے بھی نہیں تھا۔ صفیہ پورے طور پر مطمئن ہو چکی تھی۔

منظور الحق صفیہ کو ساتھ لئے ہوئے ایک معمر باریش آدمی کے پاس گیا جو ہال میں بائیں جانب بنے ہوئے کاؤنٹروں کے قریب ایک بہت بڑی سی میز کے گرد ایک گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ مسز صفیہ شہاب ہیں' جن کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔" منظور الحق نے معمر باریش سے کہا۔ "یہ اپنی رقم لے کر آئی ہیں۔"

"ہاں' ہاں' مجھے یاد آ گیا۔" معمر باریش نے کہا۔ "آپ نے ان کے بارے میں بات کی تھی' بیوہ ہیں۔ ضرورت مند ہیں۔ کیا کریں صاحب' اکاؤنٹس کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی

ہے کہ ہم سنبھال نہیں پا رہے ہیں۔ کراچی کے علاوہ اندرونِ ملک بھی اکاؤنٹس بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ خیر' تو آپ کو یہ رقم آپ کے شوہر کے انتقال پر ملی تھی؟"

ایک مختصر سے انٹرویو کے بعد' جس میں معمر باریش نے صفیہ سے اس رقم کے بارے میں تفصیلات پوچھی تھیں جو وہ جمع کرانا چاہتی تھی' معمر باریش نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان باریش سے کہا۔ "ان کی پرچی بنا دیجئے۔" اور نوعمر باریش نے ایک پرچی پر صفیہ کا نام' زوجیت' پتہ اور جمع کی جانے والی رقم کے کوائف درج کر کے اس کے حوالے کرتے ہوئے اسے اندر بھیج دیا۔ منظور الحق اس کے ساتھ تھا۔

یہاں ایک باریش نوجوان نے صفیہ کے پاس سے پرچی لے کر اسے دیکھا اور پھر اس سے رقم طلب کی۔ نیز شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی بھی۔ صفیہ نے پورے ڈیڑھ لاکھ روپے اس کے حوالے کر دیئے اور اس نے اس ساری رقم کو گن کر ایک طرف رکھا اور کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کچھ تحریر کرنے لگا۔ اس تحریر کو مکمل کرنے کے بعد اس نے قریب بیٹھے ہوئے ایک عمر رسیدہ باریش شخص کی طرف بڑھا دیا۔ جس نے ایک رجسٹر میں کچھ اندراج کیا اور اس کاغذ کے اوپر ایک نمبر ڈال کر اور نیچے اپنے دستخط کر کے صفیہ کے حوالے کر دیا۔ "کارڈ باہر سے بنوا لیجئے گا۔" معمر شخص نے کہا۔

منظور الحق اٹھ کھڑا ہوا' اور حیران و پریشان صفیہ کے ساتھ باہر نکل آیا۔ صفیہ کاغذ کے اس حقیر سے پُرزے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کے مکمل اندراجات کو پڑھنے میں اسے ایک منٹ بھی نہیں لگا۔

اس میں صفیہ کا نام و پتہ درج تھا اور اس کے شناختی کارڈ کا نمبر اور رقم۔ اوپر ایک اکاؤنٹ نمبر دیا گیا تھا اور نیچے اس باریش آدمی کے دستخط تھے اور آج کی تاریخ 16 ستمبر 1986ء اور یہ ایک سادہ کاغذ تھا۔ یہ کسی ادارے کا لیٹر ہیڈ نہیں تھا اور نہ ہی اس پر کوئی مہر تھی۔ ادارے کے کسی فرد کا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ عمر رسیدہ باریش نے اس پر صرف اپنے دستخط کر دیئے تھے۔ نام' عہدہ' حیثیت' کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔

کسی بھی لحاظ سے کاغذ کے اس حقیر ٹکڑے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ واقعی محض ایک ردی کاغذ تھا۔

"منظور صاحب۔" صفیہ نے دبی زبان سے کہا۔ "کیا بس یہی.........."

"ارے اس کی فکر کیوں کرتی ہو؟" منظور الحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے تقدس کی قسم فرشتے کھاتے ہیں۔ ان کی یہ اتنی سی پرچی ہی بہت ہے۔ مجھے

دیکھو' جو کچھ تھوڑی بہت بھی بچت ہوتی ہے۔ میری بیوی اسے بھی جمع کرا دیتی ہے۔ اب دو سال بعد جب ہم اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کریں گے تو اس وقت ہمارے پاس اچھی خاصی جمع شدہ رقم موجود ہو گی اور اس رقم پر ہمیں برابر منافع بھی مل رہا ہے۔"

کاؤنٹر پر اس کاغذ کو دکھا کر صفیہ نے ایک کارڈ حاصل کر لیا جس پر اس کا نام و پتہ اور اکاؤنٹ نمبر تحریر تھا اور یوں یہ کارروائی مکمل ہو گئی۔ صفیہ اپنے ساتھ پورے ڈیڑھ لاکھ لے کر گئی تھی اور اس نے یہ ساری کی ساری رقم اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی میں لگا دی تھی۔

یہ اس کی اور اس کے مرحوم شوہر شہاب الدین کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ جو کچھ اس کی جمع پونجی تھی' وہ ساری کی ساری اس نے فرشتہ سیرت فنانس کمپنی میں جمع کروا دی تھی اور اب اس کے دونوں ہاتھ بالکل خالی تھے۔

مگر وہ مطمئن تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی رقم دیندار' دیانتدار' ایماندار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں ہے' جو ایک مقدس امانت کی طرح اس کی حفاظت کریں گے اور اس میں خیانت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

اگلے مہینے کی پانچ تاریخ کو دروازے پر دستک ہوئی اور جب صفیہ نے دروازہ کھولا تو دروازے پر ایک داڑھی والے مولانا کو کھڑے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ایک بریف کیس تھا۔

"محترمہ بیگم صفیہ شہاب یہیں رہتی ہیں؟" انہوں نے زمین کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔" صفیہ نے کہا۔ "میں ہی ہوں صفیہ شہاب' فرمایئے۔"

"میں اتحاد موٹرز کی طرف سے آیا ہوں۔" مولانا نے اسی طرح صفیہ کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "آپ کے منافع کی رقم۔"

"اندر تشریف لے آیئے مولانا!" صفیہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر مولانا کو اندر بلا لیا۔ مولانا نے اندر آ کر اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک لفافہ نکالا۔ اس لفافے پر کوئی نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ صرف اکاؤنٹ نمبر لکھا تھا اور رقم۔ مولانا نے صفیہ سے کارڈ طلب کیا جو صفیہ نے فوراً لا کر دے دیا۔ مولانا نے کارڈ پنچ کیا۔ لفافہ صفیہ کے حوالے کیا' اور جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ صفیہ نے انہیں ایک پیالی

چائے کے لئے بہت روکنا چاہا لیکن مولانا تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انہیں بہت کام ہے۔

صفیہ نے ان کے جانے کے بعد خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور وہ نوٹ گننے کے بعد تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی۔ پورے ساڑھے چار ہزار کی رقم تھی۔ ڈیڑھ لاکھ روپے پر ماہانہ ساڑھے چار ہزار روپیہ منافع۔

اس سے زیادہ بڑی بات بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔ صفیہ نے سکھ' اطمینان اور سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ اب اسے مشین کا پہیہ گھمانے کی ضرورت نہیں تھی' اب اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی' سوائے اپنے بچوں کی اور گھر کی دیکھ بھال کرنے کے۔ بھلا اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ اسے اب کوئی جان لیوا مشقت نہیں کرنی تھی۔

اور پھر تو یہ سلسلہ ایک مستقل صورت اختیار کر گیا۔ مولانا عبدالحفیظ ہر ماہ' پہلی سے لے کر دس تک' کسی بھی تاریخ کو آتے اور لفافہ دے کر اور کارڈ میں اس مہینے کے نام کو پنچ کر کے چلے جاتے۔ رقم بالعموم چار ہزار اور ساڑھے چار ہزار کے درمیان ہوتی تھی اور یہ رقم اتنی ہوتی تھی کہ صفیہ اپنے تمام اخراجات پورے کر کے بھی اچھی خاصی رقم بچا لیتی تھی۔

صفیہ نے ستمبر 1986ء میں اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی میں اپنا اکاؤنٹ کھولا تھا اور 1987ء کا پورا سال اس نے بہت سکون اور اطمینان کے ساتھ گزارا۔ وہ مکمل طور پر مطمئن تھی کہ اس کی رقم امانتدار اور متقی و پرہیزگار لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو کاروبار اور تجارت میں بھی مذہب اور شریعت کے اصولوں سے روگردانی نہیں کرتے اور پوری دیانت داری کے ساتھ انویسٹروں کو ان کا ماہانہ منافع ان کے گھروں پر پہنچاتے رہتے ہیں۔

اسی دوران کراچی میں ایک نیا تماشہ شروع ہو چکا تھا۔ اس نئے تماشے کا سلسلہ تو کافی عرصے سے جاری تھا لیکن 1987ء کے سال میں یہ تماشہ اپنے عروج پر پہنچ کر پھر اپنے زوال سے بھی ہم کنار ہو گیا۔

ایک دم سے درجنوں' بیسیوں' بلکہ پچاسیوں خودرو سرمایہ کار کمپنیاں کراچی کے گلی کوچوں میں اُگ آئی تھیں۔ ان کے قیام پر کوئی قانونی پابندی نہیں تھی اور نہ انہیں کاروبار کرنے کی ممانعت تھی۔ اخبارات کے پورے کے پورے صفحات پر ان کمپنیوں کے

اشتہاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹی وی پر بھی ان کمپنیوں کے اشتہاروں کی بھرمار تھی۔ حکومت وقت کے زیر کنٹرول ذرائع سے ابلاغ ان کمپنیوں کی پبلسٹی ہو رہی تھی۔ ٹی وی پر جو خالص سرکاری ادارہ تھا' اخبارات میں' جن میں سرکاری اخبارات بھی شامل تھے' بڑے بڑے قومی اخبارات میں' جن کو عوام معتبر گردانتے تھے۔ روزانہ سرمایہ کار کمپنیوں کے اشتہاروں کی بھرمار تھی۔ گلی کوچوں میں قائم ہونے والی چھوٹی چھوٹی سرمایہ کار کمپنیوں کے علاوہ بعض بڑی بڑی' دیو پیکر' ہشت پا سرمایہ کار کمپنیاں بھی قائم ہو گئیں جو عوام سے بے تحاشہ پیسہ گھسیٹ رہی تھیں۔ تحریص و ترغیب کی ایسی زبردست گرم بازاری تھی کہ پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ ان دیو پیکر اور ہشت پا سرمایہ کار کمپنیوں میں ایک فنانس کمپنی بہت بڑی تھی جس کا مالک احد نانا بھائی نامی کوئی بدنام اور شاطر شخص تھا۔ اس کمپنی نے لوگوں سے پیسہ گھسیٹنے کے لئے سات اور آٹھ فیصدی ماہانہ منافع تک کا لچ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے' چند ماہ کے اندر اندر' اربوں روپیہ جمع کر لیا۔

حکومت وقت کے کنٹرول میں تمام ذرائع ان سرمایہ کار کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ان کو عوام سے رقوم جمع کرنے کا پورا پورا موقع دیا جا رہا تھا اور انویسٹ منٹ کمپنیوں کے نام پر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا اس میں نوکر شاہی کے بڑے بڑے لوگ شامل تھے۔ ہر انویسٹ منٹ کمپنی کی پشت پر کوئی نہ کوئی بہت بڑا سرکاری آدمی موجود تھا۔ پولیس' سی آئی اے' ایف آئی اے کے بڑے حکام ان کمپنیوں میں حصہ دار تھے اور دونوں ہاتھوں سے رقم لوٹ لوٹ کر جمع کر رہے تھے۔ احد نانا بھائی کی کمپنی کے بارے میں تو یہ بات بہت سے لوگوں کو معلوم تھی کہ ایک صوبائی وزیر کا بیٹا اس کا پارٹنر تھا۔

اور جب ان انویسٹ منٹ کمپنیوں کی جانب روپے کے زبردست بہاؤ کے نتیجے میں حکومت کے اداروں میں جمع کی جانے والی رقوم میں زبردست کمی نمودار ہونا شروع ہوئی اور بینکنگ کا کاروبار بری طرح متاثر ہونے لگا تو پھر حکومت نے ایک نئی قلابازی کھائی۔

سرمایہ کار کمپنیوں کے پیٹ تو اس قدر بھر گئے تھے کہ وہ پھٹنے کے قریب تھے اور سرکاری عمال و اہل کار اپنا اپنا حصہ لے چکے تھے اور لے رہے تھے۔ سب کے سب پوری طرح' خوب آسودہ خاطر ہو چکے تھے۔ جنہیں دولت سمیٹنی تھی وہ سمیٹ چکے تھے اور سارے متعلقین کو ان کے حصے پہنچا دیئے گئے تھے اور اب سرکاری عمال کے مفادات کو ان فراڈ کمپنیوں کے بند ہو جانے سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چنانچہ اب حکومت کی طرف سے انہی اخبارات میں' جن میں ان کمپنیوں کے پورے پورے صفحے کے اشتہارات شائع

ہوتے تھے' اس ٹی وی پر جس پر ان کمپنیوں کی بہت زوردار "طویل دورانیے" کی پبلسٹی ہوا کرتی تھی' ان کمپنیوں کے خلاف اشتہارات نمودار ہونا شروع ہو گئے جن میں لوگوں کو خبردار کیا جاتا تھا کہ وہ کاغذی محل نہ بنائیں اور سرمایہ کار کمپنیوں کے فراڈ سے ہوشیار رہیں۔ عوام کو یاد دلایا جا رہا تھا کہ لاہور میں 1970ء میں بہت سی سرمایہ کار کمپنیاں اسی طرح عوام کا پیسہ لے کر غائب ہوئی تھیں۔

اور اس کے ساتھ ہی کراچی کی سرمایہ کار کمپنیاں ایک ایک کر کے غائب ہونی شروع ہو گئیں۔

اور پھر تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ عالم ہو گیا کہ اخبار میں روزانہ کسی نہ کسی سرمایہ کار کمپنی کے مالکوں کی' دفتر بند کر کے اور رقم سمیٹ کر بھاگ جانے کی خبریں شائع ہونے لگیں اور لوگوں میں سراسیمگی کی لہر دوڑنے لگی۔ بالخصوص کراچی کے لوگوں کا اربوں روپے کا سرمایہ ان کمپنیوں میں لگا ہوا تھا اور اب کمپنیوں کے ڈائریکٹر دفتر بند کر کے' مال اسباب سمیٹ کر' روپیہ لے کر' بھاگ رہے تھے۔ زیادہ تر روپیہ تو پہلے ہی ملک سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ کتنے ہی سرکاری عمال اور اہل کار لکھ پتی سے کروڑ پتی بن چکے تھے اور ان کی آنے والی کئی نسلوں تک کو کچھ کام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

یہ ایک بہتی گنگا نہیں تھی' بلکہ موجیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ جو کراچی میں یک بیک ایک سازش کے تحت ابل پڑا تھا اور جس میں جرائم پیشہ اور سماج دشمن عناصر کے ساتھ ساتھ سرکاری عمال اور اہل کار بھی رات دن غوطے لگا رہے تھے۔ یہ ایک ایسی زبردست لوٹ مار تھی جس کی ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ رات دن رزقِ حلال کا مژدہ پیٹنے والے حکمرانوں نے رزقِ حرام کی ایک اور بہت مؤثر اور سریع الحصول شکل ایجاد کر لی تھی اور اس کی مدد سے غریبوں' ناداروں' محنت کشوں' یتیموں' بیواؤں' ریٹائرڈ لوگوں' بے وسیلہ لوگوں' مزدوروں' ضرورت مندوں کی زندگی بھر کی کمائی کو' ان کی ساری جمع پونجی کو' پوری بے دردی' سفاکی اور شیطنت کے ساتھ لوٹ لوٹ کر غاصبوں کی بوریاں بھری جا رہی تھیں۔

انویسٹ منٹ کمپنیوں کے لوگوں نے جب بھاگنا شروع کیا تو کراچی کے لوگوں میں شدید اضطراب و ہیجان کی لہر دوڑ گئی۔ سرمایہ کار کمپنیوں کی جانب رقومات کا بہاؤ ایک دم رک گیا اور لوگ اپنی اپنی جمع شدہ رقوم نکلوانے پر آمادہ ہونے لگے۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آ سکی۔ رقم نکلنے سے پہلے ہی کمپنی غائب ہو جاتی تھی

اور پھر اس کے اسٹاف کا' ڈائریکٹروں کا' کسی کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ پولیس میں رپورٹیں درج کرائی جانے لگیں اور پولیس' سی آئی اے اور ایف آئی اے کے لئے جو پہلے ہی سرمایہ کار کمپنیوں سے خوب مال کما چکے تھے' اندھی کمائی کا ایک اور راستہ کھل گیا۔ کمپنیوں کے مالکوں کو شہر سے اور ملک سے فرار کروانے کے عوض بھاری بھاری رشوتوں کی وصولیابی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کمائی ہوئی رقم میں سے مزید حصے کے مطالبے ہونے لگے۔ ہر سطح پر کرپشن کو سربلندی و سرفرازی نصیب ہوئی۔

بیسیوں کمپنیاں بھاگ گئیں' جن میں احد نانا بھائی کی کمپنی بھی شامل تھی' جس نے اربوں روپیہ جمع کیا تھا۔ لاکھوں لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔ کتنے ہی خاندان ویران ہو گئے اور کتنے بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ ہر طرف ایک اندھیر مچا ہوا تھا۔ کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرپشن ہی اس نظام حکومت کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز اور سرمایہ افتخار بن چکا ہے۔

صفیہ اخباروں میں یہ سب کچھ پڑھتی تھی اور بعض اوقات تو وہ بڑی گھبرا جاتی تھیں کہیں .... اتحاد موٹرز کا بھی یہ حشر نہ ہو۔ کہیں وہ لوگ بھی' دوسروں کی طرح' اپنا بوریا بستر گول کر کے چپکے سے فرار نہ ہو جائیں۔

مگر نہیں۔ وہ بھلا کیوں بھاگیں گے؟ وہ کوئی فراڈ تھوڑی ہیں۔ وہ تو اتنے عرصے سے کام کر رہے ہیں۔ اتنے اثاثے ہیں ان کے اور پھر سب سے بڑی بات' سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ وہ سچے اور پکے مسلمان ہیں' پابندِ شریعت ہیں۔ امانت دار ہیں۔ دیانت دار ہیں۔ وہ بھلا ایسا شیطانی کام کیوں کر سکتے ہیں؟

اس دوران وہ گھبراہٹ اور تشویش کے عالم میں دوبار منظور الحق کے گھر بھی گئی تھی اور منظور الحق اور اس کی بیوی نے اس کی بدحواسی اور سراسیمگی کا مذاق اڑایا تھا۔

"تم بھی کمال کرتی ہو صفیہ!" منظور الحق نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے یہ جو بھاگ رہے ہیں یہ سب کے سب تو ہیں ہی چور' اچکے اور فراڈ اور احمق ہیں وہ سارے کے سارے لوگ جنھوں نے ان بدمعاشوں کو قابلِ اعتبار سمجھ کر ان کے پاس اپنی رقمیں جمع کرا دیں۔ ارے اللہ کے بندو' ذرا تو عقل سے کام لو۔ ذرا تو سوچو سمجھو کہ تم کیا کر رہے ہو' اس طرح بالکل انجان آدمیوں کے ہاتھوں میں اپنی ساری جمع پونجی دے دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ وہ تو بیٹھے تھے دکانیں کھول کھول کر لوگوں کو لوٹنے کے لئے اور وہ احد نانا بھائی' ذرا دیکھو' اس نے کس قدر اندھیر مچا رکھا تھا۔ کروڑوں روپے کی تو وہ صرف پبلسٹی

کرواتا تھا۔ ٹی وی سے' اخبارات سے۔ ایک ایک دن کے اخبار میں اس کے مجموعی طور پر دو دو ڈھائی ڈھائی صفحے کے اشتہار شائع ہوتے تھے۔ ٹی وی سے کیسے کیسے زبردست اشتہارات نشر ہوتے تھے۔ کس قدر پیسہ کمایا اس نے لوگوں سے۔ کوئی ٹھکانہ ہے بھلا؟ اور اب۔ اب سب کچھ لے کر بھاگ گیا اور لوگ اپنے سروں پر ہاتھ رکھ کر رو رہے ہیں۔ لٹ گئے بے چارے' ہزارہا لوگ لٹ گئے۔"

"مگر .... مگر ہم لوگ تو پوری طرح محفوظ ہیں نا منظور صاحب!" اس نے پوچھا۔

"بالکل بے فکر رہو بیٹی!" منظور الحق نے اس سے کہا۔ "ہمارا واسطہ شیطانوں سے نہیں ہے۔ فرشتوں سے ہے۔ اتحاد موٹرز اور دوسری سرمایہ کار کمپنیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ باقی ساری کمپنیاں تو بدمعاشوں کی ٹولیاں تھیں۔ ان کا تو ایک دن یہی حشر ہونا ہی تھا اور تم بالکل پریشان مت ہو۔ مجھے تو اگلے سال اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کرنی ہے اور میرے پاس اس رقم کے علاوہ اور کوئی رقم نہیں جو اتحاد موٹرز والوں کے پاس جمع ہے۔"

صفیہ مطمئن ہو گئی۔ دریں اثنا کراچی میں 1987ء کا سال لاکھوں عوام کے لئے خوفناک بدنصیبی اور محرومی کا سال تھا۔ اس ایک سال کے دوران حکومت وقت کی اعانت و چشم پوشی سے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت درجنوں سرمایہ کار کمپنیوں نے کراچی اور ملک کے دوسرے حصوں کے عوام کے اربوں روپے جمع کئے اور پھر وہ راتوں رات اپنے اپنے دفاتر بند کر کے بھاگ گئیں۔ 1987ء کے سال کے اختتام پر اور 1988ء کے سال کے آغاز تک یہی صورتِ حال رہی۔ سرمایہ کار کمپنیوں کے دفتروں کے بند دروازوں پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے جن میں اُن گھریلو اور پردہ نشین خواتین سے لے کر' جنھوں نے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر کی جانے والی ساری کی ساری بچت کو ان کمپنیوں کے حوالے کر دیا تھا' وہ عمر رسیدہ بوڑھے بھی شامل تھے جنھوں نے ملازمتوں سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنی زندگی بھر کی کمائی ان کمپنیوں میں جمع کروا دی تھی اور اب یہ کمپنیاں سب کچھ لے کر بھاگ گئی تھیں اور اس معاملے کا سب سے زیادہ دردناک اور الم انگیز پہلو یہ تھا کہ حکومت اس معاملے میں سفاکانہ اور سنگ دلانہ لاتعلقی کا رویہ اختیار کئے ہوئے تھی۔

1988ء کا سال شروع ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی کراچی میں نمودار ہونے والی

تمام کی تمام سرمایہ کار کمپنیاں' عوام کا اربوں روپے کا سرمایہ سمیٹ کر بھاگ گئی تھیں۔

ایف آئی اے' سی آئی اے اور پولیس کے لوگوں نے اس کاروبار میں کروڑوں روپے کمائے تھے۔ بھاگ جانے والی کمپنیوں کے ڈائریکٹروں اور مالکوں نے اپنے آپ کو عوام کی نظروں سے چھپانے کے لئے اپنی اندھی کمائی میں سے ان لوگوں کو کافی حصہ دے دیا تھا اور کوئی ایک کمپنی بھی ایسی نہیں تھی جس کی پشت پر کوئی بااثر ہاتھ نہ موجود ہو۔

1988ء کے سال کے اوائل میں کراچی میں سوائے اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی کے اور کوئی سرمایہ کار کمپنی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ساری کمپنیاں بھاگ گئی تھیں۔ سب سے زیادہ رقم احد نانا بھائی نے لوٹی تھی جس کی قائم کردہ سرمایہ کار کمپنی نے بلامبالغہ ایک ارب سے زائد روپے کی رقم جمع کرلی تھی اور وہ یہ ساری رقم لے کر بھاگ گیا تھا۔

صفیہ کے دل کی دھڑکنیں کسی کسی وقت تیز ہو جاتی تھی۔ اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی میں جمع شدہ اس کی رقم اس کی اور اس کے مرحوم شوہر کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ اگر خدانخواستہ اس کے ہاتھ سے یہ رقم نکل جاتی تو اس کے تو روٹیوں کے لالے پڑ جاتے۔ اس کے پاس آمدنی کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے نہ کہیں ملازمت کی تھی اور نہ اس بارے میں سوچا تھا۔

لیکن اسے یقین تھا کہ اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی والے کبھی نہیں بھاگیں گے۔ ان کے کروڑوں' بلکہ شاید اربوں روپے کے تو اثاثے تھے کراچی میں۔ ان کو چھوڑ کر وہ کہاں جا سکتے تھے؟

مولانا عبدالحفیظ ہر ماہ پابندی سے لفافہ لے کر آتے تھے اور صفیہ کو دے کر چلے جاتے تھے۔ صفیہ ہر بار انہیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ اندر بلا کر بٹھاتی اور اکثر ان کے منع کرنے کے باوجود جلدی جلدی پانی کھولا کر ایک پیالی چائے بنا دیتی۔ مولانا نیچی نظریں کئے بیٹھے رہتے اور صفیہ ان کے چہرے پر پھیلے ہوئے ایمانداری اور پرہیزگاری کے نور کو دیکھ کر چپکے چپکے دل میں خوش ہوتی رہتی۔ کتنے اچھے تھے یہ لوگ۔ کتنے لائق تعظیم۔ ان لوگوں نے تو صفیہ کی زندگی کو جنت بنا دیا تھا۔ ورنہ شوہر کے انتقال کے بعد اسے ایک بار پھر اسی جبری مشقت کے جہنم میں جلنا پڑتا۔

جون کے مہینے کی شروع تاریخوں میں مولانا عبدالحفیظ حسب معمول آئے اور مئی کے مہینے کا منافع دے کر چلے گئے۔ اس ماہ منافع کی رقم ذرا کم تھی لیکن یہ کوئی ایسی خاص

بات نہیں تھی۔ یہ کمی بیشی تو چلتی ہی رہتی تھی۔

دونوں بچے اب اسکول جاتے تھے۔ صفیہ نے بڑی کوشش کر کے ان کا انگریزی میڈیم کے ایک بہترین اسکول میں داخلہ کروایا تھا جہاں فیس کی شرح آسمان سے باتیں کرتی تھی اور فیس کے علاوہ دیگر لوازمات بھی بہت زیادہ اخراجات ہوتے تھے لیکن صفیہ کو ان باتوں کی کیا پرواہ تھی۔ پیسہ تو آ رہا تھا اور ساری ضرورتیں بآسانی پوری ہو جاتی تھیں۔ بچوں کی پڑھائی ہی تو اصل مسئلہ تھی اور اس پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اب سب کچھ بچوں کا ہی تو تھا اور بچوں کے لئے تھا۔

پھر بھی صفیہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا ضرور لیا کرتی تھی اور اس کے لئے اسے کوئی بہت زیادہ جوڑ توڑ' کتر بیونت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

جولائی کا مہینہ شروع ہوا اور اس کے ساتھ ہی صفیہ مولانا عبدالحفیظ کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ پہلی سے دس تاریخ کے دوران وہ کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ پچھلے ماہ کے بچے ہوئے کچھ پیسے صفیہ کے پاس موجود تھے اور اس نے انہیں بینک میں جمع نہیں کروایا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مولانا پیسے لے کر آ جائیں تو پھر اس کے بعد ہی پچھلے ماہ کے بچے ہوئے پیسوں کو وہ بینک میں جمع کروا دے گی۔

لیکن دس تاریخ گزر گئی اور مولانا نہیں آئے۔ شاید کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہو۔ اس نے دل میں سوچا لیکن پھر جب پندرہ تاریخ تک مولانا نہیں آئے تو اس نے میرن خالہ کی بہو امینہ سے پوچھا۔ امینہ کے گھر بھی پیسوں کا لفافہ لے کر مولانا عبدالحفیظ ہی آتے تھے۔ امینہ نے اسے بتایا کہ اس کے پاس بھی مولانا اب تک نہیں آئے ہیں۔

"اس بار مولانا نے بہت دیر لگا دی۔" صفیہ نے قدرے تشویش کے ساتھ امینہ سے کہا۔

"آدمی کے ساتھ بہت سی مجبوریاں ہو سکتی ہیں صفیہ!" امینہ نے کہا۔ "وہ آئیں گے ضرور' آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ نہ آئے ہوں۔ دیر سویر تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا کہ وہ بالکل نہ آئیں۔ دو چار روز اور دیکھتے ہیں پھر میں کسی کو کمپنی کے دفتر بھیجوں گی۔"

"کیا کروں امینہ!" صفیہ نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہے' میرے پاس اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے اس رقم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اگر خدا نہ کرے کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ہم تو بالکل ہاتھ جھاڑ کر رہ جائیں گے۔"

"خدا کے لئے ایسی باتیں مت کرو صفیہ!" امینہ نے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "وہ .... وہ سب بہت ایماندار لوگ ہیں۔ وہ بھلا ایسا کیوں کرنے لگے؟ کیا ان کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہے؟ قیامت کا خوف نہیں ہے؟ نہیں صفیہ! وہ سچے مسلمان ہیں اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ ان کے کتنے اثاثے ہیں، پراپرٹی ہے۔"

"یہ سب کچھ ان کا اپنا نہیں ہے امینہ!" صفیہ نے آہستہ سے کہا۔ "اگر تم ذرا غور سے سوچو تو یہ سارے اثاثے، ساری پراپرٹی، سارا کاروبار، یہ سب کچھ کہاں سے آیا؟ یہ ہم لوگوں کا پیسہ ہے امینہ! سب کچھ ہم لوگوں کا ہے۔ ان کے پاس جتنا بھی پیسہ ہے، وہ ہمارا ہی تو ہے اور کس کا ہے؟ یہ سارے اثاثے ان کے نہیں، ہمارے ہیں۔ انویسٹرز کے ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے صفیہ!" امینہ نے کہا۔ "مگر پھر بھی، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ایک بات جانتی ہوں اور وہ یہ کہ اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی والے بے ایمان نہیں ہو سکتے۔"

پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور مولانا نہیں آئے۔ صفیہ نے سخت گھبراہٹ اور وحشت کا شکار ہو کر پڑوس سے منظور الحق کو فون کیا اور اسے مولانا کے نہ آنے کے بارے میں بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" منظور الحق نے کہا۔ "میں پرسوں خود کمپنی کے دفتر گیا تھا کیونکہ جو مولانا میرے گھر آتے ہیں، وہ بھی نہیں آئے تھے۔ دفتر والوں نے یہ بتایا کہ کچھ انکم ٹیکس وغیرہ کے معاملات ہیں، جن کی وجہ سے منافع کی ادائیگی میں دیر ہو گئی ہے اور منافع بھی اس دفعہ کم تھا۔ اس لئے اب انہوں نے یہ طے کیا ہے کہ جون اور جولائی کا منافع اکٹھا اگست میں ادا کر دیں گے۔ یعنی دو ماہ کا اکٹھا منافع ملے گا۔"

"تو گویا .... اس ماہ کوئی منافع نہیں ملے گا؟" صفیہ نے قدرے ناامیدی کے ساتھ کہا۔

"ایسا نہیں ہے۔" منظور الحق نے اسے بتایا۔ "منافع تو گزشتہ ماہ کا بھی ملے گا لیکن اس ماہ کے دوران نہیں ملے گا بلکہ اگلے ماہ ملے گا۔ میں نے ان لوگوں سے بڑی تفصیل سے بات کی تھی اور انہوں نے یہ بتایا تھا کہ شپ بریکنگ میں کچھ ہڑتال وغیرہ چل رہی تھی، کام رکا ہوا تھا۔ کچھ انکم ٹیکس کے معاملات تھے اور اس کے علاوہ کچھ دیگر کاروباری دشواریاں تھیں، جن کی بنا پر انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ منافع اگرچہ کم ہو گا لیکن برابر ملتا رہے گا۔"

صفیہ کچھ نیم مطمئن سی تھی۔ بہرحال، اس نے یہ ساری باتیں امینہ کو بھی بتا دیں اور امینہ نے اس کو ایک بار پھر یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اگلا مہینہ شروع ہوا اور شروع ہو کر ختم بھی ہو گیا۔ مولانا نہیں آئے۔ اس دوران صفیہ نے آدھے سے زیادہ مہینہ گزر جانے کے بعد منظور الحق سے ایک بار فون پر بات کی تھی اور منظور الحق نے اسے بتایا تھا کہ وہ کمپنی کے دفتر گیا تھا اور وہاں اسے یہ بتایا گیا کہ اگلے ماہ سے منافع کی تقسیم کا باقاعدہ کام شروع ہو جائے گا اور تمام بقایا جات بھی ادا کر دیئے جائیں گے۔ بس کچھ دن اور انتظار کرنا ہو گا۔

لیکن صفیہ اس صورتِ حال سے بالکل مطمئن نہیں تھی۔ وہ سخت پریشان ہو رہی تھی۔ یہ معاملہ تو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ بنتا جا رہا تھا اور اس وقت تو وہ بالکل ہی حواس باختہ ہو گئی۔ جب چند روز کے بعد امینہ نے اسے یہ بتایا کہ اس نے دیکھا کہ ساری گاڑیاں غائب تھیں۔ کمپنی کے دفتر کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں، جہاں کروڑوں روپے مالیت کی گاڑیاں چوبیس گھنٹے موجود رہتی تھیں، اب ایک بھی گاڑی موجود نہیں تھی۔

"اور منافع کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟" صفیہ نے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"یہی کہ اگلے مہینے سے ادائیگی شروع کریں گے اور بقایاجات بھی دیں گے۔" امینہ نے کہا اور یہ سب کچھ کہتے وقت اس کا لہجہ اعتماد و یقین سے خالی تھا اور اس میں تشویش کی جھلک موجود تھی۔

"جانتی ہو صفیہ، وہاں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔" امینہ نے کچھ سہمے سہمے انداز میں کہا۔ "یہ لوگ اپنی رقم واپس لینے کے لئے درخواستیں دے رہے تھے، ان کی تعداد بہت زیادہ تھی صفیہ۔ میرا خیال ہے، میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی رقم کی واپسی کی درخواست دے دینی چاہئے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں مولانا کی آمد کا انتظار نہیں کرنا چاہئے؟" صفیہ نے کہا۔ "پہلے ہی درخواست دے دینی چاہئے؟"

"میں تو کہتی ہوں کل ہی درخواست دے دو۔" امینہ نے شکست خوردہ اور بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ "حالات کا کچھ بھروسہ نہیں صفیہ! اور مجھے تو وہاں بھی معاملات کچھ گڑبڑ معلوم ہوتے ہیں، خدا خیر کرے۔"

"لیکن وہ تو سب کے سب بڑے متقی اور پاکباز لوگ ہیں۔" صفیہ نے کہا۔ "کیا ان

کی طرف سے بھی اس قسم کا کوئی خطرہ موجود ہے؟"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔" امینہ نے کہا۔ "مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ بے حد ایماندار لوگ ہیں مگر کون جانے .... صفیہ! یہاں کسی کا بھروسہ نہیں ہے۔ سب نکلوا لو۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" صفیہ نے فوراً کہا۔ "پھر ہم دونوں کل ہی چلتے ہیں۔ وہاں چل کر رقم کی واپسی کے لئے درخواست دے دیں گے اور اگر اس کے بعد مولانا آئے تو ہم ان کو بھی بتا دیں گے کہ ہم نے رقم کی واپسی کے لئے درخواست دے دی ہے۔"

چنانچہ حسب پروگرام اگلے روز وہ دونوں کمپنی کے دفتر واقع یونیورسٹی روڈ پہنچیں۔ درخواستیں وہ گھر سے لکھ کر اپنے ساتھ لے گئی تھیں اور وہاں جا کر صفیہ نے دیکھا کہ امینہ کو واقعی صحیح اطلاع موصول ہوئی تھی۔ وہاں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی جو رقم کی واپسی کے لئے درخواستیں دے رہی تھی اور ان درخواستوں کی وصولیابی اور رسیدوں کے اجرا کے لئے ایک علیحدہ کاؤنٹر بنایا گیا تھا۔ یہاں بہت رش لگا ہوا تھا۔

کمپنی کے دفتر میں لوگوں کا بہت ہجوم تھا اور کمپنی کے ملازمین کو دم مارنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ وہ تمام لوگوں کے سوالوں کے جوابات دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک ایک ملازم بیک وقت دس دس آدمیوں سے الجھا ہوا تھا۔

صفیہ اور امینہ کا نمبر بہت دیر میں آیا اور بڑی مشکل سے وہ رقم کی واپسی کے لئے اپنی درخواست جمع کروا سکیں اور پھر جب وہ یہاں سے باہر نکلیں تو دونوں بہت حیران و پریشان تھیں۔ وہاں موجود لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے جن کو سن کر دل دہلا جا رہا تھا۔ عجیب افراتفری اور بے یقینی کی فضا تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ لوگوں کا اس کمپنی پر سے بھی اعتماد اٹھ چکا تھا اور وہ اپنی رقوم واپس مانگ رہے تھے۔

ایک اور نہایت پریشان کن بات یہ تھی کہ اب کمپنی کی جانب سے رقم کی واپسی کی مدت چھ ماہ مقرر کی گئی تھی' جبکہ اس سے پہلے یہ مدت صرف دو ماہ تھی۔ جو لوگ بھی واپسی کے لئے درخواستیں دے رہے تھے' انہیں یہ بات بتائی جا رہی تھی کہ رقم کی واپسی چھ ماہ بعد ہی ممکن ہو سکے گی۔

اگلے چند روز صفیہ نے سخت ذہنی پریشانی میں گزارے۔ اس دوران وہ ایک بار منظور الحق کے گھر بھی گئی اور اس نے انہیں بتایا کہ اس نے رقم کی واپسی کے لئے درخواست دے دی ہے اور کمپنی نے چھ ماہ کے بعد رقم کی واپسی کا وعدہ کیا ہے۔

"ان کی بھی کچھ کاروباری مشکلات ہیں۔" منظور الحق نے آہستہ سے کہا اور صفیہ نے پہلی بار اس کے لہجے کو خوداعتمادی اور یقین سے خالی پایا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی اتحاد موٹرز کے بارے میں بات کرتا تھا تو اس کے لہجے میں استحکام' یقین اور اعتماد کا عنصر شامل ہوتا تھا لیکن آج ایسا نہیں تھا۔ آج پہلی بار اتحاد موٹرز کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں شکستگی تھی اور اعتماد کا فقدان تھا۔

"بہرحال' تم نے ٹھیک ہی کیا۔" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ میں بھی رقم کی واپسی کے لئے درخواست دے دوں۔ میرے لئے تو شبانہ کی شادی کا مسئلہ ہے۔ اس کام کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی رقم نہیں ہے۔ پچھلے دنوں تو ہم نے اس میں تھوڑا تھوڑا مزید اضافہ کر کے اس کو پچاسی ہزار روپے تک پہنچا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ منافع کے جو پیسے آتے تھے' ان میں سے زیادہ تر پیسے ہم دوبارہ اپنے اسی اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتے تھے۔ اس طرح ہماری رقم اب پورے پچاسی ہزار روپے بن چکی ہے۔"

"منظور صاحب! آپ بھی واپسی کے لئے درخواست دے دیجئے۔" صفیہ نے کہا۔ "اور جلدی کیجئے۔ وہ اب چھ ماہ کا وقت مانگ رہے ہیں۔"

"میری مشکل یہ ہے کہ میں ان دنوں دفتر سے ایک منٹ کے لئے بھی نہیں نکل سکتا۔" منظور الحق نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "وہاں آڈٹ چل رہا ہے اور اکاؤنٹینٹ صاحب مجھے ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ ایک ہفتے کے بعد ہی ممکن ہو سکے گا..........."

"آپ ایسا کیجئے' درخواست لکھ کر مجھے دے دیجئے۔" صفیہ نے کہا۔ "میں خود جا کر آپ کی دخواست جمع کروا دوں گی۔ درخواست جمع کرنے کے لئے اکاؤنٹ ہولڈر کا خود موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔" منظور الحق نے کہا اور کاغذ قلم سنبھال کر درخواست لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ صفیہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

منظور الحق کی آنکھوں کے گرد پہلے سے موجود سیاہ حلقے آج کچھ زیادہ ہی سیاہ نظر آ رہے تھے' اس کے رخساروں پر پڑی ہوئی جھریاں کچھ زیادہ ہی گہری معلوم ہو رہی تھیں۔ صفیہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے منظور الحق پچھلے صرف کچھ دنوں کے دوران ایک دم سے بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا ہو۔ صفیہ کو اس پر بہت ترس آیا اور اس سے دلی ہمدردی بھی محسوس

ہوئی۔ منظور الحق واقعی ایک ایسا شخص تھا جس نے کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا تھا اور اب وہ کس قدر دکھی تھا۔ اس کی بیٹی شبانہ کی شادی کا معاملہ تھا اور یہاں ساری جمع شدہ رقم کی نیا ڈانوا ڈول ہو رہی تھی۔

"خدا کرے سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے۔" منظور الحق نے درخواست لکھ کر صفیہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ تو مسئلہ یہ ہے کہ شبانہ کی شادی کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ نہ صرف یہ کہ پیسہ نہیں ہے' بلکہ کوئی زمین' پلاٹ' پراپرٹی وغیرہ بھی نہیں ہے جس کو بیچ کر ہم یہ کام کر سکیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔ پھر شبانہ کی شادی کیسے ہو گی؟"

"ارے نہیں منظور صاحب!" اب صفیہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ "بھلا آپ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں؟ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہم لوگوں کی رقوم واپس مل جائیں گی۔"

اگلے دن وہ تنہا اتحاد موٹرز کے دفتر پہنچی' اس نے امینہ کو ساتھ نہیں لیا۔ اسے خواہ مخواہ پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تنہا بھی وہاں جا کر یہ سارا کام کر سکتی تھی۔

آج اسے وہاں کل سے بھی زیادہ رش نظر آیا اور یہاں دفتر کے پُرہجوم برآمدے میں' پہلی بار اس کی ملاقات بیگم جمیلہ عرفانی سے ہوئی۔

بیگم جمیلہ عرفانی ایک ادھیڑ عمر کی لیکن خوبصورت اور پُرکشش عورت تھی۔ اس عمر میں بھی اس کی دلآویز اور بھرپور شخصیت اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ وہ جوانی کے دنوں میں بہت خوبصورت رہی ہو گی۔ اس عمر میں بھی اس کے اندر ایک گہری جاذبیت تھی اور اس خوبصورت اور بے حد نفیس تراش خراش کے لباس میں' جسے وہ زیب تن کئے ہوئے تھی' وہ اس وقت پھولوں کی ایک لچکتی ہوئی ڈالی کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

بیگم جمیلہ عرفانی اور صفیہ' دونوں اسی کاؤنٹر پر ایک دوسرے کے آگے پیچھے موجود تھیں جہاں رقم کی واپسی کی درخواستیں لی جا رہی تھیں اور صفیہ اپنے قریب موجود اس عورت کو غور اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جس کے پیکر سے بھینی بھینی خوشبو نکل کر ساری فضا کو معطر کر رہی تھی۔

بعد میں بیگم جمیلہ عرفانی نے خود ہی صفیہ سے بات چیت کا آغاز کیا اور چند ہی منٹ میں دونوں ایک دوسرے سے گھل مل گئیں اور پھر وہ دونوں وہاں سے باہر جانے کے لئے

ساتھ ساتھ روانہ ہوئیں اور راستے میں ان میں آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنے نام بتائے۔

"میری کئی لاکھ روپے کی رقم یہاں جمع ہے۔" جمیلہ عرفانی نے صفیہ سے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا اب کیا ہو گا۔ ان لوگوں کی نیت مجھے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ کتنے ہی انویسٹ منٹ کمپنیوں والے تو رقم لے کر بھاگ گئے۔"

"لیکن یہ لوگ تو ایسے نہیں ہیں۔" صفیہ نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ' اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بڑے .... میرا مطلب ہے بڑے متقی اور پرہیزگار قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

جمیلہ عرفانی آہستہ سے مسکرائی اور صفیہ کو اس کی یہ مسکراہٹ بے حد دلکش اور خوبصورت لگی۔ "ہاں' آپ کہتی تو ٹھیک ہیں' خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ ہزاروں لوگوں کی زندگی بھر کی جمع پونجی ان کے پاس امانت ہے۔"

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئیں اور جمیلہ عرفانی نے صفیہ سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ صفیہ نے اسے بتایا کہ وہ صدر۔ کے علاقے میں ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔

"میں ڈیفنس میں رہتی ہوں۔" جمیلہ عرفانی نے کہا۔ "میں صدر کی طرف سے ہوتی ہوئی جاؤں گی۔ مجھے وہاں کچھ کام ہے۔ آپ میرے ساتھ بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں گی۔"

"تو کیا آپ .... گاڑی ہے آپ کے پاس؟" صفیہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" جمیلہ نے اسے بتایا۔ "میرے پاس گاڑی ہے جسے میں خود چلاتی ہوں۔"

"اوہ۔" صفیہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ خود گاڑی چلا لیتی ہیں اور وہ بھی اکیلی .... آپ کو گھبراہٹ نہیں ہوتی؟"

"عورت کو اپنے اوپر اعتماد کرنا سیکھنا چاہئے۔" جمیلہ عرفانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھلا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ اگر آدمی گاڑی چلاتے ہوئے نہیں گھبراتا تو عورت گاڑی چلاتے ہوئے کیوں گھبرائے؟"

صفیہ کو اس کی یہ بات بہت اچھی لگی اور اسے یہ عورت بھی بہت اچھی لگی' دلکش' اسمارٹ' پھرتیلی' خوبصورت' پُراعتماد' پُریقین اور ساتھ ہی نرم و لطیف مزاج کی حامل۔

اور جب اس نے جمیلہ عرفانی کی گاڑی دیکھی تو وہ اس سے بہت مرعوب ہو گئی۔ اگرچہ صفیہ گاڑیوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن اسے یہ تو بہرحال معلوم تھا کہ ہنڈا سوک بہت مہنگی گاڑی ہوتی ہے۔ جمیلہ عرفانی چابی ہاتھ میں لئے جس گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی وہ ایک نئی جگمگاتی ہوئی ہنڈا سوک تھی۔

راستے میں ان دونوں کے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں اور صفیہ نے محسوس کیا کہ جمیلہ عرفانی اس کے بارے میں جاننے کی خواہشمند ہے اور اس کے معاملات سے دلچسپی رکھتی ہے۔ کوئی بہت بڑے گھر کی عورت معلوم ہوتی ہے' صفیہ اس وقت کی صورتِ حال سے کافی پریشانی تھی اور شاید ہمدردی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے جمیلہ عرفانی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"مائی گاڈ!" جمیلہ عرفانی نے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔ "تم اس عمر میں بیوہ اور دو بچوں کی ماں۔ آج کل تو اس عمر میں پہنچ کر لڑکیاں شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کرتی ہیں اور تم........" جمیلہ اس سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی اور اب آپ کے بجائے تم کر کے اس سے بات کر رہی تھی۔ "یہ تو واقعی افسوس اور تشویش کی بات ہے اور اگر خدا نخواستہ یہ مولانا لوگ بھی مال سمیٹ کر بھاگ گئے تو پھر تم کیا کرو گی؟"

"نہیں نہیں۔" صفیہ نے بوکھلا کر کہا۔ "مولانا لوگ نہیں بھاگیں گے۔ وہ بھلا کیسے بھاگ سکتے ہیں؟ دین دار لوگ ہیں اور ہزاروں لوگوں کی رقوم ان کے پاس امانت ہیں۔ وہ امانت میں خیانت کیسے کر سکتے ہیں؟"

"پیسہ بڑی بھیانک قوت ہے صفیہ! اور ہوس کے طوفانوں کے آگے سارے اخلاقی ضوابط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔" جمیلہ عرفانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے غلط مت سمجھنا۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن محض کسی کا مذہبی ہونا اس کے ایماندار ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ جو سرمایہ کار کمپنیاں لوگوں کے اربوں روپے لے کر بھاگ گئیں' ان کے مالکوں میں سے بھی کتنے تھے جو حج کر چکے تھے' پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ مگر خلق خدا کا گوشت کھاتے رہے۔"

صفیہ کا سر چکرانے لگا اور وہ سخت بدحواس ہو گئی۔ یہ عورت کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ شاید........ لوگوں نے اتحاد موٹرز کے کارندوں کی برگزیدگی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی تھی۔

"خیر' اب تم مجھے اپنے گھر کا راستہ بتاتی جاؤ۔" جمیلہ عرفانی نے موضوع بدلتے

ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ دوسری باتیں کرنے لگی۔

جمیلہ عرفانی نے اپنے بارے میں قدرے اختصار سے یہ بتایا کہ وہ ایک طلاق یافتہ عورت اور دو بیٹیوں کی ماں ہے' جو دونوں اس وقت امریکہ کے کسی شہر میں تعلیم پا رہی ہیں اور وہیں رہتی ہیں' اس کے پاس ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں اپنا مکان ہے جہاں وہ تنہا رہتی ہے' وہ کسی ایکسپورٹ امپورٹ کی فرم میں پارٹنر ہے جہاں سے اسے بھاری منافع حاصل ہوتا ہے' اور اس طرح اس کی زندگی بڑے آرام سے بسر ہو رہی ہے۔

صفیہ کو اس پر بڑا رشک آیا۔ کاش خود اس کو بھی کوئی ایسا ہی موقع مل جاتا کہ وہ اپنی رقم کسی ایسی ہی فرم میں لگا سکتی۔

"کسی دن تمہیں لے چلوں گی میں اپنے گھر۔" جمیلہ نے صفیہ کی بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں تمہارا فلیٹ کون سی منزل پر واقع ہے اور اس کا نمبر کیا ہے؟"

"ارے' کیوں؟ کیا آپ اوپر نہیں آئیں گی؟" صفیہ نے کہا۔ "کم از کم ایک پیالی چائے تو پی کر جایئے۔"

"شکریہ' ابھی نہیں۔" جمیلہ عرفانی نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی مجھے ایک اور جگہ جانا ہے لیکن پھر آؤں گی' ضرور آؤں گی۔ تم سے ملاقات ہو گئی۔ بہت ہی خوشی ہوئی اللہ سچ' کتنی پیاری ہو تم۔ مجھے بہت اچھی لگی ہو اور ہاں' اپنے فلیٹ کا نمبر۔"

صفیہ نے اسے اپنے فلیٹ کا نمبر بتا دیا اور پھر وہ گاڑی سے اتر آئی۔ جمیلہ عرفانی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ صفیہ دور تک اس گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

کیسی سرسراتی ہوئی جا رہی تھی یہ نئی نویلی' بے حد خوبصورت' چمچماتی ہوئی گاڑی۔ جتنی خوبصورت گاڑی تھی اتنی ہی خوبصورت اس کو چلانے والی بھی تھی۔

اکیلی عورت' پُراعتماد' سمارٹ' چاق و چوبند گاڑی چلاتی ہوئی کتنی اچھی لگ رہی تھی۔

صفیہ کو افسوس تھا کہ وہ اوپر نہیں آئی۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی اور اس کے ساتھ بیٹھ کر کچھ دیر تک باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس سے باتیں کر کے بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن اسے کہیں جانے کی جلدی تھی لیکن اس نے جاتے جاتے صفیہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئے گی۔ "شاید وہ اپنا وعدہ پورا کرے۔ خیر مرضی ہے اس کی۔ اگر آتی ہے تو ٹھیک ہے۔"

دن پر دن گزرتے گئے اور مولانا عبدالحفیظ نے صورت نہیں دکھائی۔ امینہ اور صفیہ خود بھی ایک بار کمپنی کے دفتر جا چکی تھیں لیکن وہاں سے وہی جواب ملا تھا جو کافی دنوں سے مل رہا تھا .... اگلے مہینے .... بس اگلے مہینے .... اگلے مہینے پرافٹ ملے گا اور سارے بقایا جات کے ساتھ ملے گا .... اور جہاں تک رقم کی واپسی کا تعلق تھا تو اس کے لئے تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ چھ ماہ کی مدت درکار ہو گی۔

اس دن دوپہر کو صفیہ دونوں بچوں کو کھانا کھلا رہی تھی بچے ابھی کچھ دیر پہلے اسکول سے آئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ صفیہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور وہ خوشی کے مارے چیخ پڑی۔ دروازے پر بیگم جمیلہ عرفانی کھڑی ہوئی تھی۔

"میں اِدھر سے گزر رہی تھی۔" جمیلہ عرفانی نے کہا۔ "سوچا کہ تم سے بھی ملتی چلوں۔ حالانکہ یہ وقت بڑا نامناسب ہے۔ تم شاید آرام کر رہی تھیں۔"

"نہیں نہیں۔" صفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر بلاتے ہوئے کہا۔ "بچے ابھی کچھ دیر پہلے اسکول سے آئے تھے، میں انہیں کھانا کھلا رہی تھی۔ پلیز، آپ آیئے، اندر آیئے۔"

صفیہ، جمیلہ عرفانی کو اپنے گھر کے اندر لے آئی اور جمیلہ نے اس کے دونوں بچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماشاء اللہ، خدا نظر بد سے بچائے۔ کتنے پیارے بچے ہیں۔ کتنے خوبصورت اور اچھے۔"

صفیہ کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ یہ اس کے بچے تھے، اس کے وجود کا حصہ تھے، جن کی اتنی تعریفیں کی جا رہی تھیں وہ ماں تھی، ان پیارے پیارے اور حسین بچوں کی ماں جو اب اس کی زندگی کا واحد اثاثہ تھے۔

اس دن جمیلہ عرفانی کافی دیر تک اس کے گھر رہی اور اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئی۔ اس نے صفیہ سے اس کے تمام ذاتی حالات پوچھے اور اس کے خاندانی پس منظر میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

صفیہ کو بیوہ ہوئے تقریباً دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس کی بیوگی اپنی ماں کی بیوگی سے کافی مختلف تھی۔ عاصمہ کو تو اپنے شوہر کے مرتے ہی کولھو کے بیل کی طرح کام کرنا پڑا تھا اور ساری دنیا کا عیش و آرام تج کر ان تین جانوں کی پرورش کا بندوبست کرنا پڑا تھا جو مرنے والا اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا جبکہ پاس پلے میں کچھ نہیں تھا لیکن صفیہ اس لحاظ سے زیادہ بہتر پوزیشن میں تھی کہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اس کے پاس اچھی خاصی رقم

موجود تھی اور وہ اس رقم کو اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی میں جمع کروانے کے بعد فکرِ معاش سے ایک دم آزاد ہو گئی تھی۔ اسے نوکری کرنے اور محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور اس کے اخراجات بڑی عمدگی کے ساتھ پورے ہو جاتے تھے۔ چنانچہ زندگی کا معاشی پہلو تو پوری طرح اطمینان بخش تھا۔

راتوں کو اس کے دل و دماغ میں سناٹے گونجتے تھے۔ غیظ و غضب میں بپھرے ہوئے طوفان اس پر حملہ آور ہوتے تھے، خواہشات کی تند و تیز آندھیاں اسے اپنے ساتھ اڑا لے جانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن صفیہ نے ضبط نفس کا سبق سب سے پہلے تو اپنی ماں سے سیکھا تھا اور وہ اسی پر کاربند تھی۔ اگر بچوں کو خوش رکھنا تھا، ان کی تقدیر کو بنانا تھا تو پھر اپنے آپ کو اسی طرح مٹانا ہو گا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا اور صفیہ اپنے آپ کو ملیامیٹ کرنے پر آمادہ تھی جس طرح اس کی ماں نے اپنے آپ کو ملیامیٹ کیا تھا۔

جمیلہ عرفانی اس روز اس سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی تھی اور صفیہ کو اس کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ بڑی دوٹوک اور کھری بات کہنے والی عورت معلوم ہوتی تھی لیکن ساتھ ہی بہت دھیمی اور نرم طبیعت کی تھی۔

اس دن جمیلہ عرفانی نے صفیہ کو بتایا تھا کہ اسے نہایت معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے بیسیوں لوگوں نے، جن کے کروڑوں روپے اتحاد موٹرز میں جمع تھے، اپنی رقمیں زبردستی واپس لے لی ہیں اور اس کے علاوہ یہ لوگ کمپنی کے دفتر سے لاکھوں روپے کی گاڑیاں بھی اٹھا لے گئے ہیں۔

"لیکن یہ تو سراسر دھاندلی ہے۔" صفیہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ "اگر دوسرے، عام لوگوں کی رقوم واپس نہیں ہو رہی ہیں تو پھر ان لوگوں کو رقوم کس طرح واپس مل گئیں؟"

"اس لئے کہ وہ قانون نافذ کرنے والے لوگ ہیں۔" جمیلہ نے ایک زہرخند کے ساتھ جواب دیا۔ "وہ خود قانون کے تابع نہیں ہوتے۔"

جملہ عرفانی کافی دیر اس کے ساتھ رہی اور پھر اس وعدے کے ساتھ چلی گئی کہ کسی دن دوبارہ آئے گی اور پھر کسی دن صفیہ کو اپنے ساتھ اپنے گھر بھی لے جائے گی۔

اور پھر دن گزرتے رہے۔ اتحاد موٹرز والوں کا معاملہ جوں کا توں تھا۔ انہوں نے اب تک کوئی منافع نہیں دیا تھا۔ مولانا عبدالحفیظ کی صورت بھی نظر نہیں آئی تھی۔

کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا اور مولانا عبدالحفیظ کا چہرۂ پُرنور دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ بالکل

ہی غائب ہو گئے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ ان کا انتظار کرتے کرتے صفیہ کی آنکھیں پتھرانے لگی تھیں۔

اور اب ایک اور مسئلہ پیدا ہو رہا تھا۔ اب تک تو صفیہ کسی نہ کسی طرح گھر کی گاڑی کو کھینچتی رہی تھی لیکن اب معاملہ ذرا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ گھر میں جو بھی موجود پیسے تھے' وہ ختم ہو رہے تھے اور اگر بینک میں جمع رقم میں سے پیسے نکالنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو پھر بہت جلد معاملہ ہی ختم ہو جاتا' کیونکہ بینک میں تو معمولی سی رقم جمع تھی۔ اصل رقم تو ساری کی ساری اتحاد موٹرز والوں کے پاس جمع تھی۔

اس دن امینہ اس کے پاس آئی تو وہ حد سے زیادہ پریشان تھی۔ امینہ کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور اس کے چہرے پر جیسے موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ نہ جانے کون سی اس قدر بری خبر تھی اس کے پاس۔

اور پھر جو کچھ امینہ نے اس کو بتایا' اس کو سن کر صفیہ کے ہوش اڑ گئے۔

امینہ نے بتایا کہ ڈاکٹروں نے اس کے شوہر عبدالرحمٰن کو گلے کا کینسر بتایا ہے اور فوری طور پر آپریشن کا مشورہ دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر فوراً ہی آپریشن نہ کیا گیا تو کینسر پورے بدن میں پھیل جائے گا اور مریض کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ آپریشن کے لئے بھاری رقم درکار تھی۔

"رحمٰن بھائی کا آپریشن تو بروقت ہونا ہی چاہئے۔" صفیہ نے سہم کر کہا۔ "خدا نہ کرے' کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔ خدا ان کا سایہ ان کے بچوں کے سر پر سلامت رکھے۔ ہم ایسا کرتے ہیں امینہ! ہم دونوں کل کمپنی کے دفتر چلتے ہیں اور وہاں کسی ذمہ داری آدمی سے مل کر بات کریں گے۔ اسے یہ صورتِ حال بتائیں گے اور درخواست کریں گے کہ تمہاری رقم پہلے واپس کر دی جائے۔ وہ خدا ترس لوگ ہیں' شاید بات مان لیں۔"

"ہاں' ایک بار کوشش کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔" امینہ نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "بس خدا سے دعا کرو صفیہ رحمٰن ٹھیک ہو جائیں۔ مجھے تو ان کی طرف سے بہت زیادہ پریشانی ہے۔ ان کے بغیر ہم کیا کریں گے؟"

"اللہ اپنا رحم کرے گا امینہ!" صفیہ نے کہا۔ "سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی رہے گا۔"

اگلے دن تو نہیں' البتہ اس سے اگلے دن صفیہ اور امینہ اتحاد موٹرز کے دفتر پہنچیں اور وہاں انہوں نے ایک انتہائی حیرت انگیز ناقابلِ یقین' دل شکن اور ہولناک منظر دیکھا۔ بڑی دیر تک تو انہیں اس بات پر یقین ہی نہیں آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہیں' وہ صحیح ہے۔

کمپنی کے دفتر میں تالے لگے ہوئے تھے۔ سارے دروازے بند تھے۔ ساری گاڑیاں اور دیگر ساز و سامان غائب تھا۔ دفتر خالی تھا۔

اور خالی دفتر کے آگے سینکڑوں نہیں' ہزاروں لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ سب لوگوں کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ مولانا لوگ بھاگ گئے .... سارے مولانے بھاگ گئے .... پیسے لے کر بھاگ گئے۔

صفیہ نے اس ادھیڑ عمر کی عورت کو دیکھا جو بند دروازوں کے آہنی شٹر پر سر رکھے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ کوئی برقع پوش اور سیدھی سادی سی عورت معلوم ہوتی تھی۔ نہ جانے اس کی کتنی رقم تھی اور اس نے کس مقصد کے لئے رکھی تھی۔ صفیہ نے اس بالکل سفید بالوں والے بوڑھے کو دیکھا جس کی گدلی گدلی آنکھوں میں جیسے ساری کائنات کا کرب سمٹ آیا تھا اور اس کے چہرے پر ویرانیاں برس رہی تھیں۔ وہ ایک جانب کھڑا ہوا خالی خالی نظروں سے دروازے کے بند شٹر کو دیکھ رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ یہ واقعہ تو دو دن پہلے رونما ہو چکا تھا اور مولانا لوگ دفتر بند کر کے غائب ہو گئے تھے۔ کمپنی کے تمام ڈائریکٹران روپوش ہو گئے تھے اور پولیس ان کو تلاش کر رہی تھی کیونکہ ان کے خلاف متعلقہ تھانے میں فراڈ اور غبن کے الزامات کے تحت کئی مقدمات درج کرائے جا چکے تھے اور پولیس اپنی تگ و دو کے باوجود انہیں تلاش نہیں کر سکی تھی' کیونکہ وہ لوگ اپنے گھروں پر موجود نہیں تھے اور ان کے گھر والوں نے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

"اگر کسی عام شہری کو گرفتار کرنا مقصود ہوتا ہے تو پولیس والے اس کے گھر پر چھاپہ مار کر اس کی ماں' بہن' بیوی' بچہ' باپ' بھائی جو بھی ہاتھ لگے اسے اٹھا کر تھانے لے آتے ہیں اور اسے وہاں اس وقت تک بٹھائے رہتے ہیں جب تک کہ وہ شخص نہ مل جائے اور یہاں .... یہ اربوں روپیہ لے کر بھاگ جانے والے شیطان' ان کی گرفتاری کے لئے پولیس کچھ نہیں کرتی؟" ایک آدمی غیظ و غضب کے عالم میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی ناک سے اور اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور اس پر جیسے ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ وہ بے تحاشہ چیخے جا رہا تھا اور پھر اس نے نیم دیوانگی کے سے عالم میں مولاناؤں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

صفیہ پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہو گئے تھے۔ جس بات پر یقین کرنے کو اس کا کبھی بھی جی نہیں چاہا تھا' آج وہی بات سچ ہو کر سامنے آ گئی تھی۔ دیگر تمام انویسٹ منٹ کمپنیوں کی طرح اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی کے مالک بھی مال سمیٹ کر بھاگ گئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہوں نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ وقت لیا تھا اور دوسروں سے کہیں زیادہ پیسہ جمع کیا تھا نیز اپنے آپ کو مذہبی اور دیندار ظاہر کر کے لوگوں کے مذہبی جذبات و احساسات کا بھرپور استحصال کیا تھا۔

امینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور سخت متوحش اور سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔ ان دونوں نے وہاں موجود بہت سے لوگوں سے اس بارے میں پوچھا اور انہیں صرف یہی معلوم ہو سکا کہ دو دن پہلے مولانا لوگ دفتر بند کر کے بھاگ گئے ہیں اور کسی کو ان کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

"چلو امینہ!" صفیہ نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ "اب واپس گھر چلتے ہیں۔ یہاں دھوپ میں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ ہے' کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

اور امینہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اب تک کسی نہ کسی طرح اپنے آنسوؤں کو ضبط کئے ہوئے تھی مگر اب ایک دم سے اس کی آنکھوں سے سیلاب اُمڈ پڑا اور یہاں اس عظیم الشان عمارت کے سامنے' اس عالی مرتبت کمپنی کے دفتر کے سامنے جس کی باگ ڈور متقی' پرہیزگار' فرشتہ سیرت اور پابند شریعت لوگوں کے ہاتھ میں تھی' اپنی زندگی بھر کی کمائی سے محروم ہو کر رونے والی تنہا امینہ نہیں تھی۔ وہاں موجود جتنے بھی لوگ تھے' جن کی تعداد ہزاروں تھی' وہ اب رو رہے تھے' گو کہ آنسو تو کم ہی آنکھوں میں تھے' لیکن سب کے دل خون رو رہے تھے۔ سب اندر ہی اندر رو رہے تھے۔

وہ دونوں دکھ کی ماری عورتیں' حیران و پریشان شکستہ و ریختہ اپنے گھروں کو واپس آئیں اور غم و آلام کے بیکراں سمندروں میں غوطے کھانے لگیں۔ دونوں اپنی اپنی ساری جمع پونجی سے محروم ہو چکی تھیں۔

وہ دونوں صفیہ کے گھر میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں' بالکل خاموش' ایک دوسرے کے آمنے سامنے' چپ بیٹھی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے پاس ایک دوسرے سے کہنے سننے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

اور پھر کچھ دیر کے بعد دونوں بیک وقت بولنے لگیں اور پھر ان کی باتوں میں قدرے اعتدال آ گیا۔

"شاید .... شاید ان لوگوں سے رقم کی واپسی کی کوئی سبیل نکل آئے۔" امینہ نے دھیرے سے کہا۔ "آخر ملک میں حکومت ہے' قانون ہے' اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگوں کا روپیہ ہے مولاناؤں کے پاس' ایسے کیسے بھاگ جائیں گے؟"

"اللہ ہی جانے اب کیا ہو گا۔" صفیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔ رحمٰن بھائی کے آپریشن کے لئے فوری طور پر کچھ بندوبست شروع کرو۔ میرے پاس کچھ زیورات ہیں' چاہو تو لے لینا۔"

"نہیں۔" امینہ نے کہا۔ "اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ تم اپنا زیور مت بیچو۔ زیور ایک بار بک جائے تو پھر دوبارہ بنوانا بڑا دشوار ہوتا ہے اور پھر' بیچنے کی صورت میں زیور کے دام ہمیشہ بہت کم ملتے ہیں۔"

امینہ کے چلے جانے کے بعد صفیہ نے اپنی موجودہ صورت حال پر یکسوئی کے ساتھ غور کیا تو اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ بچوں کو تو ابھی ایک لمبے عرصے تک پڑھنا تھا۔ انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی تھی اور اخراجات میں مسلسل اضافہ ہونا تھا لیکن یہاں تو آمدنی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ آخر گھر کیسے چلے گا؟ پیسے کہاں سے آئیں گے؟............

کیا پھر وہی مشین .... وہی پہیہ .... وہی جبری مشقت؟ نہیں نہیں۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔ نہیں' وہ منحوس مشین نہیں اب دوبارہ ہمت نہیں۔ تو پھر کیا؟ پھر کیا؟ معلوم نہیں۔ معلوم نہیں.........

اس کے آگے اندھیروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اور وہ ان گھور اندھیروں میں اِدھر اُدھر امید کا کوئی ننھا سا جگنو تلاش کر رہی تھی' اس جگنو کی تلاش میں اگلے دن وہ امینہ کو ساتھ لے کر منظور الحق کے گھر گئی۔ وہ دونوں شام کو منظور الحق کے گھر گئی تھیں اور صفیہ کو امید تھی کہ منظور الحق اسے گھر پر ہی مل جائے گا اور شاید اس سے مولاناؤں کے بارے میں کوئی نئی اور مستند باتیں معلوم ہو سکیں۔

لیکن جب وہ دونوں منظور الحق کے گھر پہنچیں تو منظور الحق انہیں گھر پر نہیں ملا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ گزشتہ روز منظور الحق کا سوئم ہو چکا تھا۔ چار دن پہلے منظور الحق کی موت واقع ہو گئی تھی۔

اس کی زار و قطار روتی ہوئی بیوی اور بیٹی نے صفیہ کو یہ بتایا کہ آج سے چار دن پہلے منظور الحق اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا۔ دفتر کا ہی ایک آدمی اتحاد موٹرز کے

دفتر گیا ہوا تھا کہ نئی صورتِ حال کا کچھ اندازہ لگا سکے۔ اس شخص کی اپنی بھی اچھی خاصی رقم وہاں جمع تھی۔ اس نے وہاں سے واپس آ کر منظور الحق کو اور دوسرے لوگوں کو یہ وحشت ناک اطلاع دی کہ مولانا لوگ دفتر میں تالہ لگا کر اور سارا مال سمیٹ کر بھاگ گئے ہیں اور پولیس ان کی تلاش میں ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی منظور الحق کی حالت غیر ہو گئی۔ اسے اس سے پہلے دل کو کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ کبھی دل کا دورہ وغیرہ پڑا تھا لیکن اس دن اس پر دل کا شدید دورہ پڑا اور یہ اس کی زندگی کا پہلا اور آخری دورہ تھا۔ اس نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے دم توڑ دیا۔

"خدا ان چوٹوں کو ڈھائی گھڑی کی موت دے۔" منظور الحق کی بیوی رو رو کر کہہ رہی تھی۔ "ارے ڈاکو بھی اگر ڈاکہ ڈالتے ہیں تو گھر دیکھ کر ڈالتے ہیں۔ وہ بھی وہیں ہاتھ مارتے ہیں جہاں سے انہیں زیادہ سے زیادہ مال ملنے کی امید ہوتی ہے۔ یہ منحوس تو ہزاروں غریبوں کو لوٹ کر لے گئے۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس میں کتنے یتیموں، بیواؤں، ضرورت مندوں اور غریب اور محتاج لوگوں کا مال ہے.......... ارے .... خدا ان کو غارت کرے .... خدا کرے ان کے جسموں سے کوڑھ پھوٹے، راس نہ آئے انہیں سارا لوٹ کا مال ظالم، لٹیرے .... کھا گئے، سب کھا گئے۔"

منظور الحق کی بیوی بین کر کر کے رو رہی تھی اور صفیہ بت بنی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے تو آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ منظور الحق ہی تو وہ آدمی تھا جس کے ایما پر اس نے اتحاد موٹرز عرف ڈی کے افراہیم کمپنی میں رقم جمع کرائی تھی۔ اس نے اسے ان لوگوں کے معتبر اور قابلِ اعتماد ہونے کا یقین دلایا تھا اور خود صفیہ کا اپنا تجربہ بھی یہی تھا۔ اور اب .... خود منظور الحق .... وہ صدمے سے اس قدر بے حال ہوا کہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور خاموشی سے مر گیا۔

تقریباً پندرہ دن کے بعد امینہ کے شوہر کا آپریشن ہوا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس نے تو آپریشن ٹیبل پر ہی دم توڑ دیا اور یوں امینہ بھی بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ وہ عمر میں صفیہ سے ایک آدھ سال سے زیادہ نہیں تھی اور اس کے بھی دو چھوٹے بچے تھے۔

صفیہ نے امینہ کو دھاڑیں مار مار کر، بلک بلک کر روتے دیکھا۔ اس نے اسے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے دیکھا اور اسے اپنا وقت یاد آ گیا۔ ہاں آج سے تقریباً دو سال پہلے اس کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا تھا اور اس کے بعد مہینوں تک اسے ساری دنیا

کس قدر خالی خالی نظر آتی رہی تھی اور اگر دونوں بچوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو خدا جانے وہ کیا کرتی۔ شاید کوئی ترک دنیا کی، گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لیتی لیکن بچوں نے اس کے ہاتھوں پیروں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔

وہ امینہ کے دلی محسوسات کو بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ عورت کے لئے بیوہ ہو جانا زندگی کا سب سے زیادہ خوفناک صدمہ ہوتا ہے مگر اسے بھی برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ دنیا میں "ناقابلِ برداشت" کوئی چیز نہیں ہوتی۔ انسان کے سر پر جو کچھ آتا ہے، اسے برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے .... کسی طرح بھی کیا جائے۔

رحمٰن کی موت کے بعد امینہ کے حالات بھی ایک دم بہت خراب ہو گئے۔ رحمٰن گھر کا واحد کمانے والا تھا جو کچھ جمع جتھا تھا، وہ تو مولانا لوگ لے کر بھاگ گئے تھے اور جو تھوڑا بہت گھر میں تھا، اس سے کام چل رہا تھا۔ مگر عبدالرحمٰن کے علاج اور آپریشن کے لئے کافی رقم اِدھر اُدھر سے قرض لینی پڑی۔ اس کی وجہ سے حالات اور زیادہ خراب ہو گئے۔

"میری تو اب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔" رحمٰن کی موت کے بعد امینہ نے صفیہ سے کہا۔ "کوئی پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں کہ کہیں اچھی نوکری کر لوں۔ بس زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ محنت مزدوری کے کچھ کام کر لوں۔ کسی فیکٹری وغیرہ میں نوکری کر لوں .... اور کیا کر سکتی ہوں؟"

"اور میں بھی .... میں بھی امینہ! .... میں بھی کیا کروں گی؟ وہ فرشتے تو ہمارا، تمہارا اور ہزاروں لوگوں کا مال جمع کر کے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئے اور زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کے دکھ جھیلنے کے لئے رہ گئے ہم لوگ جنہیں ان فرشتوں نے ان کی زندگی بھر کی کمائی سے محروم کر دیا۔ میرے سامنے بھی اب یہی سوال ہے جو تمہارے سامنے ہے۔ ہم دونوں کے حالات تو تقریباً یکساں ہیں۔"

"جانتی ہو؟" امینہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ سے پُراسرار لہجے میں کہا۔ "میں تو دوسری شادی کر لیتی۔ مجھ سے تنہائی کا یہ عذاب نہیں بھگتا جاتا۔ اکیلی عورت کی کیسی کیسی مجبوریاں اور محتاجیاں ہوتی ہیں لیکن کیا کروں۔ میں بچوں کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ اگر ان کے سوتیلے باپ نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تو پھر یہ کہاں جائیں گے؟ ان کا تو اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"مشکل تو یہی ہے امینہ کہ بچے بھی عورت کی مجبوری ہوتے ہیں۔ مرد کی مجبوری نہیں ہوتے۔" صفیہ نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "معدودے چند مرد ایسے

ہوتے ہیں جو دوسری شادی سے پہلے اپنے بچوں کے بارے میں بھی سوچتے ہیں ورنہ کون پرواہ کرتا ہے۔ یہ تو ماں ہی ہوتی ہے جو اولاد کو سینے سے لگا کر رکھتی ہے اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتی۔"

کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اسی دوران بڑے بڑے تماشے ہوتے رہے۔ ایکشن کمیٹی بنی، جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے، حکام اور افسران کو یادداشتیں پیش کی گئیں، اخباروں کے دفاتر کے سامنے مظاہرے کئے گئے اور اس ساری جدوجہد میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد شامل رہی۔ صفیہ اور امینہ بھی اس میں شریک تھیں۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے .... خود فریبی کے سہارے .... وہ اس بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھیں جس کا کوئی مثبت انجام انہیں نظر نہیں آ رہا تھا، کیونکہ اتحاد موٹرز سے پہلے جو سینکڑوں سرمایہ کار کمپنیاں لوگوں کے پیسے لے کر بھاگ گئی تھیں ان کے خلاف بھی تو کچھ نہیں ہو سکا۔ پبلک سے لوٹی ہوئی اربوں روپے کی رقم میں سے ایک پائی بھی واپس نہیں دی جا سکی تھی۔ البتہ لوگوں کو طفل تسلیاں دینے کی غرض سے اسٹیٹ بینک یا ایف آئی اے وغیرہ کے حوالے سے ایک آدھ بیان اخبارات میں شائع ہو جاتا تھا اور بس۔ مزید یہ ہوا تھا کہ پولیس نے کمپنی کے دفتر کی عمارت کو سیل کر دیا تھا اور اس کے علاوہ اتحاد موٹرز کے بعض دوسرے ذیلی اداروں کے دفاتر اور پراپرٹی وغیرہ کو بھی سیل کر دیا تھا۔ کیونکہ پولیس میں اتحاد موٹرز کے خلاف فراڈ، غبن، بددیانتی، فریب دہی وغیرہ کے متعدد مقدمات درج تھے۔

صفیہ کے دماغ میں ہر وقت لاوا پکتا رہتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ جو تھوڑے بہت پیسے رکھے ہوئے تھے وہ خرچ ہو رہے تھے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تو تھوڑے سے پیسوں کی بات تھی۔ وہ اب کیا کرے؟ زیور، سامان اور چیزیں وغیرہ فروخت کر کے تو کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس طرح حاصل ہونے والی رقم کب تک چلتی؟ آخر ایک وقت آتا کہ وہ ختم ہو جاتی، پھر کیا ہوتا؟

زندگی گزارنے کے لئے آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ضروری تھا اور دو بچوں کے ساتھ جو ایک بہت اچھے اور مہنگے اسکول میں تعلیم بھی پا رہے تھے، ایک خاصی معقول آمدنی کی ضرورت تھی، وہ کہاں سے آئے گی؟

اس دن صبح ہی صبح جمیلہ عرفانی صفیہ کے گھر آ گئی۔

اپنی موجودہ زبردست مصیبت میں پھنسنے کے بعد صفیہ نے جمیلہ عرفانی کو تو جیسے

گزرتی ہوئی بالآخر ایک شاندار دو منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ کیا زبردست اور خوبصورت عمارت تھی، بالکل کسی قلعے کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ چہاردیواری اتنی اونچی تھی کہ اندر کا کچھ نظر نہیں آتا تھا اور گیٹ، جو بہت اونچا تھا، اندر سے بند تھا۔ مکان سے ملحق سڑک اور سامنے والی سڑک پر بہت سی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔

جمیلہ نے آہستہ سے ایک بار ہارن بجایا اور اس کے تقریباً فوراً ہی بعد گیٹ کھول دیا گیا اور جمیلہ اپنی کار لئے ہوئے اندر چلی گئی۔

دروازہ کھولنے والا ایک باوردی محافظ تھا جس کے کندھے پر ایک رائفل لٹک رہی تھی۔ جمیلہ عمارت کے اندر داخل ہوئی تو صفیہ نے دیکھا کہ اس عمارت کا کمپاؤنڈ بہت بڑا تھا لیکن وہاں کوئی لان وغیرہ نہیں رہا تھا۔ صرف دیوار کے ساتھ ساتھ کیاریاں تھیں اور باقی ساری جگہ پختہ تھی اور اس پختہ جگہ میں بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

مسلح چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا اور جمیلہ، صفیہ کو اپنی گاڑی میں بٹھائے ہوئے کمپاؤنڈ میں سے گزرتی ہوئی سیدھی مکان کے عقبی حصے میں چلی گئی۔

صفیہ کو اس بات پر تھوڑا سا تعجب ضرور ہوا۔ یہاں اتنے بڑے محل جیسے مکان کے کمپاؤنڈ میں کوئی لان نہیں لگایا گیا تھا۔ جبکہ عام طور پر ایسی کوٹھیوں میں لان تو ضرور ہوتا ہے اور لان کی بجائے جو پختہ جگہ تھی، وہاں بہت سی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ "اتنی بہت سی گاڑیاں اس گھر کے مکینوں کی تو نہیں ہو سکتیں۔" صفیہ نے دل میں سوچا۔ "ضرور بہت سارے مہمان آئے ہوں گے۔"

اور اسے اس بات پر بھی تعجب ہو رہا تھا کہ جمیلہ نے گاڑی مکان کے سامنے والے حصے میں نہیں روکی تھی، بلکہ وہ اسے مکان کے عقبی حصے میں لے آئی تھی اور یہاں لا کر اس نے گاڑی روک لی۔ اس کا انجن بند کر دیا اور نیچے اتر آئی۔ صفیہ بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ مکان کے اس عقبی حصے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جمیلہ صفیہ کو ساتھ لئے ہوئے ایک عقبی برآمدے میں داخل ہوئی جہاں سے اندر جانے کے لئے لکڑی کا ایک بہت بھاری بھرکم لیکن بے حد نفیس اور خوبصورت دروازہ تھا، جمیلہ نے اس دروازے کو کھولا اور وہ دونوں ایک عقبی ہال میں داخل ہو گئیں جس کے ایک جانب اوپر جانے کے لئے پتلا سا زینہ بنا ہوا تھا۔ یہاں زینے کے قریب دو لڑکیاں کھڑی ہوئی آپس میں کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ دونوں بہت خوبصورت اور اسمارٹ نظر آ رہی تھیں اور ان کا لباس بھی بہت اعلیٰ درجے کا اور جدید ترین فیشن کے عین مطابق تھا۔ ان دونوں لڑکیوں نے جمیلہ کو

دیکھا اور اس کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو اور وہ دونوں ٹھٹک کر رہ گئیں۔

"میری مہمان ہیں۔" جمیلہ نے ان دونوں کی حیرت کو بھانپتے ہوئے مسکرا کر ان کو اطلاع دی۔ "بہت عزیز اور معزز مہمان۔" اس پر ان دونوں لڑکیوں نے مسکرا کر صفیہ کو سلام کیا اور صفیہ نے خود بھی بڑی خوش دلی کے ساتھ مسکراتے ہوئے ان کے سلام کا جواب دیا۔ اسے یہ اسمارٹ اور خوبصورت لڑکیاں بہت اچھی لگیں اور اسے تو اس گھر کی فضا ہی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کمرے کے اندر گھستے ہی ہلکی ہلکی مہک کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہاں شاید کسی خوشبو کا برابر اسپرے کیا جاتا رہا تھا جس ہال میں صفیہ نے اپنے آپ کو پایا' اس کے فرش پر اتنا موٹا قالین بچھا ہوا تھا کہ اس میں پیر دھنسے جاتے تھے اور یہاں کا سارا ساز و سامان بہت قیمتی اور اعلیٰ درجے کا تھا۔"

"یہ ہوتا ہے مکان.........." اس نے دل ہی دل میں کہا اور خاموشی سے اس مکان کا موازنہ اپنے چھوٹے سے فلیٹ سے کرنے لگی جو اس وسیع و عریض کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کونے میں سما سکتا تھا۔

جمیلہ' صفیہ کو ساتھ لئے ہوئے اوپر آ گئی' زینے کی آخری سیڑھیوں کے قریب ایک عورت نظر آئی' عمر رسیدہ' بہت اچھے اور معقول کپڑوں میں ملبوس اور شائستہ اطوار' اس نے صفیہ کو دیکھتے ہی بڑے ادب سے اسے خود ہی سلام کیا۔ حالانکہ وہ تو جمیلہ کی ماں کے برابر ہو گی۔ صفیہ نے جلدی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"بہت اچھی سی چائے بنا کر میرے کمرے میں آؤ بشیراں۔" جمیلہ نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا اور تب صفیہ کو معلوم ہوا کہ وہ نوکرانی تھی لیکن کیا ٹھاٹھ باٹ تھے اس عورت کے۔ کسی طرف سے نوکرانی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ "آخر بڑے گھر کی نوکرانی ہے۔" اس نے دل میں کہا۔ "ظاہر ہے' کوئی پھٹیچر تو نہیں ہو سکتی۔"

جمیلہ اسے جس کمرے میں لے گئی اس کی آرائش دیکھ کر تو صفیہ اور بھی حیران ہو گئی۔ کیا شاندار بیڈ روم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جدید وضع کی جنت کا ایک ٹکڑا ہو جس میں جدید سامان تعیش کی بھرمار تھی۔ کمرے میں ایک بیس انچ کا ٹی وی اور وی سی آر بھی موجود تھا' اس کے علاوہ اور بھی جو کچھ تھا' وہ بہت ہی نفیس اور قیمتی تھا۔

"بیٹھو جانِ من!" جمیلہ نے خود کو ایک خوبصورت صوفے پر گراتے ہوئے کہا جو اس وسیع کمرے میں ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ "تو یہ ہے میرا کمرہ' کیسا لگا تمہیں؟"

"بہت عمدہ جمیلہ آپا!" صفیہ نے جیسے خواب سے بیدار ہو کر کہا' وہ اس سارے

ماحول سے مرعوب و مسحور ہو رہی تھی۔ گھر اتنے خوبصورت بھی ہو سکتے ہیں' کمرے ایسے شاندار بھی ہو سکتے ہیں' سامان عیش و راحت اس قدر وافر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا صفیہ کو اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا کیونکہ اس نے اس سے پہلے ایسے کسی گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ جلدی سے ایک صوفے میں دھنس گئی اور چاروں طرف نظریں دوڑا دوڑا کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

"آپ کی کوٹھی واقعی بہت شاندار ہے جمیلہ آپا! آپ کے کمرے کا تو کیا کہنا۔"

"اور جانتی ہو' میں اس سب کی بلاشرکت غیرے مالک ہوں۔" اس نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ سب کچھ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ یہ کسی دوسرے کی دین نہیں ہے۔"

"اچھا!" صفیہ نے تعجب سے کہا۔ "آپ نے اکیلے' میرا مطلب ہے .... آپ کے شوہر.........."

"میرا شوہر؟" جمیلہ نے ایک زہرخند کے ساتھ کہا۔ "اس کو تو میں نے آج سے برسوں پہلے جوتے مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ معلوم نہیں حرامی کا پلا زندہ بھی ہے یا کہیں مر کھپ گیا۔ جانے سالے کو مرتے وقت کفن بھی نصیب ہوا ہو گا یا کسی گٹر یا نالے میں گر کر مر گیا ہو گا۔ سؤر کا بچہ۔"

صفیہ دم بخود رہ گئی۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ الفاظ جمیلہ آپا کے منہ سے نکل رہے ہیں۔ نہیں' یہ تو کوئی اور شخص تھا۔ بھلا جمیلہ آپا اور ایسی زبان استعمال کریں۔ ان جیسی شائستہ اور مہذب خاتون کی زبان سے ایسے الفاظ اور وہ بھی اپنے شوہر کے لئے۔

"جمیلہ آپا! آپ کے شوہر .... میرا مطلب ہے' آپ لوگوں کے تعلقات شاید.........."

"ہمارے درمیان کبھی بھی انسانوں جیسے تعلقات نہیں رہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "شادی تو بہت کم عمری میں ہو گئی تھی اور میں اس وقت بہت خوبصورت تھی۔ اس حرامزادے .... کتے کے پلے نے مجھ کو جسم فروشی کے دھندے پر لگا دیا۔ تم یقین کرو گی میری جان' شادی کے تیسرے دن .... قسم اللہ پاک کی' شادی کے تیسرے دن سے اس نے مجھے جسم فروشی کے دھندے پر لگا دیا۔ وہ ایک حرام خور' نکھٹو اور بے غیرت شرابی تھا' نشہ باز' اسے ہر وقت نشے کے لئے رقم چاہئے ہوتی تھی اور اس نے میرے جسم کو روپیہ کمانے والی ایک مشین کی صورت دے دی۔ میں تو اس وقت بہت سیدھی سادی'

بھولی اور نادان تھی۔ فوری طور پر کچھ سمجھ ہی نہیں سکی۔ مگر جب میں نے سب کچھ سمجھ لیا تو پھر جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جانتی ہو میں نے کیا کیا؟ میں نے کچھ کرائے کے بدمعاشوں سے یارانہ گانٹھا اور اس بھڑوے کو خوب پٹوایا۔ اس کی اچھی طرح جوتے کاری کرنے کے بعد میں نے اس کو گھر سے نکال دیا اور ساتھ ہی خبردار کیا کہ اگر اس نے آئندہ اِدھر قدم رکھا تو اس کو جان سے مار دیا جائے گا۔ کرائے کے بدمعاشوں نے بھی اسے یہ بات عملی طور پر اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب اس خبیث دیوث کی ناپاک حرکتوں کے نتیجے میں اپنا سب کچھ کھو ہی چکی ہوں تو پھر اب یوں ہی سہی۔ مگر اس لعنت کے مارے کو میں کیوں پیسہ دوں۔ جو کچھ کماؤں گی' اپنے لئے کماؤں گی اور تب میں رنڈی بن گئی۔ مجھے اچھے اچھے الفاظ استعمال کر کے حقیقت کو چھپانے کا شوق نہیں ہے۔ ہاں میں رنڈی ہوں اور تم جس عالیشان کوٹھی میں بیٹھی ہو' یہ ایک ماڈرن چکلہ ہے .... رنڈی خانہ.........."

"میں .... جا رہی ہوں۔" صفیہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اس کی ٹانگیں بُری طرح کانپ رہی تھیں' دماغ میں سناٹے گونج رہے تھے اور جسم سے جیسے آگ کی لپٹیں نکلنے لگی تھیں۔ "اف خدایا......... یہ وہ کہاں آن پھنسی تھی۔"

صفیہ ایک سیدھی سادی گھریلو قسم کی لڑکی تھی جس کی اب تک کی ساری زندگی خاندان' گھر اور ایک معمولی سی نوکری کے محور کے گرد گھومتی رہی تھی۔ اس نے آج تک کسی "رنڈی" کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کے ذہن میں اس کا جو تصور تھا' وہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں تھا جیسی کہ جمیلہ تھی۔ وہ تو بہت گھناؤنا تھا۔ مکروہ' بدصورت اور غلیظ تصور تھا۔ سر تا سر گندگی میں لتھڑی ہوئی ایک قابلِ نفرت عورت۔ دو ٹکے کے عوض اپنا جسم بیچنے والی بے غیرت' بے حیا' گنہگار' جہنم کا ایندھن' دنیا میں بھی رسوا اور آخرت میں بھی ذلیل آخ تھو۔

لیکن جمیلہ آپا......... جمیلہ .... وہ تو کسی طرف سے بھی ایسی نہیں لگتی تھیں۔ اس کم بخت سے تو نفرت کرنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ' میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گی۔ جس طرح عزت سے لائی ہوں' اسی طرح عزت سے تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گی۔ تم واپس اپنے فلیٹ پر چلی جانا' پوری عزت آبرو کے ساتھ۔ میں تمہیں سامنے والے دروازے سے نہیں' پچھلے دروازے سے لائی ہوں۔ اسی دروازے سے تمہیں باہر لے جاؤں گی اور پھر تم نوکری کر لینا۔ فیکٹری کی مشین تمہارے انتظار میں ہے۔

دونوں بچوں کے نام انگریزی اسکول سے کٹوا لو کیونکہ اب تم وہاں کے اخراجات برداشت نہیں کر سکو گی۔ انہیں سرکاری اسکول میں داخل کروا دو۔ گھس گھس کر میٹرک تو کر لیں گے۔ پھر لڑکی کی کہیں شادی کر دینا اور لڑکے کو بی اے کرا دینا۔ اسے کہیں نہ کہیں کلرکی تو مل ہی جائے گی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ تم سارے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤ گی۔"

"نہیں .... نہیں .... نہیں۔" صفیہ دل ہی دل میں کانپ کر کہہ رہی تھی۔ "مشین .... نہیں .... اب وہ کام میرے بس کا نہیں .... میرے بچے .... نہیں وہ سرکاری اسکول میں نہیں پڑھیں گے۔ اردو میڈیم' کیا کریں گے وہ وہاں پڑھ کر؟ نہیں .... میٹرک .... شادی .... بیٹا .... کلرک .... نہیں نہیں نہیں۔"

اسی وقت دروازے پر دستک دینے کے بعد بشیراں ایک ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی جو چائے اور دیگر لوازمات سے اوپر تک بھری ہوئی تھی۔ جمیلہ اس وقت بولتے بولتے رُک گئی تھی اور بشیراں ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

"تم جاؤ بشیراں!" جمیلہ نے کہا۔ "چائے میں خود بنا لوں گی۔" اور بشیراں خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔

"آج ذرا رات تک رکو جانم!" جمیلہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں تمہیں تماشے دکھاؤں گی۔ اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے .... اور بالکل مطمئن رہو تمہاری پاکیزگی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ تم میری مہمان ہو .... لو یہ بسکٹ لو۔"

صفیہ نے بڑی مشکل سے' بہت ہی زیادہ مشکل سے اپنے منتشر دل و دماغ کو مجتمع کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "مگر .... جمیلہ آپا .... آج کل کے دور میں' میرا مطلب ہے' موجودہ حکومت کے دور میں جبکہ ہر طرف نفاذ اسلام کا چرچا ہے اور حدود آرڈی نینس کے تحت اس قدر پکڑا دھکڑی ہو رہی ہے' یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے؟ آپ لوگ........."

"حدود آرڈی نینس۔" جمیلہ نے اس کی بات کاٹ کر قہقہہ لگایا۔ "میری جان' یہاں آ کر حدود آرڈی نینس کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ تم بہت سیدھی اور بھولی ہو۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے ٹکھیائی جانتی ہو' حدود آرڈی نینس نافذ کرنے والے ہاتھ یہاں آ کر ہماری جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ جان عزیز یہ کسی ٹکھیائی کا کوٹھا نہیں ہے جہاں پولیس کا ایک معمولی کانسٹیبل بھی اپنا رعب گانٹھ سکے۔ یہ جمیلہ عرفانی کا وائلڈ ہاؤس ہے۔ ہاں اس عزت

کدے کا نام یہی ہے اور جاننے والے اسے اسی نام سے جانتے ہیں اور جانتی ہو یہاں کون آتا ہے؟ یہاں صرف اور صرف وہ لوگ آتے ہیں جن کی روزانہ کی آمدنی ہزاروں نہیں لاکھوں میں ہوتی ہے۔ بلامبالغہ لاکھوں میں۔ وہ لوگ جو گاڑیاں اس طرح بدلتے ہیں کہ تم اور تمہارے بچے اس طرح کپڑے بھی نہیں بدلتے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی جتنی دولت پاکستان میں ہوتی ہے اس سے دوگنی تگنی دولت غیر ممالک کے بینکوں میں ہوتی ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جانتی ہو یہ کون ہیں؟ رشوت اور حرام کی دولت کے پہاڑوں پر کھڑے ہوئے وہ لوگ ہیں جن کی ایک جیب میں قانون ہوتا ہے اور دوسری جیب میں انصاف' یہ وہ لوگ ہیں جن کی صفوں میں سے حکمران ٹولے تشکیل پاتے ہیں اور نوکر شاہی کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ لوگ وائلڈ ہاؤس کے محافظ ہیں۔ کسی سالے کی مجال ہے جو وائلڈ ہاؤس کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ وائلڈ ہاؤس کے دروازے پر آکر ہر قانون وہیں رک جاتا ہے' دہلیز کے اس طرف صرف جمیلہ عرفانی کا قانون چلتا ہے۔ کیا سمجھیں میری جان؟" وہ بڑے زور سے ہنسی۔ "لو چائے پیو۔"

"نہیں نہیں۔" صفیہ پر کپکپی سی طاری ہو رہی تھی۔ "میں چائے نہیں پیوں گی۔ میں .... بس اب چلوں .... اب مجھے .... خیر .... میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"بیٹھو صفیہ!" جمیلہ عرفانی نے نرمی سے کہا۔ "چائے پیو اور میری باتیں سنتی جاؤ۔ بچے اکیلے تو نہیں ہیں۔ میرن خالہ کے پاس ہیں۔ تم نے آتے وقت نیچے دو لڑکیوں کو دیکھا تھا .... دیکھا تھا نا؟"

"جی .... جی ہاں .... دیکھا تھا۔" صفیہ نے کہا۔

"ان میں جو گوری اور لمبی سی لڑکی ہے' اس کا نام زرینہ ہے۔ اس کی ایک بیٹی ہے جو اس وقت مری کے ایک کانونٹ میں پڑھ رہی ہے۔ وہیں ہاسٹل میں رہتی ہے اور زرینہ ہر تین ماہ بعد بائی ایئر مری جاتی ہے' وہاں بہترین ہوٹل میں ٹھہرتی ہے اور اپنی بچی سے ملاقات کر کے آتی ہے۔ اس کا ارادہ اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کا ہے۔"

"مگر .... مگر .... یہ سب کچھ کس قدر بھیانک ...."

"جانتی ہو میں اسے کہاں سے لائی تھی؟" جمیلہ نے صفیہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "سڑک کے کنارے سے۔ اس کے شوہر اور ساس سسر نے اس بات پر اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال باہر کیا تھا کہ شادی کے چار سال بعد بھی وہ ایک بیٹے کو جنم نہیں

دے سکی تھی۔ وہ ایک بیٹی کی ماں تھی اور جب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ سڑک کے ایک کنارے بیٹھی ہوئی یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں جائے' تو اتفاق سے میں نے اسے دیکھ لیا اور اگر میں اسے نہ دیکھ لیتی تو جانتی ہو کیا ہوتا؟ یہ سڑکوں پر بھیک مانگتی پھرتی اور ہر سال ایک حرامی بچہ جنتی........"

صفیہ کو متلی ہونے لگی' اسے ایسا لگا جیسے اسے وہیں قے ہو جائے گی۔

"میرے ہاؤس میں بہت سی لڑکیاں ہیں صفیہ! اور ان سب کی داستانیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی لڑکی ایسی نہیں ہے جو اپنے شوق سے' اپنی خوشی سے یہاں آئی ہو۔ سب کسی نہ کسی مجبوری کے تحت آتی ہیں اور اب وہ سب کی سب کیا ٹھاٹھ دار زندگی گزار رہی ہیں ان میں کئی بچوں والیاں ہیں۔ ان کے بچے کراچی سے باہر کے اعلیٰ ترین اسکولوں میں پڑھتے اور ہاسٹلوں میں رہتے ہیں۔"

"لیکن کل کو' جب ان کے یہ چھوٹے چھوٹے بچے جوان ہو جائیں گے تو انہیں اپنی ماؤں کے چہروں سے نفرت ہو جائے گی۔" صفیہ نے سنبھل کر کہا۔ اس کے اندر کی ماں اور عورت بپھر کر سینہ سپر ہو گئی تھی۔ "وہ تو ان کی صورت دیکھنا ہی گوارہ نہیں کریں گے۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" جمیلہ نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔ "ان کے بچوں کو کبھی نہیں معلوم ہو گا کہ ان کی ماں کیا کرتی تھی۔ جب تک یہ جاننے کا وقت آئے گا اس وقت تک یہ لڑکیاں اپنی ڈھلتی جوانیوں کے ساتھ اپنی اپنی دکانیں بڑھا کر یہاں سے چلی جائیں گی۔ ویسے وائلڈ ہاؤس میں عمر رسیدہ عورتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں آنے والوں کو تو صرف نوخیز کلیوں کی چمک چاہئے۔ اسی لئے ہر لڑکی کے لئے کمائی کی بس محدود مدت کافی ہے اور اس دوران ہی وہ اتنا کما لیتی ہے کہ اس کے سہارے اپنی اور اپنے بچوں کی آئندہ زندگی بخوبی گزار سکتی ہے۔"

"مثلاً .... کتنا؟" صفیہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا اور اسے اپنے اس سوال پر خود سے شرم آنے لگی۔

"اوسطاً بتاتی ہوں۔" جمیلہ نے کہا۔ "کوئی بھی لڑکی اوسطاً ایک ہزار روپیہ فی رات سے کم نہیں کماتی اور اس میں سے چالیس فیصد رقم یعنی چار سو روپے اسے ہاؤس کو دینے پڑتے ہیں۔ اس طرح وہ فی رات چھ سو روپیہ کماتی ہے۔ اب خود ہی حساب لگا لو۔"

"واقعی؟" صفیہ کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی کے عالم میں پھیل گئیں۔ "ایک

رات کے ایک ہزار روپے؟ کون دیتا ہے؟"

"دینے والے دیتے ہیں صفیہ بیگم!" جمیلہ نے بھاری آواز میں کہا۔ "وہ دیتے ہیں جو جب شام کو دفتر سے اٹھ کر گھر جاتے ہیں تو نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے' وہ دیتے ہیں جن کی بڑی بڑی جاگیریں اور زمین ان کے لئے سونا اگلتی ہیں اور یہ سارا سونا بلاشرکت غیرے ان کی جیبوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ دیتے ہیں جو ایک ٹیلی فون پر ہونے والے ایک سودے میں ایک منٹ مین لاکھوں کے وارے نیارے کرتے ہیں' وہ دیتے ہیں جو ملک کی پوری انتظامیہ پر' ملک کی سیاست پر' ملک کی معیشت پر' صنعت و کاروبار اور تجارت پر قابض ہیں' جن کے ہاتھوں میں ملک کی لگامیں ہیں' وہ دیتے ہیں میری جان! جو پورے ملک کو رات دن لوٹتے ہیں۔ انہیں مزدور' کو' کارکن کو' محنت کش کو' ایک روپیہ دیتے ہوئے موت آتی ہے لیکن رنڈی کے قدموں میں' داشتہ کے قدموں میں' وہ نوٹوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ ہزار روپیہ .... ہنھ .... ایک ہزار روپے کی ان کے لئے اوقات کیا ہے؟"

صفیہ کا دماغ سن ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ وہاں سے جانا چاہتی تھی لیکن کوشش کے باوجود اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ جمیلہ کی باتوں میں الجھتی جا رہی تھی۔

"میں تمہیں اس لئے یہاں لائی ہوں کہ تم سے صاف بات کر لوں۔" جمیلہ نے کہا۔

"اگر جی چاہے تو چلی آؤ' چھ سو روپے فی رات آمدنی کی مکمل گارنٹی دیتی ہوں۔ بچوں کے لئے ایک الگ کمرہ ہو گا اور دیکھ بھال کے لئے آیا ہو گی۔ وہ سب میرے ذمے۔ اگلے سال بچوں کو مری' لاہور' نتھیا گلی یا پشاور کے کسی مشن اسکول میں بھیج دیں گے۔ جہاں وہ ہاسٹل میں رہیں گے۔ وہاں ان کی بہترین دیکھ بھال ہو گی۔ ذرا حساب تو کرو میری جان۔ ابھی تم جوان ہوں کم از کم دس سال تک بڑے آرام سے دھندہ کر سکتی ہو۔ ذرا خود ہی حساب لگا لو۔ اس دس سال کی مدت میں کم ترین اوسط کے ساتھ بھی تم کتنا کما لو گی اور اس میں سے کتنا بچا لو گی۔ پراپرٹی بناتی جاؤ اور پھر بھی جو بچے اس کو سیونگ اسکیم میں ڈالتی جاؤ لیکن اب فرشتوں کی کسی کمپنی میں پیسہ جمع نہ کرنا .... فرشتوں سے تو اب دور ہی رہنا۔ ویسے بھی' اس شیطانی دھندے میں فرشتوں کا کیا کام؟" اور وہ بڑے زور سے ہنسنے لگی۔

صفیہ کو یہ سب کچھ انتہائی گھناؤنا' انتہائی ناقابلِ برداشت اور انتہائی ذلت آمیز معلوم ہو رہا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جمیلہ کے منہ پر ایک جوتا رسید کر دے۔ یہ

فراموش کر دیا تھا۔ ایک آدھ بار اسے جمیلہ عرفانی کا خیال آیا بھی تھا لیکن پھر وہ اسے بھول گئی تھی۔ اس کے سامنے تو اس وقت سب سے بڑا سوال اس کی اور اس کے بچوں کی بقا کا تھا۔ اس بقا کے لئے کس انداز کی جدوجہد کرنی ہو گی؟

جمیلہ عرفانی کو دیکھ کر اس نے مسرت کا اظہار کیا اور اسے گھر کے اندر بلا لیا۔ جمیلہ آج بھی بہت نفیس اور زرق برق لباس میں تھی اور اس کے پاس سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ کسی تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح شاداب اور شگفتہ لگ رہا تھا۔ پریشانی یا دکھ کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ وہاں تو تر و تازگی کی ایک ایسی نشاط آگیں کیفیت تھی جس میں غم اور تفکر کا شائبہ تک نہیں تھا۔

صفیہ کو اسے یوں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ جمیلہ عرفانی کے کئی لاکھ روپے اتحاد موٹرز میں جمع ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہزارہا لوگون کے ساتھ اس کی اپنی رقم بھی ڈوب گئی ہو گی لیکن اسے تو جیسے کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔

"اور اسے کیوں پرواہ ہو؟" اس نے چپکے سے اپنے دل میں کہا۔ "وہ تو کسی بہت بڑے گھر کی عورت ہے اس کے لئے چند لاکھ روپے کی رقم شاید کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ ہم جیسوں میں سے نہیں ہے.........."

"دیکھا تم نے؟" جمیلہ نے بغیر کسی تمہید کے ایک دم کہنا شروع کر دیا۔ "آخر بھاگ گئے نا؟ میں نے کیا کہا تھا تم سے؟ وہ بھی دوسروں سے مختلف نہیں تھے۔ ہوس' لالچ' خودغرضی اور نفس پروری کے مارے ہوئے لوگ .... وہ تو تاجر تھے' صرف اور صرف تاجر جن کے پاس کسی قسم کا کوئی بھی ضابطۂ اخلاق نہیں تھا۔ مزدوروں' غریبوں اور مجبوروں کو لوٹ کر کھا گئے.........."

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" صفیہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "یہ تو وہ لوگ تھے جو اس وقت تک کسی کا پیسہ قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ ان کو اس بات کا یقین نہیں آ جاتا تھا کہ یہ حلال کی کمائی کا پیسہ ہے۔ یہ تو غیر مسلموں کے پیسے' بینک میں کام کرنے والوں.........."

"ارے کس چکر میں پڑتی ہو صفیہ!" جمیلہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑی تلخی کے ساتھ کہا۔ "سب ڈھکوسلہ' سب فراڈ' صرف مکارانہ پروپیگنڈا۔ اپنے آپ کو فرشتہ سیرت ظاہر کرنے کے لئے .... اپنے آپ کو معتبر ترین ظاہر کرنے کے لئے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افسروں کی کتنی کتنی بھاری رقم ان کے پاس جمع تھی' جو

زندگی بھر کی تنخواہ سے بھی نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ کیا ان ننھے نادانوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ پیسہ کہاں سے آیا تھا؟ اور کیا کسی بھی شخص کے پیسے کے بارے میں یہ حتمی فیصلہ دینا ممکن ہے کہ اس میں ایک ایک پائی حلال کی کمائی کی ہے؟ نہیں صفیہ .... کچھ نہیں۔"

"تو آپ کا مطلب ہے کہ دوسروں کی طرح وہ بھی فراڈ تھے؟" صفیہ نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دوسروں سے مختلف نہیں تھے؟"

"اگر ان کا عمل دوسروں سے مختلف نہیں ہے تو وہ دوسروں سے مختلف کس طرح ہو سکتے ہیں صفیہ؟" جمیلہ نے کہا۔ "جو کچھ دوسروں نے کیا' وہی انہوں نے بھی کیا۔ بلکہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اس لئے اور بھی زیادہ قابلِ مذمت ہیں کہ انہوں نے لوگوں کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیا۔ انہوں نے مذہب کے تقدس کا مذاق اڑایا۔ مذہب کی بے حرمتی کی۔ جانتی ہو اربوں روپے کی رقم وہ لوگ پہلے ہی غیر ملک میں منتقل کروا چکے ہیں۔ یہاں اب رکھا ہی کیا ہے؟ کیش تو سارا انہوں نے پہلے ہی ہڑپ کر لیا اور اب جو منقولہ اور غیر منقولہ جائداد ہے' اس کا بڑا حصہ پولیس' ایف آئی اے' سی آئی اے وغیرہ کے لوگ کھا جائیں گے غریب انویسٹروں کو کیا ملے گا؟ کچھ بھی نہیں۔ حصہ بانٹ تو بالا ہی بالا ہو جائے گا۔"

"میں تو برباد ہو گئی جمیلہ آپا!" صفیہ نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"میں نے تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی تھی صفیہ!" جمیلہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "لیکن افسوس کہ مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ بس ذرا سی دیر ہو گئی ورنہ میرا اور تمہارا دونوں کا کام ہو جاتا۔"

"وہ کس طرح؟" صفیہ نے چونک کر پوچھا۔ "کیا پیسے ہمیں واپس مل جاتے؟"

"ہاں مل جاتے۔" جمیلہ نے کہا۔ "ایف آئی اے کے کچھ افسران دس فیصد کمیشن لے کر جان پہچان کے انویسٹروں کو ان کی رقم اتحاد موٹرز سے واپس دلوا رہے تھے' میرا ان لوگوں سے رابطہ قائم ہوا اور میں نے ان سے دو انویسٹروں' یعنی اپنے اور تمہارے لئے بات کی اور میں نے یہ سوچا تھا کہ تمہیں میں پورے پیسے دے دوں گی اور تمہاری طرف سے ایف آئی اے والوں کو کمیشن میں خود دے دوں گی۔ میں تمہاری دستاویز اور کارڈ کی نقل تم سے لینے کے لئے آنے ہی والی تھی کہ اس اثنا میں اسٹیٹ بینک نے بذریعہ

عدالت اتحاد موٹرز کے تمام اثاثوں کو منجمد کر دیا اب ان کے لئے ایک پائی کی بھی ادائیگی ممکن نہیں رہی۔ اس طرح یہ کام نہ ہو سکا۔"

"تو کیا .... کیا واقعی ایف آئی اے والوں نے کمیشن لے لے کر لوگوں کو ان کی رقوم واپس دلوائی ہیں؟" صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہل کاروں اور عمال کی جو اپنی رقوم تھیں' وہ تو انہوں نے پہلے ہی چھین جھپٹ کر کے وصول کر لی تھیں اور اس کے علاوہ وہ کروڑوں روپے کی گاڑیاں اور دوسرا قیمتی ساز و سامان بھی کمپنی سے اٹھا کر لے گئے۔ انہیں بھلا کون روک سکتا تھا؟ وہ تو قانون نافذ کرنے والے ہیں۔ قانون کو تو وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں لئے رہتے ہیں۔ تو جناب ان لوگوں نے اپنی رقمیں نکال لینے کے بعد پھر دلالی بھی شروع کر دی اور جان پہچان کے لوگوں کی رقوم بھی اتحاد موٹرز سے حاصل کیں اور حسب توفیق کمیشن وصول کر کے رقوم متعلقہ انویسٹروں کے حوالہ کر دیں۔ میں نے بھی ایک ایسے ہی دلال کو پکڑا تھا لیکن اگلے ہی دن سے کمپنی کے اثاثے منجمد کر دیئے گئے۔ پھر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"تو اب آپ کے خیال میں کیا امید ہے؟" صفیہ نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ "کوئی امکان نظر آتا ہے.........؟"

"بہت مشکل ہے۔" جمیلہ نے کہا۔ "اب دیکھو نا' ٹھیک ہے حکومت ان کے سارے اثاثے ضبط کر لیتی ہے۔ قانوناً صرف وہی اثاثے ضبط کئے جا سکتے ہیں جو ان لوگوں کے اپنے نام سے ہیں اور کروڑوں بلکہ شاید اربوں روپے کے جو اثاثے انہوں نے اپنی اصل دولت چھپانے کی غرض سے دوسروں کے فرضی ناموں سے بنا رکھے ہیں۔ وہ تو ضبط نہیں کئے جا سکتے۔ پھر اربوں روپیہ کیش یہ لوگ باہر ٹرانسفر کر چکے ہیں۔ ایک عرصے سے یہ کام جاری تھا اب جو اثاثے کمپنی کے اپنے نام پر موجود ہیں انہیں ضبط کر کے اگر حکومت بیچ بھی دے تو اس سے جو رقم حاصل ہو گی وہ اتنی کم ہو گی کہ اس سے انویسٹروں کا کوئی بھلا نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ انویسٹروں کی لگائی ہوئی رقم بلاشبہ اربوں روپے تک پہنچتی ہے' لوگوں کے حصے میں کیا آئے گا؟ شاید آنسو پونچھنے کے لئے تھوڑے سے پیسے اور بس' کیا رکھا ہے ان ساری باتوں میں؟ سب پبلک کو بے وقوف بنانے کے ہتھکنڈے ہیں۔"

صفیہ اس کی باتیں سن کر بالکل خاموش ہو گئی' جمیلہ واقعی ٹھیک کر رہی تھی۔ اتنی بہت سی سرمایہ کار کمپنیاں بھاگ گئیں' اتنا عرصہ ہو گیا۔ کسی کو کیا مل گیا؟ اب ان مولاناؤں کے پاس سے بھی کسی کو کیا مل سکے گا۔ انہوں نے زیادہ تر دولت کو تو پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا

تھا۔ رقم یہاں سے بیرونی ممالک میں منتقل کرا دی تھی' اب تھوڑے بہت جو بچے کھچے اثاثے کمپنی کے اپنے نام پر تھے' وہ بیشک حکومت ضبط کرلے۔ ان کی اوقات ہی کیا تھی؟ اور کیا قانونی اوقات تھی اس کاغذ کی حقیر اور بے وقعت پرچی کی جس پر کسی کمپنی کا نام نہیں تھا' کسی کمپنی کی مہر نہیں تھی' جس پر کسی ذمہ دار آدمی کا نام تک لکھا ہوا نہیں تھا؟ ایسی پرچیاں تو کوئی بھی جتنی چاہے اپنے ہاتھ سے بنالے اور جس کے چاہے اس پر دستخط کردے۔ قانونی لین دین کے سلسلے میں ان پرچیوں کی کوئی عدالتی حیثیت نہیں تھی دنیا کی کسی عدالت میں ان پرچیوں کی بنیاد پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی تھی۔

مولاناؤں نے اپنے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا تھا اور اپنی قانونی اور عدالتی پوزیشن کو سولہ آنے صاف اور محفوظ رکھا تھا۔ اس سارے شیطانی چکر میں صرف غریب انویسٹر ہی بری طرح پھنستا تھا۔ اس کے پاس اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک کارڈ اور ایک پرچی کے۔ کارڈ پر بھی کسی ادارے کا نام تحریر نہیں تھا۔ بس ایک سادہ سا کارڈ تھا جس پر مہینوں کے نام لکھے ہوئے تھے نیز اوپر اکاؤنٹ ہولڈر کا نام و پتہ اور یہاں کا اکاؤنٹ نمبر۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ محض اس کاغذ اور اس کارڈ کی بنیاد پر مولاناؤں نے پبلک سے اربوں روپیہ سمیٹ لیا اور سب لے کر بھاگ گئے۔

"اچھا' اب یہ بتاؤ کہ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" جمیلہ کی آواز سن کر صفیہ چونک پڑی۔ "کیا کروگی اب؟ اپنی اور ان بچوں کی ضروریات کس طرح پوری کروگی؟ کیا فیکٹری میں مزدوری کروگی جیسے کہ پہلے کرتی تھیں؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا جمیلہ آپا!" صفیہ نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ "کچھ نہ کچھ تو بہرحال کرنا ہی ہے۔ میرا ہاتھ تو اب بالکل خالی ہوچکا ہے اور کرنے کو کیا ہے' بس نوکری ہی ہے' نوکری ہی کرسکتی ہوں' وہی کروں گی۔"

"جب تم نے نوکری چھوڑی تھی تو اس وقت تمہاری تنخواہ کتنی تھی؟" جمیلہ نے اس سے پوچھا۔

"تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "کچھ ذرا سی زیادہ .... لیکن جمیلہ آپا! وہ بڑا مشکل اور تھکا دینے والا کام ہے' انسان سارا دن مشین کے سامنے اپنی ہڈیاں گلاتا رہے اور آخر میں ہاتھ کیا آئے؟ اٹھارہ سو روپے مہینہ .... لاکھوں روپے کماکر ڈھیر لگادو اور اپنے حصے میں کیا آئے؟ لعنت ہو .... یہ بھی کوئی بات ہوئی .... ہنہ۔"

"تم میٹرک پاس ہو؟" جمیلہ نے کہا۔ "صرف میٹرک اور تمہاری تنخواہ تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تھی۔ تو میری پیاری بہن! موجودہ حالات میں تمہاری تعلیم کے لحاظ سے یہ بہت بڑی تنخواہ تھی اس سے زیادہ تمہیں اور کیا ملے گا؟ تم اس سے زیادہ کی توقع آخر کس بنیاد پر رکھتی ہو؟"

"پتہ نہیں۔" صفیہ نے ذرا کھسیا کر کہا۔ "لیکن اب اگر میں نئے سرے سے وہاں نوکری کروں گی تو شاید اس سے کم پیسے ملیں گے کیونکہ پھر تو سب کچھ نئے سرے سے شروع ہوگا اور جمیلہ آپا! اب میں نوکری نہ کروں تو کیا کروں؟"

"تم نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا؟" جمیلہ نے آہستہ سے اس سے کہا۔

"نہ سوچا ہے نہ سوچنا چاہتی ہوں۔" صفیہ نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میری اماں بھی جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں اور انہوں نے ہم بھائی بہنوں کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ وہ چاہتیں تو دوسری شادی کرسکتی تھیں لیکن وہ ہمیں سوتیلے باپ کا دکھ نہیں دینا چاہتی تھیں اور میں نے جس طرح بیوگی کے دو سال گزار دیئے ہیں اسی طرح باقی عمر بھی گزار سکتی ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے اندر کی ساری آرزوؤں کو تھپک تھپک کر' لوریاں دے دے کر سلا دیا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھا جمیلہ آپا! اور میں دوسری شادی کرکے اپنے بچوں سے ناانصافی نہیں کرسکتی۔ یہی تو میری زندگی کا حاصل ہے۔ اگر میں نے ان کو دربدر کردیا تو پھر میری زندگی میں کیا رہ جائے گا؟"

"تمہیں واقعی اپنے بچوں سے بہت پیار ہے۔" جمیلہ عرفانی نے بہت گھمبیر لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ تو سوچو کہ تم ان کی ضروریات کس طرح پوری کروگی؟ تم نے ان کو ایک خاص معیارِ زندگی کا عادی بنا دیا ہے اور تم ان کو وہاں سے واپس نیچے لاؤ گی تو یہ ان پر بڑا ظلم ہوگا۔"

"تو پھر کیا کروں جمیلہ آپا؟" صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "بھائی بہن تھے' سو انہوں نے اپنے راستے الگ کرلئے۔ میاں اللہ کو پیارا ہوگیا' جو رہی سہی کسر تھی وہ مولاناؤں نے' فرشتوں نے پوری کردی' اب میں کہاں جاؤں؟"

"زندگی کے سنگلاخ ریگ زاروں میں اپنا راستہ خود تلاش کرنا پڑتا ہے صفیہ!" جمیلہ نے کہا۔ "بھائی بہن' عزیز رشتے دار' ان سب پر کوئی کب تک تکیہ کرسکتا ہے؟ دیکھو نا سب کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں' سب کے اپنے اپنے الگ راستے ہوتے ہیں۔

تمہیں بھی اپنا راستہ خود تلاش کرنا ہو گا۔ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ میں تمہیں جان لیوا اور بے فیض مشقت سے نجات دلا سکتی ہوں۔ تم چاہو تو اپنے بچوں کے مستقبل کو شاندار بنا سکتی ہو' ایسا ہی' جیسا کہ تم سوچ رہی ہو۔"

"مگر......... جمیلہ آپا........" صفیہ کی آواز بہت ہلکی تھی۔ "میں آپ کو بتا چکی ہوں' میں دوسری شادی نہیں کروں گی۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو میں آج سے دو سال پہلے ہی یہ کام کر چکی ہوتی۔"

"آج شام میں تمہیں لینے آؤں گی۔" جمیلہ نے اس سے کہا۔ "میرے ساتھ میرے گھر چلنا۔ ہم وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ باقی باتیں میں تم سے اپنے گھر پر ہی کرنا چاہتی ہوں' کیوں ٹھیک ہے نا؟ چلو گی نا؟ میں آؤں تمہیں لینے؟"

"ہاں جمیلہ آپا! ضرور چلوں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھلا آپ مجھے بلائیں اور میں آپ کے گھر نہ چلوں' ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تیار رہوں گی۔ آپ ضرور آیئے اور ہاں آپ امینہ سے تو مل چکی ہیں نا' اس بے چاری کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔"

"اوہ .... مجھے یہ جان کر افسوس ہوا۔" جمیلہ نے کہا۔ "میں اس سے تعزیت کے لئے اس کے گھر ضرور جاؤں گی' تمہارے ساتھ لیکن ابھی نہیں دو چار دن کے بعد چلوں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے کہا۔ "وہ بے چاری بھی بہت پریشان ہے۔ اس کا بھی اب کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہا۔"

"اللہ مالک ہے۔" جمیلہ عرفانی نے اپنے خوبصورت چمکیلے اور سیاہ ڈائی کئے ہوئے بالوں کی لٹوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے۔ دنیا میں جتنے انسان ہیں ان سے کہیں زیادہ دکھ ہیں' ایک ایک انسان ہزاروں دکھوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوتا ہے۔"

کچھ دیر کے بعد جمیلہ عرفانی چلی گئی۔ اس نے اس موضوع کے بارے میں صفیہ سے پھر کوئی بات نہیں کی تھی۔

اور اس کے جانے کے بعد صفیہ بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ آخر جمیلہ عرفانی کے پاس اس کے مسائل کا کیا حل موجود ہے؟ شاید جمیلہ عرفانی کا کوئی رنڈوا بھائی .... کوئی عمر رسیدہ شخص .... دوسری شادی کا خواہشمند کوئی ایسا آدمی جو بیوہ کے بچوں کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہو .... ضرور کوئی ایسی ہی بات ہو سکتی تھی۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ایک نوجوان بیوہ کو مع بچوں کے اپنانے کے لئے تیار تھے۔ کتنے ہی ایسے مالدار بوڑھے تھے جو دوسری شادی کے لئے بلبلاتے رہتے تھے' قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے مگر گھر میں نئی دلہن کو دیکھنے کی آرزو دل میں مچلتی رہتی تھی۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہو سکتے تھے جو نیک نیتی اور پائیداری کے ساتھ ایک نوجوان بیوہ کو مع اس کے دو بچوں کے تحفظ فراہم کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔

شام کے وقت اس نے دونوں بچوں کو میرن خالہ کے حوالے کیا اور انہیں بتا دیا کہ وہ جمیلہ آپا کے ساتھ ان کے گھر جا رہی ہے۔ وہ کچھ دیر بعد اسے لینے کے لئے آئیں گی۔

"تو تم بچوں کو بھی ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں؟" میرن خالہ نے کہا۔ "ان کا بھی ذرا جی بہل جائے گا۔ بے چارے اسکول سے آنے کے بعد بس سارا دن گھر میں ہی بند رہتے ہیں۔"

"نہیں خالہ!" صفیہ نے مسکرا کر کہا۔ "وہ بڑے لوگ ہیں' ان کے ہاں کے طور طریقے بھی مختلف ہوں گے۔ میں اس سے پہلے ان کے گھر کبھی نہیں گئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ بچوں کو وہاں لے جانا چاہئے یا نہیں۔ شاید بڑے لوگوں میں اس کا دستور نہیں ہے۔"

صفیہ اس بات سے بہت خوش تھی کہ جمیلہ نے اسے اپنے گھر بلایا تھا اور وہ خود ہی اسے لینے کے لئے بھی آنے والی تھی اور جب جمیلہ مقررہ وقت پر آ گئی تو صفیہ کو اور بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ صفیہ تو کافی دیر پہلے سے ہی تیار ہو چکی تھی اور جمیلہ کی راہ دیکھ رہی تھی۔

"دیکھ لو میں نے وعدہ کیا تھا اور میں آ گئی۔" جمیلہ نے مسکراتے ہوئے صفیہ سے کہا اور صفیہ اس کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ جمیلہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی لیکن اس عمر میں بھی وہ کس قدر جاذب نظر اور پرکشش تھی۔ اسے تو ایک نظر دیکھنے کے بعد بس یہی جی چاہتا تھا کہ دیکھتے چلے جاؤ۔ اس کا پیکر جیسے رنگ و بو سے تراشا ہوا لگتا تھا اور اس کی چال میں ایک شاہانہ وقار اور عجیب طرح کی تمکنت تھی۔

"اور میں بھی تیار بیٹھی ہوں جمیلہ آپا۔" صفیہ نے کہا۔ "بس آپ کے لئے ایک پیالی چائے۔"

"نہیں نہیں........" جمیلہ نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم چائے مت بناؤ بس جلدی سے گاڑی میں بیٹھو اور چلو .... ہم چلتے ہیں۔"

صفیہ نے بہت اصرار کیا لیکن جمیلہ چائے پینے پر راضی نہیں ہوئی صفیہ اس کے

ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی اور وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ صفیہ آج دوسری بار جمیلہ کی گاڑی میں بیٹھی تھی اور اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نئی نویلی خوبصورت گاڑی یوں چل رہی تھی جیسے ہوا میں سرسراتی چلی جا رہی ہو' یا پانی میں بہتی چلی جا رہی ہو۔

تھوڑی ہی دیر میں گاڑی صدر کے بہت گنجان' پُرشور اور ہنگامہ خیز علاقے سے نکل کر ڈرگ روڈ پر آ گئی اور تھوڑی دور آگے جانے کے بعد کورنگی روڈ کی طرف مڑ گئی۔

صفیہ آج تک ڈیفنس سوسائٹی نہیں گئی تھی۔ اس سوسائٹی میں اس کا کوئی جاننے والا نہیں رہتا تھا۔ وہ سماج کے جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی' اس کے لئے ڈیفنس سوسائٹی ایک اجنبی دنیا تھی' یہ ایک بالکل الگ دنیا تھی جس میں صفیہ جیسے لوگوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔ صفیہ اس روڈ سے تو دو ایک بار بس میں بیٹھ کر گزری تھی اور کورنگی گئی تھی جہاں اس کے ساتھ فیکٹری میں کام کرنے والی بعض لڑکیاں رہتی تھیں۔ بس اس روڈ سے گزرتی ہوئی سیدھی آگے چلی گئی تھی اور صفیہ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ شروع کے حصے میں کافی دور تک سڑک کے دونوں طرف ڈیفنس سوسائٹی ہے لیکن وہ اس سوسائٹی کے اندر کبھی نہیں گئی تھی۔

"آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں اور کون کون رہتا ہے جمیلہ آپا؟" راستے میں صفیہ نے اس سے پوچھا۔

"میرے علاوہ .... میرے علاوہ بھی کچھ اور لوگ وہاں رہتے ہیں۔" جمیلہ نے جیسے سوچ سوچ کر جواب دیتے ہوئے کہا۔ "تم کو ملواؤں گی ان لوگوں سے۔" اور صفیہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ ان ہی لوگوں میں کوئی وہ شخص بھی ہو گا جس سے جمیلہ ملوانا چاہتی ہوں گی۔ اسی لئے وہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں۔

جمیلہ کی گاڑی ٹریفک سگنل سے دائیں ہاتھ کو گھوم گئی اور پھر سیدھی چلتی ہوئی سن سیٹ بلیوارڈ پر جا نکلی۔ صفیہ کے دونوں جانب وسیع و عریض محل نما شاندار کوٹھیوں کا ایک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ عجیب عجیب وضع کے مکانات تھے' ایسے کہ صفیہ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ ان مکانوں کی وسعت اور خوبصورتی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ جو لوگ ان مکانوں میں رہتے ہیں' کیا وہ بھی واقعی اسی خدا کے بنائے ہوئے ہیں جس خدا نے صفیہ جیسے لوگوں کو بنایا ہے؟ یا شاید یہ کوئی خاص مخلوق تھی' اس کا خمیر کسی اور مٹی سے بنایا گیا تھا اور اس کی رگوں میں کچھ مختلف قسم کا خون دوڑ رہا تھا۔

اور پھر جمیلہ کی گاڑی گزری بلیوارڈ سے گزر کر ذیلی سڑکوں کے نشیب و فراز سے

عورت کس قدر ڈھٹائی اور بے شرمی سے سب کچھ کہہ رہی تھی۔ اُف زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی۔ آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا؟ قیامت کیوں نہیں آ جاتی؟ اُف .... میرے خدا .... میرے خدا .... میرے خدا۔

لیکن نہ تو زمین پھٹی' نہ آسمان ٹوٹا اور نہ قیامت آئی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس رات کے ٹھیک ایک ماہ کے بعد صفیہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وائلڈ ہاؤس منتقل ہو گئی۔ اس نے اپنے پڑوسیوں کو یہ بتایا تھا کہ وہ کچھ عرصے کے لئے اپنی "منہ بولی بہن" جمیلہ آپا کے ساتھ رہنے جا رہی ہے۔ سوائے چند ضروری چیزوں کے باقی ساز و سامان فلیٹ میں چھوڑ کر اسے تالہ لگا دیا گیا تھا۔ جمیلہ آپا نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی کاٹھ کباڑ ساتھ نہ لایا جائے' کیونکہ وائلڈ ہاؤس میں کسی تھرڈ کلاس چیز کی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ صفیہ اور اس کے بچوں کو ہر چیز "برانڈ نیو" فراہم کی جائے گی۔ وائلڈ ہاؤس کی جانب سے صفیہ کو خود کچھ نہیں خرچ کرنا پڑے گا۔

صفیہ کو وائلڈ ہاؤس میں رہتے اور "کام کرتے" ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور دنیا جوں کی توں تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا اور صفیہ خود .... اس پر بھی نہ کوئی بجلی گری' نہ قہر نازل ہوا' نہ وہ کسی عذاب کا شکار ہوئی۔

یہ سب کچھ نہ جانے کیسے' نہ جانے کیونکر ہو گیا تھا اور زندگی کے ان کمزور لمحوں میں صفیہ اپنے آپ کو ہار گئی تھی اور پھر تو وہ ہارتی ہی چلی گئی تھیں مسلسل ہارتی گئی اور اب شکست و ریخت کا یہ عمل ہی اس کی زندگی بن گیا تھا اور اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی اسے پوری پوری قیمت بھی مل رہی تھی۔ جمیلہ آپا نے غلط کہا تھا' اوسطاً آمدنی چھ سو روپے یومیہ سے کہیں زیادہ تھی۔

ایک ماہ کے بعد صفیہ دن میں کچھ دیر کے لئے امینہ سے ملنے اپنی بلڈنگ میں آئی۔ امینہ نے اس کا بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا اور وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

اور کچھ ہی دیر کے بعد امینہ اسے اپنے ان مصائب کی داستان سنا رہی تھی جو اس کو شوہر عبدالرحمٰن کی موت کے بعد برداشت کرنے پڑ رہے تھے۔ اتحاد موٹرز میں جمع کرائی ہوئی ساری رقم تو ڈوب ہی چکی تھی۔ فرشتے سارا مال سمیٹ کر ایسے لاپتہ ہوئے تھے کہ ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا اور ان کے اچھے خاصے اثاثوں کا ایف آئی اے اور سی آئی اے والوں نے تیا پانچا کر دیا تھا۔ امینہ بے چاری نے ایک انڈسٹریل ہوم میں کام شروع کر دیا تھا۔ کیا کرتی۔ آخر بچے تھے وہ خود تھی' بوڑھی اور بیمار ساس تھی اور ان سب

جانوں کو زندہ رکھنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی۔

صفیہ نے آج زندگی میں پہلی بار امینہ کو ایک خاص قسم کی نظروں سے دیکھا۔ یہ تیکھے نقوش' چھریرا سڈول جسم' لمبے بال' سیاہ آنکھیں' بے حد روشن اور چمکدار بال' لمبا قد' پتلی کمر' بے حد متناسب اعضاء۔ ہر قسم کے میک اپ سے بے نیاز ہونے کے باوجود بھی وہ بہتوں سے اچھی تھی۔

صفیہ نے چشم تصور سے امینہ کو خوب سجایا اور بہترین اور قیمتی میک اپ سے آراستہ و پیراستہ دیکھا .... اور اس کے دل میں تحسین و آفریں کے جذبات پیدا ہوئے۔ واہ کیا شاندار فگر تھی۔

"تو پھر.......... اب کب تک اس طرح زندگی گزارو گی امینہ؟" اس نے امینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اب کیسے کام چلے گا؟ بچے اچھی تعلیم سے محروم رہ جائیں گے .... اور اچھی تعلیم کے بغیر تو کوئی مستقبل نہیں ہے۔"

"پھر کیا کروں صفیہ؟" امینہ نے روہانسی ہو کر کہا۔ "اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ خدا ان فرشتوں کا بھلا کرے .... اگر میری جمع شدہ رقم واپس مل جاتی تو.........."

"مجھے فرشتوں نے وائلڈ ہاؤس تحفے میں دیا ہے۔" صفیہ نے ایک تلخ غم آگیں کھوکھلی اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی وہی تحفہ قبول کرلینا چاہئے۔"

"وائلڈ ہاؤس!" امینہ نے چونک کر کہا۔ "وہ کیا ہے؟ کیسا تحفہ؟ فرشتوں کا تحفہ؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"کل شام کو تیار رہنا۔" صفیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ٹیکسی لے کر آؤں گی اور تمہیں اپنے ساتھ جمیلہ آپا کے گھر لے چلوں گی۔ پھر ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ تیار ہو گی نا؟" امینہ نے آہستہ سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆======☆======☆

میسز بدرالحسن

ملیرندی سے عورت کی لاش ملی

کراچی (اسٹاف رپورٹر) قائد آباد کے علاقے میں ریلوے پُل کے نیچے ملیرندی سے ایک عورت کی لاش پڑی ملی ہے جس کے بارے میں پولیس کا خیال ہے کہ وہ کسی ٹرین سے گر کر ہلاک ہوئی ہے۔ پولیس مزید تفتیش کر رہی ہے۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی - 9 اگست 1989ء)

کیا آپ اس نامعلوم عورت سے واقف ہیں جو ٹرین سے گر کر ہلاک ہو گئی تھی؟

شاید نہیں۔

میں اس سے واقف ہوں۔ میرے تخیل نے زندگی کی گرد آلود اور سنگلاخ راہوں پر اس عورت کو تلاش کرلیا ہے جو ٹرین سے گر کر ہلاک ہو گئی۔

میں نے اس عورت کے سینے پر لگے ہوئے سارے زخموں کو دیکھ لیا ہے' اس کے دل میں دہکتے ہوئے سارے داغوں کو پڑھ لیا ہے اور آج میں اس کے زخموں اور داغوں کی کہانی آپ کو سنا رہا ہوں۔

اس عورت کا نام گلنار تھا اور وہ اپنی زندگی میں بہت ہی منفرد اور غیر معمولی قسم کے حالات سے دوچار ہوئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو خود اپنی ہی نظروں میں تماشہ بن جاتے ہیں۔

گلنار آج اس دنیا میں موجود نہیں ہے' وہ اپنے سارے دکھوں اور صدموں سمیت عدم کی وادی میں اتر چکی ہے اور اس کی یاد میں دو آنسو بہانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ جب مری تھی تب بھی اس کے لئے کوئی نہیں رویا تھا بلکہ جسے رونا چاہئے تھا اس نے سکون و اطمینان کا سانس لیا تھا' خود کو بہت ہلکا محسوس کیا تھا۔

گلنار کا خاندان کراچی کا رہنے والا تھا۔ وہ لوگ جمشید روڈ کے علاقے میں ایک مکان میں رہتے تھے۔ یہ مختصر سا کنبہ صرف تین افراد پر مشتمل تھا یعنی گلنار اور اس کے والدین' گلنار کا کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا۔

میں گلنار کی اس کہانی کا آغاز وہاں سے کروں گا جب گلنار نے اتنا ہوش سنبھالا کہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھنا اور اپنے اردگرد کی فضا کو کچھ سمجھنا شروع کیا۔ سب سے پہلی چیز اس نے یہ محسوس کی کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور اسکول جاتی تھی۔

شروع سے ہی اس نے اپنے گھر کی فضا کو دوسرے گھروں سے قدرے مختلف محسوس کیا لیکن اس فرق کا احساس اسے فوری طور پر نہیں ہوا تھا بلکہ آہستہ آہستہ عمر کے

بڑھنے' شعور کے ترقی کرنے اور اپنی گنی چنی سہیلیوں وغیرہ کے گھروں میں آنے جانے کے بعد سے ہوا تھا۔

اس گھر میں بہت سی باتیں تھیں جو دوسرے گھروں سے مختلف تھیں۔ اماں صبح دیر تک سونے کی عادی تھیں اور گلنار جب صبح کو اسکول جاتی تھی تو اس کے لئے ساری تیاری اماں نہیں ابا کراتے تھے۔ اماں تو معلوم نہیں کب سو کر اٹھتی تھیں۔ گلنار کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ یہ تو ابا ہی تھے جو اس کو جگاتے تھے' ہاتھ منہ دھونے دھلانے میں اس کی مدد کرتے تھے' اس کے کپڑے نکال کر دیتے تھے اور اس کے لئے ناشتہ بھی تیار کرتے تھے۔ ابا صرف دو آدمیوں کے لئے یعنی اپنے لئے اور اس کے لئے ناشتہ تیار کرتے تھے۔

اس کے بعد گلنار اسکول چلی جاتی اور ابا گھر پر ہی رہ جاتے۔ اماں تو پہلے ہی سے گھر پر ہوتیں اور سو رہی ہوتیں۔

دوپہر کو جب گلنار اسکول سے گھر واپس آتی تو ابا کو بے خبر سوتا ہوا پاتی۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ وہ اسکول سے واپس آئی ہو اور اس نے ابا کو جاگتے ہوئے پایا ہو۔ وہ خوب گہری نیند سو رہے ہوتے جبکہ اماں جاگ رہی ہوتیں اور اب گلنار کو سنبھالنے کی اور اس کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری اماں کی ہوتی۔ اماں ہی اس کا لباس وغیرہ تبدیل کرواتیں' ہاتھ منہ دھونے میں اس کی مدد کرتیں اور اس کو دوپہر کا کھانا دیتیں اور اس کو کھانا وغیرہ کھلانے کے بعد پھر سو جاتیں۔ گلنار کبھی سو جاتی اور کبھی جاگتی رہتی۔ البتہ اماں اور ابا دونوں اس وقت سوئے ہوئے ہوتے اور پھر وہ لوگ سہ پہر کو کہیں جا کر اٹھتے اور کچھ دیر کے بعد چائے وغیرہ پینے کے بعد ابا تو تیار ہو کر باہر نکل جاتے اور اماں نہا دھو کر' خوب اچھے اچھے کپڑے پہن کر تیار ہو جاتیں اور گلنار کو اپنی یہ بنی ٹھنی' سجی سجائی' خوبصورت اماں بہت پیاری لگتیں۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ ان کے پاس بیٹھے' ان کی گود میں بیٹھے' ان کو پیار کرے' وہ اس کو پیار کریں لیکن اماں کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگتا' وہ گلنار کو روک دیتیں۔ "نا بیٹی نا' میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے .... نا' میری لپ اسٹک بگڑ جائے گی .... بس وہیں بیٹھی رہو' یہیں ٹھیک ہے۔"

رات کے کھانے کے وقت ابا موجود نہیں ہوتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کس وقت آتے تھے۔ وہ جب آتے تھے تو اس وقت گلنار سو چکی ہوتی تھی۔ اماں گلنار کو کھانا کھلا کر سلا دیتیں اور اس کے بعد گھر میں جو کچھ ہوتا تھا اس کا گلنار کو شروع کے برسوں کے

دوران بس ہلکا ہلکا سا علم رہتا تھا۔

رات کو اگر کسی وقت اس کی سوتے سے آنکھ کھل جاتی تو وہ ابا کو ہی اپنے پاس پاتی تھی۔ وہ عام طور سے نیم خوابیدہ سے ہوتے تھے اور ان کے منہ سے عجیب سی بُو آ رہی ہوتی تھی۔ اس نے دن میں ابا کے منہ سے بدبو آتی ہوئی کبھی محسوس نہیں کی تھی لیکن رات کو ان کے منہ سے برابر یہ بُو آتی تھی۔

اماں دوسرے کمرے میں ہوتی تھیں اور اس نے رات کے وقت کبھی بھی اماں کو اپنے پاس نہیں پایا اور نہ ابا نے اس کو اماں کے پاس جانے دیا۔ گو کہ اس کے دل میں بارہا یہ خواہش پیدا ہوئی تھی وہ اماں کے پاس جائے اور دیکھے کہ وہ کیا کر رہی ہیں لیکن ابا نے اس کو روک دیا۔ "تمہاری اماں سو رہی ہیں بیٹا! وہ بہت تھکی ہوئی ہیں .... انہیں آرام کرنے دو......... وہ آرام کر رہی ہیں۔"

لیکن اکثر ایسے محسوس ہوتا تھا کہ ابا جھوٹ بول رہے ہیں۔ اماں سوئی ہوئی نہیں ہوتی تھیں، وہ آرام نہیں کر رہی ہوتی تھیں، وہ اکثر دوسرے کمرے سے آتی ہوئی ان کی ہنسی کی ہلکی ہلکی آواز سنتی تھی۔ ہنسی کی یا سرگوشیوں کے ساتھ کوئی دوسری آواز بھی شامل ہوتی تھی۔

"ابا! اماں کے پاس کون ہے؟" ایک دو بار اس نے ابا سے پوچھا۔ "وہ......... اماں کس سے باتیں کر رہی ہیں؟"

"باتیں!" ابا نے ہنس کر کہا۔ "ارے پاگل ہوئی ہو کیا؟ اس گھر میں میرے، تمہارے اور تمہاری اماں کے علاوہ اور کون ہے؟ کیا تم نے کسی اور کو یہاں کبھی دیکھا؟ اماں کے پاس کوئی نہیں ہے بیٹا......... وہ تو سو رہی ہیں .... اپنے کمرے میں۔"

"مگر......... ابا! ابھی کوئی ہنس رہا تھا، شاید اماں ہنس رہی تھیں۔"

"نہیں بیٹا نہیں۔" ابا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ "کوئی بھی نہیں ہے۔ اماں تو سو رہی ہیں۔ کوئی نہیں ہنس رہا ہے۔ سو جاؤ .... سو جاؤ .... شاباش۔" اور وہ آہستہ آہستہ اسے تھپکنے لگتے، گلنار سو جاتی۔

گلنار نے ابا کو کبھی کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ بازار سے سودا سلف لے آتے تھے اور بس۔ جس طرح اسکول میں رہنے والے دوسرے بچوں کے باپ دفتر جاتے تھے، کاروبار پر جاتے تھے۔ صبح صبح اٹھ کر، تیار ہو کر، کہیں نہ کہیں نکل جاتے تھے۔ گلنار کے ابا ایسا کچھ نہیں کرتے تھے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ابا کام کیا کرتے

ہیں۔ اماں نے اس کو ابا کے بارے میں بس اتنا بتایا تھا کہ کسی دوسرے شہر میں ابا کی بہت سی جائداد ہے، مکان ہیں، دکانیں ہیں، جن کا کافی کرایہ آتا ہے اور وہ لوگ اس سے بڑی آسانی اور آرام کے ساتھ اپنا خرچ چلاتے ہیں۔

لیکن وہ کرایہ کب آتا ہے، کہاں آتا ہے، کس طرح آتا ہے، اس کے بارے میں گلنار کو کچھ نہیں معلوم تھا اور نہ ہی اس نے ابا اور اماں کو کبھی اس قسم کے کرائے کے بارے میں کوئی بات کرتے سنا۔ ان دونوں کی اکثر گفتگو تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی کیونکہ وہ خاص اشارتی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ جو باتیں اس کی سمجھ میں آ جاتی تھیں ان کا تعلق گھر کے روزمرہ کے معاملات اور دیگر امور سے ہوتا تھا۔

اسکول میں اکثر بچے اپنے اپنے باپ کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ کوئی بتاتا کہ اس کے ابا فلاں دفتر میں کام کرتے ہیں، کوئی بتاتا کہ اس کے ابا کا فلاں کاروبار ہے یا دُکان ہے وغیرہ لیکن گلنار کے پاس اپنے باپ کے بارے میں بتانے کے لئے ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ اس کے ابا کی کسی دوسرے شہر میں بہت ساری جائداد ہے اور اس کا کافی کرایہ آتا ہے جس سے ان لوگوں کی گزر بسر ہوتی ہے۔

گلنار کو اپنی ماں کی صورت، دوپہر کو اسکول سے آنے کے بعد ہی نظر آتی اور رات کے اوّل پہر کے بعد سے یہ صورت پھر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتی۔ اماں کھانا کھلانے کے کچھ دیر کے بعد اس کو سلا دیتیں اور پھر رات میں جب بھی اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اماں کو نہیں ابا کو اپنے پاس پاتی۔

وقت گزرتا گیا اور گلنار بڑی ہوتی گئی۔ گھر میں فارغ البالی اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ وہ سب لوگ بہت اچھی طرح سے رہتے سہتے تھے اور گھر میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اچھے سے اچھے کھانے پکتے بلکہ پکتے کم تھے اور بازار سے زیادہ آتے تھے۔ فریج میں دنیا بھر کی نعمتیں بھری رہتی تھیں۔ گھر کی حالت بھی بہت اچھی رہتی تھیں گلنار کے پاس ڈھیروں کپڑے تھے اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ وہ سب کچھ موجود تھا جس کی وہ ذرا سی بھی خواہش رکھتی تھی۔ اس کے پاس اپنی پسند کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

جیسے جیسے گلنار بڑی ہوتی گئی ویسے ویسے، آہستہ آہستہ اس گھر کے اسرار ورموز اس پر منکشف ہوتے گئے۔ کسی نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ یہاں کیا ہوتا ہے، کیا ہو رہا ہے لیکن وہ خود ہی سب کچھ سمجھتی جا رہی تھی۔ وہ وقت سے پہلے جوان ہوتی جا رہی تھی۔ ابا کے منہ سے رات کے وقت آنے والی ایک خاص قسم کی بُو کو وہ جان گئی تھی کہ یہ کس چیز

کی بُو ہے، گو کہ کسی نے اس کے متعلق اس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ راتوں کے سناٹے میں اماں کے کمرے سے آنے والی خفیہ سرگوشیوں، پُراسرار ہنسی اور معنی خیز آوازوں کا مطلب وہ سمجھنے لگی تھی۔

ابا کبھی شہر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ وہ کبھی بھی اس دوسرے شہر کا رخ نہیں کرتے تھے، جہاں ان کی وہ جائداد اور مکانات وغیرہ واقع تھے جس کا بہت سارا کرایہ ان لوگوں کا ذریعہ آمدنی تھا۔

اور اب گلنار کو معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ کرایہ دراصل جائداد اور مکانوں کا نہیں بلکہ کسی اور ہی چیز کا آ رہا تھا اور خوب آ رہا تھا۔

جیسے جیسے گلنار پر ان انکشافات کی تہیں کھلتی گئیں، ویسے ویسے وہ بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ اس ساری صورت حال کو برداشت کرتی گئی۔ اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں مچی، اس کے دماغ میں کوئی طوفان نہیں اٹھا، اس کے وجود میں کوئی گولی، کوئی بم نہیں پھٹا۔ جو کچھ گھر میں ہو رہا تھا وہ اب اس کو سمجھتی جا رہی تھی اور بالکل غیر محسوس طور پر خود بھی ان سارے رازوں کی امین بنتی جا رہی تھی۔

وہ اب ان لوگوں کی جھلک دیکھ سکتی تھی جو رات گہری ہونے کے بعد اس کے گھر میں خاموشی سے داخل ہوتے تھے۔ ابا ان لوگوں کو لے کر آتے تھے اور اماں کے کمرے میں جا کر غائب ہو جاتے تھے۔ ابا واپس اپنے کمرے میں آ جاتے تھے اور الماری میں سے بوتل نکال کر پینا شروع کر دیتے تھے۔ گلنار چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ جاتی اور اس سب کے بارے میں سوچا کرتی جو دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ اس کا ناپختہ تخیل اسے طرح طرح کی تصویریں دکھاتا اور اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا۔

اس وقت گلنار کی عمر کوئی چودہ سال کی تھی اور وہ نویں کلاس میں پڑھ رہی تھی جب وہ واقعہ پیش آیا۔

اماں کے پاس بہت سارے زیورات تھے۔ سونے کے خوبصورت جگمگاتے ہوئے، نفیس زیورات اور وہ برابر ان میں اضافہ کرتی رہتی تھیں۔ ہر دو چار مہینے کے بعد ان کے زیورات کے خزانے میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ یا تو بازار جا کر خود کوئی زیور خرید لاتیں اور یا پھر ان کے پاس رات کے وقت آنے والوں میں سے کوئی ان کے لئے تحفے میں کوئی زیور لاتا۔

اماں کے پاس جو بھی نیا زیور آتا وہ اسے گلنار کو ضرور دکھاتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں۔ بلکہ جب وہ زیور خریدنے کے لئے باہر جاتی تھیں تو اکثر گلنار کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی

تھیں۔ ابا تو شاذ و نادر ہی ان کے ساتھ جاتے تھے۔ گلنار کو نہیں یاد کہ اس نے ان دونوں کو ایک ساتھ کبھی باہر جاتے ہوئے دیکھا ہو۔ سوائے ان دِنوں کے جب ایک بار اماں کافی بیمار ہو گئی تھیں اور ابا انہیں ٹیکسی میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تھے۔

اس شام جبکہ وہ دونوں ماں بیٹیاں گھر میں اکیلی تھیں، اماں حسب معمول سج بن کر اور خوب اچھے کپڑے پہن کر تیار ہوئیں اور اس شام انہوں نے خوب بہت سارے زیور بھی پہنے اور پھر انہوں نے گلنار کو اپنے کمرے میں بلایا۔

گلنار اماں کی سج دھج دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ تو اس وقت بالکل آسمان سے اتری ہوئی کوئی پری معلوم ہو رہی تھیں۔ کس قدر خوبصورت لگ رہی تھیں اماں .... افوہ .... ان کے طرح طرح کے رنگوں سے مزین، جگمگاتے ہوئے اور روشن چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ان کے لباس سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں کس قدر خوبصورت چمک تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں گلنار؟" انہوں نے اپنے کانوں میں سونے کے بھاری بھاری آویزے لٹکاتے ہوئے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"اماں! آپ تو بس اس قدر خوبصورت لگ رہی ہیں .... اس قدر خوبصورت لگ رہی ہیں .... کہ بس..........." گلنار نے ایک عجیب سی سرخوشی کے عالم میں کہا۔ "بہت ہی اچھی اماں بہت ہی اچھی .... اور یہ بُندے .... یہ کتنے بڑے بڑے اور خوبصورت ہیں۔"

"ایک ایک بُندہ دو دو تولے کا ہے۔" اماں نے بڑے فخریہ انداز میں کہا اور قد آدم آئینے کے سامنے اپنے سر کو ایک خاص ادا سے ہلایا۔ گلنار اپنی ماں کی اس ادا پر جیسے قربان ہو گئی۔ اماں کس قدر پیاری لگ رہی تھیں۔

اس رات بھی گلنار معمول کے مطابق سوئی تھی لیکن صبح کو وہ معمول کے مطابق اٹھی نہیں تھی۔

اس کو ابا نے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ وہ صبح تڑکے کا وقت تھا، یہ گلنار کے بیدار ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ تو اس کے کافی دیر کے بعد اٹھتی تھی۔ اتنی جلدی اٹھ کر بھلا کیا کرتی۔

ابا نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی اور وہ ہڑبڑا کر ابا کو دیکھنے لگی۔

"اماں .... تمہاری اماں .... گھر میں نہیں ہیں گلنار!"

پہلے تو گلنار کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ابا کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ سخت بدحواس نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ان کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ وہ گلنار کو یہ اطلاع دے رہے تھے کہ اس کی اماں گھر پر موجود نہیں ہیں اور گلنار فوری طور پر ان کی اس بات کا مطلب نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد ہی گلنار یہ بات سمجھ سکی کہ اس کی اماں گھر سے "بھاگ" گئی ہیں۔

گلنار اس وقت عمر کی اس منزل میں تھی جب وہ کسی لڑکی یا عورت کے "گھر سے بھاگ جانے" کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

اماں گھر سے بھاگ گئی تھیں اور اپنے ساتھ سارا زیور' سارا کیش اور دوسری قیمتی اشیاء بھی لے گئی تھی۔ ابا دیوانوں کی طرح سارے گھر میں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے اور ایک ایک چیز کو ٹٹول ٹٹول کر اور کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ اماں کے کمرے میں الماری میں زیورات کے سارے بکس خالی تھے اور وہ جگہیں بھی خالی تھیں جہاں پیسے رکھے جاتے تھے۔ اماں کے زیادہ تر قیمتی اور اعلیٰ درجے کے ملبوسات بھی غائب تھے۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا .... مجھے پہلے شبہ تھا.........." ابا جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بڑبڑا رہے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ یہ الفاظ دہرا رہے تھے۔ "اس حرام زادے کی نیت ٹھیک نہیں تھی' شروع سے ہی ٹھیک نہیں تھی .... اور .... وہ حرافہ .... مجھے پہلے ہی شبہ تھا.........."

اس دن کے بعد سے اماں کا پھر کبھی کوئی پتہ نشان نہیں ملا' معلوم نہیں وہ زندہ بھی تھیں یا مر کھپ گئیں۔ بہرحال گلنار نے انہیں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اماں کے فرار کا واقعہ ایک ایسی بات نہیں تھی جسے چھپایا جا سکتا۔ اماں کئی لاکھ روپے کے زیورات' بھاری رقم نقد اور بہت سی قیمتی اشیاء لے کر گھر سے فرار ہو گئی تھیں۔ ابا بالکل قلاش ہو گئے تھے۔ اماں نے تو گھر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ ابا اپنے سر کے بال نوچتے تھے اور دیواروں سے سر ٹکراتے تھے۔ گلنار ان کو سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی۔ ابا نے اس سلسلے میں تھانے میں رپورٹ درج کرا دی اور یوں سارے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گئی۔

گلنار کو اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ ابا نے اماں کے بارے میں تفصیلی رپورٹ کیا درج کروائی ہے۔ اس کو تو بس یہ معلوم تھا کہ ابا نے یہ رپورٹ درج کروائی ہے کہ اماں

گھر سے بھاگتے وقت سارا زیور اور ساری نقدی اور قیمتی اشیاء اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔

اماں کس کے ساتھ بھاگی ہیں' یہ گلنار کو نہیں معلوم تھا اور نہ ہی ابا نے اسے اس بارے میں کچھ بتایا تھا۔

اس واقعے کے بعد ان دونوں کے لئے اس محلے میں رہنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ گلنار اس واقعے کے بعد محض چند ہی روز اسکول جا سکی اور پھر ابا نے خود ہی اس کو اسکول جانے سے روک دیا کیونکہ وہ اب یہ محلّہ چھوڑ رہے تھے۔ ویسے بھی' گلنار کے لئے اب اسکول جانا ایک بے حد ناخوشگوار عمل بن چکا تھا۔ اسکول میں ساری لڑکیوں کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اس کی ماں گھر سے بھاگ گئی ہے اور لڑکیاں اس کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتیں۔ اس پر انگلیاں اٹھاتیں اور اس کو دیکھ کر آپس میں معنی خیز اور پُراسرار انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔ گلنار کو یہ سب کچھ دیکھ کر بہت شرم آتی اور وہ جلدی سے نظریں جھکا کر وہاں سے چلی جاتی۔ اکثر لڑکیاں تو ایسی ڈھیٹ تھیں کہ اس سے اس بارے میں براہ راست سوال بھی کرتیں۔ گلنار سخت پریشان ہو جاتی۔ اس کو سمجھ میں نہ آتا کہ وہ ان کو کیا جواب دے۔

اس نے ابا سے جب یہ ساری باتیں کہیں تو انہوں نے اگلے ہی دن سے اس کا اسکول جانا بند کروا دیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ لوگ اس محلے سے چلے گئے۔ ابا نے ایک دوسرے علاقے میں کرائے کا مکان لے لیا اور گلنار کو ایک دوسرے اسکول میں داخل کروا دیا۔

اس کے بعد گزرنے والے دو سال کے مختصر سے عرصے میں ابا گھر کا خرچ اس رقم چلاتے رہے جو ان کے اپنے نام سے بینک میں جمع تھی۔ ابا نے بتایا تھا کہ ان کے اور اماں کے مشترکہ اکاؤنٹ میں جتنی رقم تھی وہ اماں نے پہلے ہی چپکے چپکے نکلوالی تھی۔ کچھ رقم ایسی تھی جو صرف ابا کے اکاؤنٹ میں تھی۔

دو سال کے بعد گلنار نے میٹرک کر لیا اور جس دن اس نے میٹرک کیا اسی رات اس کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ وہی زندگی تھی جو اس کی ماں' اپنے شوہر کی سرپرستی میں اس کے ایما اور منشا کے مطابق بسر کرتی رہی تھی اور اب گلنار اپنے باپ کی سرپرستی میں اس کے ایما اور منشا کے مطابق یہی زندگی بسر کرنے جا رہی تھی۔

اس روز دن میں ہی ابا نے اس کو بتا دیا تھا کہ شام کو ایک مہمان آئیں گے جو رات بھر یہاں قیام کریں گے۔

"بڑے مالدار ہیں' معزز' اونچے اور بہت بڑے آدمی ہیں۔" ابا نے گلنار کو بتایا۔

"ان کو ناراض مت کرنا بیٹی! ان کو خوش کرنا۔ ہم اگر ان کو خوش کریں گے تو ہمارے بہت کام آئیں گے اور تمہیں .... تمہیں تو وہ سونے میں تول دیں گے سونے میں .... بس' ان کو خوش کر دینا۔"

ابا جو کچھ کہہ رہے تھے' گلنار اس کو خوب سمجھ رہی تھی اور وہ ابا کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ اب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی ماں کون تھی' کیا کرتی تھی اور اس کے ابا کون تھے اور کیا کرتے تھے اور راتوں کی تاریکیوں میں اماں کے کمرے میں جو ہوتا تھا' جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کی حقیقت سے وہ اب خوب واقف تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ابا یہی سب کچھ چاہتے تھے' سب کچھ ان ہی کی مرضی سے تو ہوتا تھا۔ وہ اب یہ بھی جانتی تھی کہ ابا کی کوئی جائداد' کوئی پراپرٹی' کسی دوسرے شہر میں نہیں تھی۔ انہیں کسی چیز کا کرایہ نہیں ملتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ۔سارے حقائق اس پر خود بخود روشن ہوتے جا رہے تھے۔

اور اب ابا اس سے بھی وہی چاہتے تھے جو انہوں نے اماں سے چاہا تھا اور جو اماں کرتی رہی تھیں اور پھر ایک دن ابا کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل گئی تھیں۔ سارا زیور اور نقدی سمیٹ کر.......... لیکن وہ صرف ابا کی زندگی سے نہیں نکلی تھیں' وہ تو خود گلنار کی زندگی سے بھی نکل گئی تھیں۔ اس شام کے بعد سے گلنار نے پھر انہیں کبھی نہیں دیکھا۔

ابا اسے آنے والے مہمان کے بارے میں بتاتے رہے اور جس حد تک زبان اور الفاظ یاوری کر سکتے تھے وہ اس کو ہدایات دے رہے تھے اور اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔

مہمان کے سامنے پہن کر جانے کے لئے وہ ایک خصوصی لباس بھی اس کے لئے بازار سے خرید کر لائے تھے اور جب گلنار نے وہ لباس پہنا تھا تو پہلے پہل تو وہ خود ہی اپنے آپ سے بھی شرما گئی تھی اور اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔

شام کو مہمان آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا بہت سامان لے کر آیا تھا۔ بے حد عمدہ اور لذیذ کھانے تھے جو کراچی کے کسی بہت بڑے ہوٹل سے تیار کروا کے لائے گئے تھے۔ کھانا ان تینوں نے ایک ساتھ کھایا۔ اس کے بعد ابا تو گلنار سے یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئے کہ وہ اب مہمان کا خیال رکھے اور وہ اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔

گلنار کو معلوم تھا کہ ابا اب کیا کریں گے۔ جب اماں ساتھ تھیں تب بھی وہ یہی

کرتے تھے اور جب اماں چلی گئی تھیں تب بھی ان کا معمول نہیں بدلا تھا۔ رات کے کھانے کے کچھ دیر کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے اور الماری کھول کر شراب کی بوتل نکال لیتے تھے اور اس کے بعد وہ اپنے آپ کو اس میں غرق کر دیتے تھے۔

مہمان کوئی پچاس سالہ آدمی تھا۔ خوب کھایا پیا' موٹا' مسٹنڈا توانا.......... اس کے دونوں گال بے حد چکنے تھے اور خوب چمک رہے تھے۔ اس کا قد چھوٹا اور جسم بہت گٹھیلا تھا۔

مہمان نے گلنار کو سونے کا ایک ہار دیا اور گلنار خوشی سے جیسے پاگل ہو گئی۔ اس نے آج تک سونے کا ہار نہیں پہنا تھا۔ اماں کے پاس تو سونے کے بہت سے ہار تھے اور وہ اکثر ان کو پہنتی تھیں لیکن وہ تو سب کچھ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھیں۔ انہوں نے تو گلنار کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ ایک چاندی کا چھلا تک انہوں نے گلنار کے لئے نہیں چھوڑا تھا اور اب پہلی بار گلنار کو سونے کا خوبصورت ہار مل رہا تھا اور ابا نے کہا تھا کہ مہمان کو ناراض نہیں کرنا ہے۔ اسے خوش کرنا ہے اور اماں بھی .... اماں بھی یہی کرتی تھیں۔

گلنار نے مہمان کو ناراض نہیں کیا۔ اس نے اس کا پورا پورا خیال رکھا اور اسے وہ ساری خوشی فراہم کی جس کی آرزو لے کر وہ یہاں آیا تھا۔

صبح جب مہمان گھر سے رخصت ہوا تو گلنار سو رہی تھی اور ابا جاگ رہے تھے۔

گلنار کی نئی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اماں کے کمرے کے سارے اسرار و رموز اس پر عملی طور پر منکشف ہو چکے تھے اور ایک ہی رات میں چند ساعتوں کے اندر اندر وہ زندگی کے اس روپ سے پوری طرح واقف ہو چکی تھی۔ سارے حجابات ٹوٹ چکے تھے۔ وہ اب ایک کنواری لڑکی نہیں تھی' وہ ایک مرد آشنا عورت تھی۔

وہ مہمان برابر کئی دن تک آتا رہا اور اس نے گلنار کو طرح طرح کے تحفوں سے لاد دیا۔ ہر رات وہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی نئی چیز لے کر آتا تھا اور وہ بھی بے حد قیمتی۔

ابا نے مہمان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اسے بتایا تھا "بہت بڑا آدمی ہے بیٹا! اس کی روزانہ کمائی کم سے کم سات آٹھ ہزار روپے اوسطاً ہے۔ سرکاری افسر ہے۔ سینکڑوں لوگوں کے کام اٹکتے ہیں اس سے۔"

لیکن گلنار کو اس بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ اس نے اس شخص کے لئے اپنے دل میں کوئی خوبصورت جذبہ محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے تو بس ان تحفوں سے دلچسپی تھی جو وہ شخص اس کے لئے لاتا تھا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد وہ شخص اچانک غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرے شخص نے لے لی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ایک تیسرا شخص آیا.......... پھر کوئی اور .... اور پھر کوئی اور .... یہاں تک کہ ایک سلسلہ قائم ہو گیا اور اس طویل سلسلے میں' نئے ''مہمانوں'' کی آمد کے ساتھ ساتھ پرانے مہمانوں کی آمد کا اعادہ بھی ہوتا رہتا تھا۔

گلنار مکمل طور پر اپنی ماں کی جگہ لے چکی تھی۔ باپ بیٹی دونوں زبردست خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ گھر میں ہر چیز کی ریل پیل تھی۔ پیسے کی فراوانی تھی۔ طرح طرح کی اشیاء سے گھر بھرا ہوا تھا۔ ابا کی صحت پچھلے برسوں کے دوران کافی گر گئی تھی لیکن اب تو وہ خوب صحت مند ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان پر نئے سرے سے جوانی آ رہی ہو۔

وقت گزرتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ گلنار کے پاس اب ڈھیروں سونے کے زیورات تھے' کیش تھا' طرح طرح کی قیمتی اشیاء تھیں اور اسے دنیا کا کوئی غم نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتی اور اسے اپنی ماں سخت احمق نظر آتی۔ بھلا جب اس قدر عیش آرام میسر تھا' اتنی اچھی زندگی گزر رہی تھی تو پھر بھاگ جانے کی کیا ضرورت تھی؟

ان گزرنے والے برسوں کے دوران گلنار ایک سادہ لوح' ناتجربہ کار اور نو آموز لڑکی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور خرانٹ قسم کی عورت بن چکی تھی۔ وہ اپنی ہی جیسی بہت ساری عورتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ ان کے ساتھ اس کے مراسم تھے۔ وہ ان بہت سے اڈوں سے بھی واقف ہو گئی تھی جہاں یہ کاروبار بڑے پیمانے پر پولیس اور انتظامیہ وغیرہ کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ وہ ان اڈوں پر اکثر آتی جاتی بھی تھی اور اس نے اکثر ان کے لئے ''کام'' بھی کیا تھا۔ وہ بالکل غیر محسوس طور پر اس زیر زمین دنیا کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ ابا نے اسے جو راستہ دکھایا تھا اس پر وہ بہت آگے تک جا چکی تھی۔

پھر ایک دن ابا اچانک مر گئے۔

ان کی صحت تو بہت عمدہ تھی' خوب کھاتے پیتے تھے اور موٹے تازے تندرست و توانا تھے۔ ان کے مرنے کے تو دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ بڑے عجیب انداز میں مرے۔ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک گر پڑے۔ گلنار سامنے ہی موجود تھی۔ اس نے صاف طور سے دیکھا کہ ابا کو کسی چیز سے بھی ٹھوکر نہیں لگی تھی' وہ بس چلتے چلتے' خود ہی' ایک دم گر پڑے تھے' جیسے

کوئی آدمی چلتے چلتے اچانک بیٹھ جائے۔ ایسا ہی کچھ ابا کے ساتھ ہوا تھا اور وہ گر گئے تھے۔ اس کے بعد وہ کبھی نہیں اٹھ سکے۔ پھر تو انہیں کاندھوں پر ہی اٹھایا گیا تھا۔

ابا کی موت نے گلنار کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی زندگی میں ابا کا ہی سب سے زیادہ دخل تھا۔ جو کچھ تھے وہ ابا ہی تھے۔ کتنا آرام تھا ابا کی ذات سے۔ وہ سارے کام ابا کے سپرد کر کے کس طرح نچنت ہو جاتی تھی۔ گاہکوں سے رقم ابا ہی وصول کرتے تھے اور وہی اس رقم کو ان دونوں کے مشترکہ اکاؤنٹ میں بینک میں جمع کراتے تھے۔ گاہکوں کی بوقت ضرورت خاطر تواضع وغیرہ کا بندوبست وہی کرتے تھے۔ گھر کے سارے کام بھی وہی کرتے تھے۔ پولیس والوں کو بھی وہی راضی کرتے تھے اور ان کے ساتھ لین دین وہی کرتے تھے۔ گلنار کو تو ان کی موجودگی میں گھر کے کسی بھی کام کے بارے میں سوچنا نہیں پڑتا تھا اور اب ان کی موت کے بعد تو اس پر کاموں کا اتنا بوجھ آن پڑا تھا کہ وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس کو بھلا ان سارے کاموں کی عادت کہاں تھی۔

جلد ہی وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ اس طرح اکیلے ابا کے بغیر دھندہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ابا دھندے میں اس کے برابر کے مددگار تھے۔ انہوں نے تو اس کو ہر فکر سے بے نیاز کر دیا تھا اور وہ اپنی زیادہ تر توجہ دھندے پر رکھتی تھی اور اب جبکہ ابا نہیں تھے تو اس کو ان زبردست مشکلات کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ تنہا رہ کر دھندہ نہیں کرے گی۔ اس میں تحفظ کا احساس باقی نہیں رہتا تھا۔ آدمی ہر وقت اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتا تھا۔ اس نے کسی باقاعدہ اڈے میں شامل ہو جانے کا فیصلہ کیا۔

وہ کراچی کے مختلف علاقوں میں چلنے والے بہت سارے خفیہ قحبہ خانوں کے بارے میں جانتی تھی اور وہ ان میں سے کسی میں بھی شامل ہو سکتی تھی۔ وہ جوان تھی' بے حد خوبصورت تھی' ایک پُرکشش شخصیت کی حامل تھی اور کسی بھی اڈے کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے وزیر بیگم کے اڈے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وزیر بیگم کا اڈہ کے ڈی اے اسکیم نمبر ون کے ایک خوبصورت اور وسیع بنگلے میں واقع تھا اور نہایت شاندار قسم کا اڈہ تھا۔ صرف وہی لوگ اس اڈے کا رخ کرنے کی جرأت کر سکتے تھے جن کی روزانہ آمدنی کئی ہزار روپے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اسمگلروں' رشوت خور سرکاری افسروں' چور بازاری کرنے والوں' منافع خوروں' وڈیروں' جاگیرداروں اور

طرح طرح کے بدمعاشوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے اور یہی وہ لوگ تھے جو اس شہر کے اڈوں کو مکمل قانونی تحفظ فراہم کرتے تھے اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس قسم کے اڈوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ دیکھنے والے کی آنکھیں نکال لی جاتی تھیں۔

وزیر بیگم گوجرانوالہ کی رہنے والی تھی لیکن گزشتہ پچیس سال سے کراچی میں مقیم تھی۔ اس کی عمر اس وقت کوئی پچاس سال ہو گی اور پچھلے بیس برسوں سے وہ اڈہ چلا رہی تھی۔

گلنار اسے بہت اچھی طرح جانتی تھی اور اکثر اس سے ملاقات کرتی تھی۔ وزیر بیگم ایک بہت طاقتور اور بارسوخ عورت تھی۔ اس کی حکام میں بہت اوپر تک پہنچ تھی اور اس کے اڈے کی جانب کوئی نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ مکمل طور پر ایک محفوظ جگہ تھی۔

وزیر بیگم نے اس سے پہلے بھی ایک آدھ بار گلنار کو پیشکش کی تھی کہ وہ الگ دھندہ کرنے کے بجائے اس کے پاس چلی آئے اور اس کے اڈے پر رہ کر ہی دھندہ کرے۔ اس نے اس کو مکمل تحفظ کے ساتھ ساتھ بہترین شرائط بھی پیش کی تھیں۔

"میں نے اپنے اڈے کی کسی بھی لڑکی کو اتنی مراعات نہیں دی ہیں، جتنی مراعات کی پیشکش میں تم کو کر رہی ہوں۔" وزیر بیگم نے اس سے کہا تھا۔ "اور .... وہ اس لئے کہ تم واقعی اس کی مستحق ہو۔ تم بہت ہی خوبصورت اور پیاری لڑکی ہو۔ میرے اڈے پر آؤ گی تو اس سے میرے اڈے کو فائدہ ہی پہنچے گا، نقصان نہیں ہو گا۔"

لیکن گلنار نے اس وقت وزیر بیگم کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ ابا بھی تو ساتھ تھے۔ اگر وہ وزیر بیگم کے اڈے پر چلی آتی تو پھر ابا کیا کرتے، کیا وہ اکیلے رہتے؟ یہ تو بہت مشکل تھا۔ ابا تو اس کی زندگی میں اس طرح شامل تھے کہ ان سے علیحدہ رہنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اب جبکہ ابا موجود نہیں تھے تو وہ وزیر بیگم کی پیشکش پر غور کر سکتی تھی۔ اس نے وزیر بیگم سے بات کی اور وزیر بیگم تو فوراً ہی اس کے لئے تیار ہو گئی۔

'چنانچہ گلنار کے ڈی اے اسکیم نمبر ون میں واقع، وزیر بیگم کے جدید ترین طرز کے قحبہ خانے میں اٹھ آئی جو ایک شاندار کوٹھی میں واقع تھا جس کے اندر قدم رکھنے کے لئے گاہک کا نوٹوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہونا ضروری تھا۔

اس طرح گلنار کی زندگی کے اس نئے مرحلے کا آغاز ہوا۔ یہاں (وہ اکیلی نہیں تھی، یہاں اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری لڑکیاں تھیں اور ان میں سے اکثر گلنار کے مقابلے

میں کافی کم عمر بھی تھیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ گلنار ان میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی اور اس کو یہ حُسن و جمال اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا جو اب مفقود الخبر تھی۔

وزیر بیگم کے اڈے پر گلنار کے دن بہت اچھی طرح گزرنے لگے۔ اس کے اور وزیر بیگم کے درمیان جو شرائط طے پائی تھیں وزیر بیگم ان شرائط کی پوری طرح پابندی کرتی تھی اور صاف کہتی تھی کہ وہ کاروبار میں کسی قسم کی بددیانتی کی قائل نہیں ہے۔

وزیر بیگم معاملات کی بہت کھری عورت تھی اور کاروباری معاملات میں وہ واقعی بالکل ایماندار تھی۔

گلنار وہاں بہت خوش اور مطمئن تھی۔ بالکل ٹھیک ٹھاک کام چل رہا تھا اور اس کے پاس کافی رقم جمع ہو چکی تھی۔ زیورات اور قیمتی اشیاء کی بھی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔

وزیر بیگم کے مکان پر آنے جانے والوں میں بدر الحسن نامی ایک نوجوان بزنس مین بھی شامل تھا۔ بدر الحسن کا باپ کراچی میں کئی ہوٹلوں، فیکٹریوں اور ایکسپورٹ امپورٹ کے بہت بڑے کاروبار کا مالک تھا، ارب پتی آدمی تھا۔ ابھی پچھلے دنوں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ بدر الحسن اس کا واحد بیٹا تھا اور اب اس سارے کاروبار وغیرہ کا وہی مالک تھا۔ باپ کی زندگی میں ہی وہ کاروبار کے بڑے حصے کو سنبھالے ہوئے تھا اور برابر سے باپ کے کام میں شریک رہتا تھا۔ چنانچہ باپ کے مرنے کے بعد اسے کوئی خاص دقت نہیں ہوئی اور اس نے سارا کاروبار اطمینان سے سنبھال لیا۔ باپ کی موت کے کوئی چھ ماہ کے بعد بدر الحسن نے غیر ملکی دورے کا پروگرام بنایا۔ وہ کوئی تین ماہ کے لئے امریکہ، یورپ اور مشرق بعید کے ممالک کے طویل دورے پر جانا چاہتا تھا۔ اس دورے کے دوران اسے مختلف ممالک میں بہت سارے کاروباری امور سرانجام دینے تھے۔ کراچی کے کاروبار کی اسے کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ یہاں اس کے اعتماد کے لوگ موجود تھے جو سب کچھ بطریق احسن سنبھال سکتے تھے۔

بدر الحسن اپنے اس سفر کو خوشگوار اور پُرلطف بنانے کی غرض سے کراچی سے کسی خوبصورت لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا، اپنے خرچ پر، بظاہر اپنی سیکرٹری کی شکل میں اور اس کے لئے معقول معاوضہ بھی ادا کرنے کو تیار تھا۔

وہ گلنار کے پرستاروں میں سے ایک تھا اور اس نے گلنار کو پیشکش کی کہ وہ تین ماہ

کے اس غیر ملکی دورے میں اس کے ساتھ چلے۔

گلنار کبھی کراچی سے باہر نہیں نکلی تھی اور غیر ملکی سفر کی پیشکش کے بارے میں سن کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی لیکن وہ کوئی گھاٹے کا سودا کرنے والی عورت نہیں تھی۔ اسے اس دھندے میں آئے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی سی' ناتجربہ کار لڑکی نہیں تھی بلکہ ایک چالاک اور ہوشیار عورت تھی جسے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا خوب آتا تھا۔

"اس کے لئے تم کو آپا سے پوچھنا پڑے گا۔" اس نے وزیر بیگم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ اڈے میں وزیر بیگم "آپا" کہلاتی تھی۔ ساری لڑکیاں اس کو یہی کہتی تھیں۔

اور قبل اس کے کہ بدرالحسن "آپا" سے بات کر سکے گلنار نے خود ہی وزیر بیگم کو اس کی پیشکش کے بارے میں بتا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ بدرالحسن کے ساتھ باہر جانے کی خواہشمند ہے۔

"ضرور جاؤ۔" وزیر بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خوب گھومو پھرو' عیش کرو اس سالے کے پیسے پر لیکن ایک کام یہ کرو کہ اس سے اپنی تین مہینے کی اوسط کمائی کے برابر رقم پہلے ہی وصول کر لو اور اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا جاؤ۔ باقی ساتھ جانے کی فیس کی بات الگ ہو گی۔"

"تم اس سے خود ہی بات کر لو آپا!" گلنار نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے اسی لئے تو اس سے کہا ہے کہ تم سے بات کر لے تاکہ تم کھل کر اس سے ساری بات کر سکو۔"

"میں سمجھ گئی۔" وزیر بیگم نے ہنس کر کہا۔ "فکر مت کرو' وہ حرامزادہ بہت زیادہ دولت مند ہے۔ اس سے تو جتنا بھی مال نکلوا لو' کم ہے۔ اس نے تو ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکیٹ کے ذریعے کروڑوں' اربوں کمائے ہیں اور آج بھی کما رہا ہے۔ دس پانچ لاکھ اگر اس طرف پھینک دے گا تو کنجر کی اولاد کوئی غریب نہیں ہو جائے گا۔ لوٹو سالوں کو.......... خوب لوٹو۔"

بدرالحسن نے جب وزیر بیگم سے اس معاملے کے متعلق بات کی تو وزیر بیگم نے اس کے سامنے وہ شرائط رکھ دیں جن کے بارے میں اس نے گلنار سے بات کی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق' بدرالحسن نے ساری شرائط ہنسی خوشی منظور کر لیں۔

"بدرالحسن! تم باہر کے ملکوں میں جا رہے ہو۔" وزیر بیگم نے اس سے پوچھا۔ "وہاں تمہیں لڑکیوں کی کون سی کمی ہو گی؟ جس طرح کی لڑکی چاہو گے' مل جائے گی

.... تمہارے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا دی جائے گی۔ پھر تم یہاں کراچی سے اپنے ساتھ کسی کو کیوں لے جانا چاہتے ہو؟"

"ارے آپا! آپ نے ٹھیک کہا۔" بدرالحسن نے مسکرا کر کہا۔ "باہر کے ملکوں میں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے' بہت مل جائیں گی لیکن اپنی چیز کی بات ہی اور ہوتی ہے آپا! اپنے شہر کی کوئی لڑکی اپنے ساتھ ہو گی تو وہ اور بھی بہت سی چیزوں کا خیال رکھے گی اور اس کی رفاقت میں تنہائی اور اجنبیت کا احساس کم ہو جائے گا' دل بہلا رہے گا۔ ورنہ راتیں گزارنے کے لئے تو لڑکیوں کی وہاں کوئی کمی نہیں ہے۔"

"ہاں تمہاری یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے۔" وزیر بیگم نے کہا۔ "اپنے پہچان والے لوگوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ وہ جو تمہارے ساتھ جائے گی وہ تمہارا خیال رکھے گی' تم اس کا خیال رکھو گے۔ باہر کی لڑکیوں کو بھلا تم سے کیا دلچسپی ہو گی؟"

سارے معاملات طے پا گئے۔ بدرالحسن کے ساتھ جو مجموعی رقم طے ہوئی تھی وہ اس نے پیشگی ادا کر دی اور گلنار نے وزیر بیگم کا کمیشن اس کے حوالے کرنے کے بعد باقی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی اور سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اڈے کی ساری لڑکیاں گلنار پر رشک کر رہی تھیں۔ تقریباً سبھی لڑکیوں کی خواہش تھی کہ بدرالحسن اپنے طویل غیر ملکی سفر میں انہیں اپنے ساتھ لے جاتا' تاکہ انہیں مفت میں دنیا کی سیر کرنے کا موقع ملتا لیکن بدرالحسن نے تو گلنار کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اسے وہی سب سے زیادہ اچھی لگی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد گلنار اور بدرالحسن تین ماہ کے غیر ملکی سفر پر روانہ ہو گئے۔ گلنار' بدرالحسن کے دفتر کے ایک ملازم کی حیثیت سے بدرالحسن کی پرسنل سیکرٹری کے طور پر اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ گلنار کا یہ پہلا سفر تھا اور اس کی خوشی اور ہیجان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

وہ لوگ سب سے پہلے امریکہ اور کینیڈا گئے۔ گلنار نے پہلی بار ایک دوسری دنیا دیکھی' ایک ایسی دنیا جو اس کے تصورات سے بالکل مختلف تھی۔

انہوں نے تقریباً ایک مہینہ امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں گزارا۔ اس دوران بدرالحسن کی کچھ کاروباری مصروفیات بھی رہیں لیکن اصل میں تو وہ دونوں سیر و تفریح میں زیادہ مصروف رہے لیکن سیر و تفریح میں وہ دونوں اکٹھا شامل نہیں تھے۔ بدرالحسن نے کئی راتیں گلنار سے الگ رہ کر بھی گزاریں اور گلنار کو اس بات کی شکایت

کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اسے تو اس کی پرواہ بھی نہیں تھی، وہ کون سی بدرالحسن کی بیاہتا بیوی تھی۔

اگلا مہینہ یورپ میں اور اس سے اگلا مہینہ ان دونوں نے مشرق بعید کے ممالک میں گزارا۔ وطن واپسی میں صرف تین دن باقی تھے اور اس وقت وہ لوگ جاپان کے شہر ٹوکیو میں تھے جب اچانک اس رات گلنار کی طبیعت خراب ہو گئی، اسے فوراً ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

چند ہی گھنٹوں کے بعد بدرالحسن کو "یہ خوشخبری" سنائی گئی کہ اس کی پرسنل سیکرٹری ماں بننے والی ہے۔ خود گلنار کو بھی اس امر کی اطلاع دے دی گئی اور اسے ہسپتال سے رخصت کر کے اس کے ہوٹل بھیج دیا گیا۔ اسے ہسپتال میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"اب تم کراچی چل کر اس سلسلے میں جو کارروائی مناسب سمجھو سو کرنا۔" بدرالحسن نے گلنار سے کہا۔ "تین دن بعد ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں اور ہمیں یہاں کسی الجھن کو دعوت نہیں دینی چاہئے .... اور .... جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو اس کی فکر مت کرنا .... میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ تم اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلوا دو۔"

"تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے بچے کی ماں بنوں؟" گلنار نے آہستہ سے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔" بدرالحسن نے گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "اور میں یہ بات تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تم اس سلسلے میں مجھ پر کبھی کوئی دعویٰ نہ کرنا۔ میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں .... اور وہی بچے میرے قانونی اور جائز بچے کہلائیں گے اور میری وراثت میں شریک ہوں گے جو میری بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوں گے۔"

"جانتی ہوں۔" گلنار نے کہا۔ "اطمینان رکھو میں تمہارے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کروں گی۔"

وہ دونوں چند روز کے بعد کراچی واپس آ گئے اور یہاں پہنچتے ہی گلنار نے وزیر بیگم کو اپنے حاملہ ہونے کے بارے میں بتاتے ہوئے اس سے مشورہ طلب کیا۔ وزیر بیگم بہرحال عمر میں اس سے دوگنی اور ایک بے حد تجربہ کار اور ہوشیار عورت تھی۔

"تمہاری عمر اب اندازاً کیا ہو گی گلنار؟" وزیر بیگم نے اس سے پوچھا۔ "میرا

مطلب ہے، تمہاری اصلی عمر؟"

"میں تم کو بالکل ٹھیک بتا سکتی ہوں آپا!" گلنار نے کہا۔ "اب چھ ماہ بعد فروری کی چودہ تاریخ میں پورے تیس سال کی ہو جاؤں گی۔"

"بس تو پھر اس بچے کو دنیا میں آنے سے مت روکو۔" وزیر بیگم نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "سنو .... ہم جیسی عورتوں کے شوہر تو ہوتے نہیں۔ جن کی رفاقت میں ہم زندگی کے سفر کی آخری منزلیں طے کر سکیں اور رفاقت اور سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تو بڑھاپے میں ہی ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سارے یار غائب ہو جاتے ہیں اور کوئی ہماری شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا .... تب ضرورت ہوتی ہے کسی سہارے کی۔ اس سہارے کو ابھی سے تیار کرنا شروع کر دو۔ تمہاری عمر تیس سال کی ہو رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ بارہ پندرہ سال تک اور تم دھندہ کر سکو گی لیکن وہ بھی اس طرح کہ تمہارے گاہک بھی کم ہوتے جائیں گے اور تمہارا ریٹ بھی گرتا جائے گا۔ مارکیٹ میں نئی نئی لڑکیوں کی بھرمار ہو گی، کم سن، نو عمر، نوخیز، خوبصورت .... پھر بھلا چالیس بیالیس سال کی ڈھلتی ہوئی عمر کی عورت کو کون پوچھے گا؟ کیوں پوچھے گا؟ اور اس کے بعد اس سے آگے تو کچھ بھی نہیں ہے .... پھر تو صرف تنہائی ہے .... ہر رنڈی کو میری طرح نائکہ بننے کا موقع نہیں مل جاتا۔ اس لئے گلنار! آنے والے وقت میں تمہیں ایک سہارے کی ضرورت ہو گی۔ بدرالحسن پر تو لعنت بھیجو۔ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بچہ بدرالحسن کی نہیں تمہاری ضرورت ہے .... اگر لڑکی ہوئی تو تمہارے مزے ہی مزے ہیں۔ جس طرح تم نے اپنی ماں کے کاروبار کو جاری رکھا اور اسے آگے بڑھایا اسی طرح وہ بھی کرے گی اور اگر لڑکا ہوا تو پھر اس کے بارے میں سوچیں گے۔ پھر اسے اس جگہ سے دور رکھنا پڑے گا۔"

گلنار بڑے غور سے وزیر بیگم کی باتیں سن رہی تھی اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سیدھا اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

"آپا! اگر لڑکی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر لڑکا ہوا تو پھر .... پھر اس کا کیا کریں گے؟"

"تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟" وزیر بیگم نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اگر لڑکا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے بڑے ہونے تک تمہارا یہ دھندہ بالکل اور ہمیشہ کے لئے ختم، لڑکے کو شروع ہی سے اپنے سے الگ رکھنا۔ کسی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروا دینا۔

میں اس سلسلے میں تمہاری ہرممکنہ مدد کروں گی۔ اس کے بڑے ہونے تک تم یہ جگہ چھوڑ دینا۔ پھر اس جگہ کو بھی تمہاری ضرورت نہیں رہے گی۔ پیسے کی تمہارے پاس کوئی کمی نہیں ہو گی۔ ٹھاٹھ سے رہنا' بیٹے کو پڑھانا لکھانا' بڑا آدمی بنانا اور پھر کسی شریف زادی سے اس کی شادی کر دینا۔ جب آدمی کے پاس دولت ہو تو پھر حسب نسب کوئی نہیں دیکھتا اور پھر کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

وزیر بیگم کی باتوں میں اس کے طویل ماہ و سال کا تجربہ شامل تھا اور اس کے مشوروں میں گلنار کے لئے گہری ہمدردی تھی۔ اس نے وزیر بیگم کی بات مان لی۔

"اور ایک آخری بات اور۔" وزیر بیگم نے اس سے کہا۔ "آنے والے دنوں کے دوران تم دھندہ کرنے کے قابل نہیں رہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس میں سراسر تمہارا مالی نقصان ہو گا۔ اس حرام کی اولاد کو فون کرو۔ اس سے کہو کہ اتنے دنوں کے نقصان کی تلافی کرے' رقم کا حساب لگا کر اس سے مطالبہ کرو کہ اتنی رقم ادا کر دے ورنہ تم ساری دنیا کو بتا دو گی کہ تمہارے پیٹ میں اس کا بچہ پل رہا ہے۔ بخشو مت حرامزادوں کو' ان کی تو کھال تک اتار لو۔"

گلنار نے وزیر بیگم کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بدرالحسن کو فون کیا اور اس کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ دیا۔

"میں تم کو اس سے دوگنی رقم دینے کے لئے تیار ہوں۔" بدرالحسن نے کہا۔ "بشرطیکہ تم .... اس قصے کو ختم کر دو.........."

"نہیں بدرالحسن!" گلنار نے سختی کے ساتھ انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایسا نہیں کروں گی' میں اس میں جان کا خطرہ محسوس کرتی ہوں اور میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ اس بچے کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔"

"خطرہ وطرہ کچھ نہیں ہے۔" بدرالحسن نے جھلا کر کہا۔ "تم خواہ مخواہ باتیں کر رہی ہو۔ میری بات مان لو اور.........."

لیکن گلنار نے اس کی بات نہیں مانی اور بدرالحسن نے اس کو مطلوبہ رقم ادا کر دی۔ ساتھ ہی اس نے اس سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ اس معاملے کو مکمل طور پر خفیہ رکھے گی اور اس کے بارے میں کسی کو کبھی کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا۔

وقت گزرتا گیا اور بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا جب گلنار نے ایک اعلیٰ درجے کے میٹرنٹی ہوم میں ایک خوبصورت اور تندرست بچی کو جنم دیا۔ اس میٹرنٹی ہوم میں اس نے

اپنا رجسٹریشن مسز گلنار بدرالحسن کے نام سے کروایا تھا اور میٹرنٹی ہوم کے ریکارڈ میں بچی کے والد کا نام بدرالحسن ہی لکھا گیا۔

گلنار کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ بار بار اس بات کو سوچ سوچ کر دہلتی رہتی تھی اگر بیٹا پیدا ہوا تو کیا ہو گا۔ ہر مرد اس کے ابا مرحوم کی طرح تو نہیں ہوتا۔ وہ اخبارات میں ایسے کتنے ہی مردوں کے بارے میں خبریں پڑھا کرتی تھی جو معمولی معمولی باتوں پر اپنے گھر کی عورتوں کو بے دریغ قتل کر دیا کرتے تھے۔

مگر جب اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی تو اس کے سارے خدشات اور پریشانیاں دور ہو گئیں اور اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تردد اور تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ لڑکی کو تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے ہی سانچے میں ڈھال لے گی۔ جو کچھ اس نے اپنی ماں سے ورثے میں حاصل کیا تھا اسے وہ جوں کا توں اپنی بیٹی کو منتقل کر دے گی۔

وزیر بیگم بھی بہت خوش تھی۔ اس نے بچی کی پیدائش پر گلنار کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ "سونے کی لاٹھی تمہارے ہاتھ آ گئی ہے گلنار! بڑھاپے میں یہی لاٹھی تمہارا سہارا بنے گی۔ اس کو سینے سے لگا کر رکھو۔ اس کو سنبھالو۔ بہت قیمتی شے ہے یہ .... اس کی اچھی طرح حفاظت کرو اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھو کہ تمہاری بیٹی تمہارے ہی نقش قدم پر چلے۔ جس طرح تم خود اپنی ماں کے نقش قدم پر چلی تھیں۔"

گلنار جب ہسپتال سے گھر واپس آئی تو اس نے بدرالحسن کو فون کیا اور اسے اطلاع دی کہ اس کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی ہے۔

"بالکل چاند کا ٹکڑا ہے' چاند کا ٹکڑا اور اسی لئے میں نے اس کا نام مہ پارہ رکھا ہے .... مہ پارہ کے معنی سمجھتے ہو؟"

"ہاں ہاں سمجھتا ہوں۔" بدرالحسن نے جھلاہٹ اور خوف کے ساتھ جواب دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ گلنار شاید اب اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اس تازہ عذاب سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا۔

"تم .... مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو گلنار؟" بدرالحسن نے مضطرب اور پُرتشویش لہجے میں کہا۔ "ہمارے درمیان تو یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ میرا اس بچے سے.........."

"کوئی تعلق نہیں ہو گا۔" گلنار نے ہنس کر اس کا جملہ مکمل کیا۔ "ہاں بدرالحسن! مجھے سب کچھ یاد ہے اور ہمارے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا میں اب بھی اس پر قائم ہوں

اور آئندہ بھی قائم رہوں گی۔ میں تو تم کو صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ تم ایک بہت خوبصورت اور پیاری بچی کے باپ بن گئے ہو۔ کیا یہ ایک خوشخبری نہیں ہے؟" وہ معنی خیز اور پُراسرار انداز میں ہنسی۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" بدرالحسن نے کہا۔ "اس اطلاع کا شکریہ۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

گلنار فی الحقیقت بدرالحسن سے اب کچھ نہیں چاہتی تھی۔ وزیر بیگم نے اس کو منع کر دیا تھا کہ اب وہ اس کو زیادہ پریشان نہ کرے۔ "ہمیں اپنے دھندے کے لئے ایک پُرامن اور پُرسکون فضا کی ضرورت ہے۔" وزیر بیگم نے اس کو سمجھایا۔ "غیر ضروری جھگڑوں ٹنٹوں میں الجھنے سے دھندہ خراب ہوتا ہے۔ اب اس بدنصیب پر لعنت بھیج دو اور اسے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔"

چنانچہ گلنار نے اس "بدنصیب" پر لعنت بھیج دی اور اسے ہمیشہ کے لئے بھول گئی۔

مہ پارہ کے لئے ایک آیا کا بندوبست کر دیا گیا جو اس کی پرورش اور دیکھ بھال کی پوری طرح ذمہ دار تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ گلنار اس کی طرف سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بچی کی طرف سے غافل نہیں تھی یہ بچی ہی تو اب اس کا سب کچھ تھی۔ وزیر بیگم نے اس کو جو کچھ بتایا اور سمجھایا تھا اسے اس نے اپنے دل پر نقش کر لیا تھا۔ وزیر بیگم کی ایک ایک بات سچائی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مہ پارہ گلنار کے لئے سونے کی لاٹھی تھی اور اسے اس لاٹھی کو بہت سنبھال کر رکھنا تھا۔

مہ پارہ اپنی ماں اور نانی کی طرح بے حد حسین تھی اور وزیر بیگم کے اڈے پر جہاں ان دنوں وہ اکلوتی بچی تھی وہ ساری عورتوں اور لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی تھی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

مہ پارہ ذرا بڑی ہوئی تو اس کی تعلیم کا مسئلہ پیدا ہوا۔ وزیر بیگم نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ اس کی تعلیم اچھی ہونی چاہئے۔ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ دولت مند طبقات میں نئے نئے لوگ شامل ہو رہے تھے جن کے شوق اور دلچسپیاں بھی نئی نئی تھیں۔ اعلیٰ سوسائٹی میں روایتی طوائفوں کے بجائے انگریزی دان اور تعلیم یافتہ کال گرلز نمودار ہو رہی تھیں۔ جن کے ریٹ بہت ہائی تھے اور جن کو گاہکوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

چنانچہ مہ پارہ کو ایک بہت اچھے اور معیاری اسکول کی نرسری کلاس میں داخل کر دیا گیا جہاں نئے بچوں کو شروع ہی سے انگریزی بولنا سکھائی جاتی تھی اور یوں مہ پارہ کی تعلیم

کا آغاز ہو گیا۔

آنے والے ماہ و سال کے دوران مہ پارہ اسی ماحول اور اسی فضا میں پلتی بڑھتی رہی۔ گلنار نے اس کو اپنے سے الگ نہیں کیا حالانکہ وہ کرنا چاہتی تو بڑی آسانی سے ایسا کر سکتی تھی اور مہ پارہ کو کسی ہاسٹل میں رکھ سکتی تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ اس کا تو منصوبہ یہی تھا کہ اس کی بیٹی بھی اسی طرح اس کے نقش قدم پر چلے جس طرح وہ خود اپنی ماں کے نقش قدم پر چلی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مہ پارہ شروع سے ہی ذہنی طور پر خود کو اس دھندے کے لئے تیار کرتی رہے اور جب وہ سن شعور کو پہنچے تو اسے اس زندگی کے قبول کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور وہ یہ سب کچھ اسی طرح قبول کر لے جس طرح گلنار نے قبول کر لیا تھا۔

مہ پارہ کو اس کے باپ کے بارے میں یہ بتایا گیا تھا وہ مر چکا ہے اور یہ کہ وہ ایک ملازمت پیشہ آدمی تھا۔ اس سے زیادہ نہ تو مہ پارہ نے جانا اور نہ اسے بتایا گیا۔ اس کے باپ کے بارے میں حقیقت اس سے اس لئے چھپائی گئی کہ وہ کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا' سوائے ذلت و رسوائی کے اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ مہ پارہ کو جس دنیا میں رہنا اور کام کرنا تھا وہاں رشتوں کی ترجیحات بالکل بدلی ہوئی تھیں۔ اس دنیا میں باپ کا گزر نہیں تھا۔ یہاں ماں کا سکہ چلتا تھا۔

مہ پارہ جب دس سال کی تھی تو اس وقت گلنار کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہو چکی تھیں "ریٹائرمنٹ" کا وقت قریب آ رہا تھا۔ وزیر بیگم نے اس سے جو کچھ کہا تھا وہ سب سچ ثابت ہوتا جا رہا تھا۔ مارکیٹ میں نوعمر و نوخیز اور خوبصورت لڑکیوں کی نئی نئی ٹولیاں آ رہی تھیں جن کے حسن کی روشنی سے اڈوں کے در و بام جگمگا رہے تھے۔ گاہکوں کی توجہ اب ان کی طرف زیادہ تھی۔ گلنار اور اس کی ہم عمر عورتوں کی "ڈیمانڈ" کم ہوتی جا رہی تھی اور ان کے ریٹ بھی تیزی سے گرتے جا رہے تھے۔

"اور پانچ چھ سال کی بات ہے۔" وہ دل ہی دل میں کہتی اور مہ پارہ کے خوبصورت اور سڈول جسم کو دیکھتی جس کے متناسب اور حسین خطوط بڑی تیزی کے ساتھ نسوانی دلکشی اختیار کرتے جا رہے تھے۔ وہ مہ پارہ کے جسم کو پوری طرح اپنی نظروں میں سمو کر اس کو پانچ چھ سال بڑا کر دیتی اور پھر اپنی چشم تصور سے اس نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ اس لڑکی کے گرد چاہنے والوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ایک سے ایک دولت مند گاہک بھاری بھاری رقم لئے ہوئے اس نرم' خوشبودار اور تازہ

گوشت کو خریدنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

وزیر بیگم اگرچہ اب کافی بوڑھی ہو گئی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے تھی۔ پچھلے دنوں اس کی دونوں آنکھوں کا باری باری وقفے وقفے سے آپریشن ہوا تھا اور اب اس کے چہرے پر موٹے موٹے شیشوں کی ایک عینک لگ گئی تھی۔ سر کے زیادہ تر بال جھڑ گئے تھے اور جو بچے تھے ان میں کالے بال بہت کم تھے لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ بالوں کو رنگتی تھی اور دیکھنے والوں کو اس کے سر میں ایک بھی سفید بال نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح چاق و چوبند نظر آنے کی کوشش کرتی تھی لیکن وقت اب اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس گاڑی کو گھسیٹ ہی رہی تھی۔

یوں تو مہ پارہ کے عمومی رویے میں کئی بار ایسی چیزیں دیکھنے میں آئیں جنہوں نے گلنار کو چونکا دیا تھا اور اسے ایک قسم کے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے مہ پارہ اس فضا کو پسند نہیں کرتی ہے جس میں وہ پرورش پا رہی ہے اور جو کچھ اس گھر میں اس کے اردگرد ہو رہا ہے وہ اس کو بالکل اچھا نہیں لگتا لیکن گلنار یہی سمجھ کر خاموش ہو گئی تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود سارے معاملات کو سمجھتی جائے گی جس طرح کہ خود اس نے سمجھ لیا تھا اور خود کو اس ماحول کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لے گی جیسا کہ خود گلنار نے اپنے آپ کو ڈھالا تھا لیکن اس دن تو وہ دنگ رہ گئی جب مہ پارہ نے اس سے یہ مطالبہ کیا کہ اسے ہاسٹل میں داخل کرا دیا جائے۔ اس وقت مہ پارہ کی عمر تیرہ سال کی تھی اور وہ نویں کلاس میں تھی اور اگلے سال میٹرک کا امتحان دینے والی تھی۔

"مگر کیوں بیٹی؟" گلنار نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ کون سا آرام ہے جو تمہیں یہاں میسر نہیں ہے؟ سب کچھ تو موجود ہے یہاں .... بھلا ہاسٹل میں........"

"نہیں ممی!" مہ پارہ نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔ "جو کچھ یہاں موجود ہے وہ مجھے نہیں چاہئے .... میں .... میرا مطلب ہے .... میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہی ہیں نا؟ میں ہاسٹل میں جا کر رہنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں بیٹی!" گلنار نے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتیں کہ تم مجھ کو کس قدر عزیز ہو .... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں بھلا تم کو کس طرح اپنے سے جدا کر سکتی ہوں؟ ایسی باتیں مت سوچا کرو بے بی!"

مہ پارہ کافی بضد تھی لیکن گلنار نے اس کو سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طرح خاموش کر دیا۔ تاہم گلنار کے لئے یہ بہت زیادہ تشویش کی بات تھی۔ اسے اپنی بیٹی کے رویے سے بغاوت کی بُو آ رہی تھی۔ مہ پارہ نے کھل کر یہ بات کہی تھی کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ اسے اچھا نہیں لگتا ہے۔

گلنار کے لئے یہ ناقابلِ یقین اور غیر متوقع تھا۔ اس کے سامنے تو اس کی اپنی مثال موجود تھی اور اس کو پوری امید تھی کہ جس طرح اس نے اپنی ماں کی روش کو بلاچوں و چرا دماغ پر کوئی زور دیئے بغیر بالکل آسانی سے اپنا لیا تھا اسی طرح اس کی بیٹی بھی اس کی روش کو اپنا لے گی اور اس میں کسی کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور کام چل نکلے گا۔ اس نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی اس سے اس درجہ مختلف بھی ہو سکتی ہے۔

اس نے جب وزیر بیگم کو یہ بات بتائی تو وزیر بیگم بھی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

"وہ لڑکی ذرا مختلف قسم کی ہے گلنار!" وزیر بیگم نے کہا۔ "اس کو ہوشیاری کے ساتھ سنبھالنا ہو گا۔ اس پر فی الحال کوئی سختی مت کرنا........"

"مگر وہ تو ہاسٹل میں جانے کے لئے کہہ رہی ہے آپا!" گلنار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اسے اس کی اجازت تو نہیں دے سکتی۔"

"بیشک' اسے ہاسٹل مت جانے دو۔" وزیر بیگم نے کہا۔ "مگر اس کے ساتھ ہی اس پر زیادہ سختی بھی مت کرو۔ بلکہ بالکل سختی مت کرو۔ جو کچھ کہنا ہے پیار محبت کے ساتھ سمجھا بجھا کر کہو۔ تم اسی طرح اسے قابو میں رکھ سکتی ہو اور اب اس بارے میں سوچو کہ اسے جلد از جلد دھندے پر لگا دینا ہے۔ لڑکی ایک بار دھندے پر بیٹھ جائے تو پھر سارے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں آپا!" گلنار نے کہا۔ "میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ بس اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دے گی۔ اس کے فوراً بعد میں اس کی نتھ اتروا دوں گی۔ ذرا بھی انتظار نہیں کروں گی۔"

"بالکل ٹھیک ہے گلنار!" بوڑھی نائکہ وزیر بیگم نے کہا۔ "اس کو جلد از جلد دھندے سے لگا دو۔ تمہارے بڑھاپے کا واحد سہارا وہی ہے۔"

گلنار کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ بڑھاپے کی آمد ایک ایسی سفاک اور قاتل حقیقت تھی جسے کسی طرح بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ پکار پکار کر بڑھاپے کی آمد کی

گواہی دے رہا تھا۔ سب کچھ بدل رہا تھا۔ کس قدر تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا۔ گلنار کی عمر ڈھل رہی تھی' جوانی ڈھل رہی تھی' جسم ڈھل رہا تھا' گاہک کم ہو رہے تھے' ریٹ گر رہا تھا' بڑھاپا بڑھاپا .... گلنار کو ایک نئے روپ کی ضرورت تھی اور وہ روپ اس کے پاس موجود تھا .... مہ پارہ .... اسے کچھ عرصے کے بعد مہ پارہ کو آگے لانا تھا اور خود پیچھے چلے جانا تھا' دھیرے دھیرے۔

اس دن سے گلنار بہت زیادہ محتاط ہو گئی۔ وہ حتی المقدور اس امر کی کوشش کرتی کہ کوئی بات مہ پارہ کی مرضی کے خلاف نہ ہونے پائے۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ راضی رکھنا چاہتی تھی بلکہ اب تو وہ اکثر راتوں کو بھی اپنی بیٹی کے ہی پاس موجود رہتی۔ دھندے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بہت پیسہ موجود تھا اور فی الحال کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔

مہ پارہ اسکول سے آنے کے بعد اپنا زیادہ تر وقت پڑھائی میں اور دوسرے کاموں میں گزارتی تھی۔ اس کے شوق اور اس کی دلچسپیاں بالکل مختلف تھیں۔ وہ اس ماحول میں ایک اجنبی کی طرح رہ رہی تھی اور گلنار اس کو دیکھ دیکھ کر کانپتی رہتی تھی۔ مہ پارہ تو اسے اپنی بیٹی ہی نہیں لگتی تھی۔ وہ تو اس سے بالکل ہی مختلف تھی .... معلوم نہیں' کل کیا ہو گا .... کل کیا ہو گا۔

اس سوال کے جواب کے لئے گلنار کو بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

دن تو آندھی طوفان کی طرح گزرتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے میٹرک کے امتحانات سر پر آ گئے۔ مہ پارہ نے بہترین تیاری کی تھی اور اسے پوری امید تھی کہ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گی۔

مہ پارہ کو ڈرائیور گاڑی میں گھر سے اسکول لے جاتا اور واپس لاتا تھا .... بہت پرانا' بوڑھا اور قابل اعتماد ڈرائیور تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ڈرائیور' مکان میں موجود تھے لیکن مہ پارہ کو ساتھ لانے لے جانے کے لئے اس بوڑھے ڈرائیور کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی جس کا نام قاسم علی تھا۔

اس روز آخری پرچہ تھا۔ مہ پارہ معمول کے مطابق گاڑی میں بیٹھ کر قاسم ڈرائیور کے ساتھ اپنے سینٹر کی جانب روانہ ہو گئی۔ معمول کے مطابق گلنار اسے گیٹ تک چھوڑنے کے لئے آئی اور مہ پارہ اسے "خدا حافظ" کہہ کر گاڑی میں بیٹھی۔ گلنار نے جواباً "خدا حافظ" کہتے ہوئے اسے بہت ساری دعائیں دیں اور اس کی کامیابی کے لئے دلی تمنا کا

اظہار کیا۔ جب تک گاڑی نظر آتی رہی' گلنار گاڑی کو دیکھتی رہی اور جب وہ گلی کے نکڑ پر جا کر مڑی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی واپس آ گئی۔

اب مہ پارہ کو پون بجے کے قریب واپس آنا تھا .... پرچہ تو بارہ بجے ختم ہو جاتا تھا لیکن سینٹر کافی دور تھا۔ قاسم تو وہاں ٹھیک بارہ بجے پہنچ جاتا تھا اور پہلے سے موجود رہتا تھا لیکن مہ پارہ کو اسکول کے اندر سے نکلتے نکلتے کافی دیر ہو جاتی تھی اور پھر وہاں طالبات کا ان کو لینے کے لئے آنے والے لواحقین کا اور گاڑیوں وغیرہ کا اتنا زیادہ رش ہوتا تھا کہ اس میں سے گاڑی نکالنا خاصہ مشکل کام ہوتا تھا۔ اس طرح مہ پارہ کو گھر واپس پہنچتے پہنچتے کم از کم پون بج جاتا تھا جبکہ گلنار بارہ بجے کے بعد سے ہی گھڑی دیکھنا شروع کر دیتی تھی۔

آج آخری پرچہ تھا اور اس کے بعد مہ پارہ کو مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گلنار نے اس کے بارے میں سب کچھ طے کر لیا تھا۔ مہ پارہ کو اس نے بہترین انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھایا تھا اور وہ نہایت عمدگی اور روانی کے ساتھ فرفر انگریزی بولتی تھی۔ بس اتنا ہی کافی تھا' اسے اور زیادہ تعلیم حاصل کر کے کیا کرنا تھا؟ نوکری تھوڑی کرنی تھی۔ وہ اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں بیٹھ کر انگریزی میں خوب اچھی طرح بات چیت کر سکتی تھی اور ان لوگوں کو متاثر کر سکتی تھی۔

گلنار نے مہ پارہ کے پہلے گاہک سے سودا بھی کر لیا تھا۔ بس آخری پرچہ ہونے کی دیر تھی اور اس کے بعد سے مہ پارہ کو دھندے پر لگا دیا جانا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں اپنے معمول کے مطابق حرکت کر رہی تھیں لیکن گلنار کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ حرکت نہیں کر رہی ہیں بلکہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی ہیں۔ وہ مہ پارہ کے انتظار میں ایک ایک پل گن رہی تھی۔

پون بج گیا .... پھر ایک بج گیا .... پھر سوا بج گیا لیکن قاسم' مہ پارہ کو لے کر نہیں آیا۔ گلنار سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی' حالانکہ یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ درجنوں وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ٹریفک جام ہو سکتا تھا جو کہ اس وقت اکثر ہوتا تھا۔ گاڑی میں کوئی خرابی ہو سکتی تھی۔ مہ پارہ کو اندر سے نکل کر آنے میں دیر ہو سکتی تھی۔ مہ پارہ راستے میں کسی چیز کی خریداری وغیرہ کے لئے کہیں رک سکتی تھی۔ آج آخری پرچہ تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مہ پارہ نے اپنے ساتھ گاڑی میں اپنی کسی سہیلی کو بٹھا لیا ہو اور اسے اس کے گھر چھوڑنے کے لئے گئی ہو۔

تقریباً ڈیڑھ بجے گیٹ کے باہر گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی اور گلنار نے

اطمینان و سکون کی گہری سانس لی۔ آخر مہ پارہ گھر واپس آ گئی تھی۔ اس وقت گلنار کے ساتھ وزیر بیگم بھی موجود تھی۔ وہ دونوں کافی دیر سے ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ وزیر بیگم گلنار کو تسلی دے رہی تھی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے' مہ پارہ آتی ہی ہو گی۔

لیکن کمرے میں مہ پارہ داخل نہیں ہوئی۔ اس کے بجائے بوڑھا اور قابل اعتماد ڈرائیور قاسم داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ سخت بدحواس نظر آ رہا تھا۔ اس نے کمرے میں آتے ہی جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سفید رنگ کا لفافہ نکالا اور اسے گلنار کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا ہے یہ؟'' گلنار نے حیرت سے ڈرائیور قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور مہ پارہ کہاں ہے؟''

''مہ پارہ بی بی کا مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔'' ڈرائیور نے مضطرب اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تو ٹھیک ٹائم پر وہاں پہنچ گیا تھا اور گاڑی لئے مہ پارہ بی بی کا انتظار کر رہا تھا۔ پرچہ ختم ہونے کے کافی دیر بعد بھی وہ باہر نہیں آئیں۔ پھر ایک لڑکی میرے پاس آئی اور اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتا دیا۔ اس نے گاڑی کا نمبر بھی دیکھا' میری شکل کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے پرس میں سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہنے لگی کہ میں اس لفافے کو لے جا کر مہ پارہ کی والدہ گلنار بیگم کو دے دوں۔ میں بہت حیران ہوا اور میں نے اس سے پوچھا کہ مہ پارہ بی بی کہاں ہیں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ وہ نہیں آئیں گی اور یہ کہ میں یہ لفافہ لے جا کر ان کی والدہ کو دے دوں۔ میں بہت پریشان تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس لڑکی نے وہ لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور خود جلدی سے وہاں سے غائب ہو گئی۔ میں نے گاڑی سے نیچے اتر کر اس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہجوم میں نہ جانے کدھر نکل گئی تھی۔ مجھے نہیں ملی۔ میں واپس گاڑی میں آ گیا اور بہت دیر تک مہ پارہ بی بی کا انتظار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سارے ہی لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں اکیلا گاڑی لئے وہاں کھڑا تھا۔ پھر میں واپس آ گیا۔ میں کیا کرتا بی بی جی؟''

گلنار نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک بھیانک طوفان امنڈ رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لفافے کو کھولنا چاہا اور اس کی نظر نام پر پڑی۔

لفافے پر اس کا نام' گھر کا پتہ لکھا ہونے کے علاوہ ڈرائیور قاسم علی کا نام اور گاڑی کا نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ گویا سب کچھ مکمل تھا تاکہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔

''اچھا تم جاؤ۔'' وزیر بیگم نے ڈرائیور سے کہا۔ ''لیکن ابھی کہیں چلے مت جانا۔ گھر میں ہی موجود رہنا اور ہاں .... بالکل خاموش۔''

''جی .... بی بی جی!'' ڈرائیور نے سر ہلا کر کہا اور اس اثنا میں گلنار نے لفافہ چاک کر کے اس کے اندر رکھا ہوا پرچہ نکال لیا تھا۔ اس پر صرف چند سطروں پر مشتمل ایک مختصر سی عبارت درج تھی۔

ڈیئر ممی!

آپ کا جو طرز زندگی ہے میں اسے قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں۔ میں آپ لوگوں کی طرح نہیں بن سکتی۔ میری راہیں بالکل جدا ہیں۔ میں آپ سے رخصت ہو کر جا رہی ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر اور اپنی مرضی سے اٹھایا ہے۔ اس کے لئے کوئی اور ذمہ دار نہیں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ مجھے بھول جائیے۔ میں آپ کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔

آپ کی نافرمان بیٹی

مہ پارہ

گلنار کے ہاتھ میں کاغذ کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ جس وقت گلنار یہ خط پڑھ رہی تھی تو اسی کے ساتھ ساتھ وزیر بیگم بھی اس کو پڑھ رہی تھی جو معمولی اردو لکھنا اور پڑھنا جانتی تھی۔ جب گلنار نے یہ خط پڑھ لیا تو اسی کے ساتھ وزیر بیگم بھی اس کو پورا پڑھ چکی تھی۔

''یہ .... یہ .... تو بہت برا ہوا۔'' وزیر بیگم نے کھوکھلی اور دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ اس لڑکی نے کیا کر ڈالا؟''

''مجھے پہلے ہی اس پر شبہ تھا۔'' گلنار نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس سے ڈر لگتا تھا۔ بار بار ڈر لگتا تھا اور میں اسی وقت سے ڈرتی تھی .... اب کیا ہو گا آپا! اب کیا ہو گا .... ہائے میری بچی .... نہ جانے کہاں چلی گئی وہ.........''

''حوصلہ رکھو گلنار!'' وزیر بیگم نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اس نے نادانی میں یہ حرکت کی ہے' ہو سکتا ہے وہ خود ہی دو چار دن میں واپس آ جائے۔''

"نہیں آپا! نہیں۔" گلنار نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اس کو جانتی ہوں' وہ نہیں آئے گی۔ میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں' وہ اب نہیں آئے گی۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی' اسے یہ جگہ پسند نہیں تھی۔"

"تم فکر مت کرو۔" وزیر بیگم نے کہا۔ "ہم اس کو کہیں نہ کہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔"

گلنار کی طبیعت ذرا سنبھلی تو دونوں نے اس معاملے میں سنجیدگی کے ساتھ مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ مہ پارہ کی "گمشدگی" کی پولیس میں باقاعدہ رپورٹ نہ درج کروائی جائے کیونکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی اور اس نے تحریری طور پر اس کا اعتراف کیا تھا۔ البتہ یہ کہ پولیس کے ذریعے غیر سرکاری طور پر تفتیش کروائی جائے اور جب اس کا پتہ چل جائے تو اسے سمجھا بجھا کر واپس لے آیا جائے۔

ان لوگوں کے لئے ایسا کرنا ناممکن نہیں تھا۔ وزیر بیگم کے تعلقات کہاں نہیں تھے اور پھر پولیس والوں سے تو اس کے بہت گہرے مراسم تھے۔

وزیر بیگم نے اسی وقت فون کر کے ایک ذمہ دار پولیس افسر کو اپنے پاس طلب کیا اور اس کو مہ پارہ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی پولیس افسر سے کہا کہ جیسے بھی ہو اس معاملے کی تفتیش کی جائے اور لڑکی کو برآمد کیا جائے۔ پولیس افسر نے کہا کہ وہ فوراً ہی اس کام کو شروع کر دے گا۔

مشکل یہ تھی کہ وہ لوگ کسی پر شبہے کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ مہ پارہ نے کن لوگوں کی مدد اور تعاون سے ایسا کیا ہے۔ گلنار تو مہ پارہ کی کسی سہیلی تک کو نہیں جانتی تھی کیونکہ مہ پارہ اپنی کسی سہیلی کو آج تک اس گھر میں نہیں لائی تھی اور وہ خود بھی بہت کم سہیلیوں کے گھر جاتی تھی۔

تاہم' پولیس کی ایک ٹیم نے تفتیش شروع کر دی۔ ڈرائیور قاسم علی کا تفصیلی بیان لیا گیا اور اس سے اس لڑکی کے بارے میں تفصیل کے ساتھ پوچھا گیا جس نے وہ لفافہ لا کر دیا تھا۔ پولیس والے تو قاسم علی کو لاک اپ میں بند کر کے اس پر تشدد کرنے کے لئے آمادہ تھے لیکن وزیر بیگم نے سختی کے ساتھ انہیں منع کیا اور یہ کہا کہ قاسم علی اس کا پرانا اور قابل اعتماد ملازم ہے اور وہ اس پر ہرگز شک نہیں کرتی۔

کئی ماہ گزر گئے اور مہ پارہ کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ وزیر بیگم نے اپنے بھی کئی آدمی لگا رکھے تھے جو مہ پارہ کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ کراچی کے علاوہ دوسرے شہروں میں

بھی لوگ اس کو تلاش کر رہے تھے۔ گلنار کی طرف سے اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروائے گئے تھے جن میں مہ پارہ سے مخاطب ہو کر یہ کہا گیا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو گھر واپس آ جائے اور اسے اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے گی لیکن ان اشتہاروں کے جواب میں بھی مہ پارہ کا کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔

گلنار کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری دنیا ایک دم سے خالی ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے اس نے اس قدر شدت کے ساتھ اپنے آپ کو کبھی تنہا محسوس نہیں کیا تھا اور اب تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس بھری دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔

ان دنوں اسے اپنی اماں بھی بہت زیادہ یاد آنے لگی تھیں۔ اماں بھی اسی طرح اچانک اسے اور ابا کو چھوڑ کر یوں غائب ہو گئی تھیں کہ آج تک ان کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ کتنے برس گزر گئے تھے .... خدا جانے انسانوں کے اس وسیع و عریض اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں اماں کہاں غائب ہو گئی تھیں' کہاں کھو گئی تھیں اور اب اس بحر زخار میں مہ پارہ گم ہو گئی تھی۔ اسے بھی انسانوں کے اس سمندر نے نگل لیا تھا۔ پہلے ماں اور اس کے بعد بیٹی' دونوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا اور اسے زندگی کی شاہراہ پر اکیلا چھوڑ دیا تھا۔

"کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہے .... کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہے .... نہ اماں کو' نہ مہ پارہ کو .... سب مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے صرف اپنے بارے میں سوچا .... میرے بارے میں کسی نے نہیں سوچا .... اور رہ گئے ابا .... تو وہ جب تک زندہ رہے میرے جسم کی دکان چلاتے رہے اور عیش کرتے رہے۔ میرے لئے تو کسی نے کچھ نہیں کیا' مجھے کسی نے نہیں چاہا .... اف میرے خدا .... میں کس قدر تنہا ہوں .... کس قدر اکیلی ہوں میں ...." اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دس سال کا عرصہ ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے کی طرح سرسراتا ہوا گزر گیا اور اسی عرصے کے دوران بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

اہم ترین بات تو یہ تھی کہ مہ پارہ کا کوئی پتہ نہیں چلا' پولیس والوں نے کافی تلاش و جستجو کی۔ وزیر بیگم کے اپنے آدمیوں نے بھی بہت ڈھونڈا' خود گلنار نے نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ وہ مہ پاری کی کلاس کی ایک ایک لڑکی کے گھر گئی اور اس نے اس کے بارے میں تفصیلی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی پتہ نہیں چلا۔

اس عرصے کے دوران وزیر بیگم کا انتقال ہو گیا اور اس کا اڈہ جو اب تک اس کی

نگرانی میں چل رہا تھا اب اس کی منہ بولی بیٹی نوشابہ کی نگرانی میں آ گیا۔ وزیر بیگم نے بہت مال چھوڑا تھا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کا کچھ حصہ تو نوشابہ کو ملا لیکن زیادہ تر حصہ ایک فلاحی ادارے کو دے دیا گیا۔ وزیر بیگم کا کوئی قانونی وارث نہیں تھا' وہ ساری زندگی جو دولت کماتی رہی اس کے مرنے کے بعد وہ سب دوسروں کے استعمال کے لئے تھی۔

گلنار نے وزیر بیگم کی موت کے بعد وہ اڈہ چھوڑ دیا۔ دھندہ تو وہ بہت عرصہ ہوا چھوڑ چکی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دھندے نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب دھندے کے قابل نہیں رہی تھی لیکن وہ اڈے پر اس لئے رہ رہی تھی کہ یہاں ہمیشہ سے لوگوں کا ساتھ تھا اور خاص طور سے وزیر بیگم کی رفاقت اور قرب اس کو حاصل تھا لیکن وزیر بیگم کی موت کے بعد اس نے اڈے کی عمارت سے منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

گلنار کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ساری زندگی بہت کمایا تھا اور اب وہ وقت تھا جب عمر بھر کی اس کمائی کو سنبھال سنبھال کر احتیاط کے ساتھ خرچ کرنے کی ضرورت تھی۔ اب کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ابھی کتنے دن اور زندہ رہنا ہے۔

گلنار نے اپنی کافی رقم مختلف بچت اسکیموں وغیرہ میں لگا رکھی تھی اور وہاں سے اسے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی اس سے اس کا خرچ بہت عمدگی کے ساتھ چل جاتا تھا۔ اس کی اکیلی جان تھی اور وہ بھی ایک بوڑھی عورت کی جان' اس کی ضروریات تو کافی محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

اس نے شہر کے ایک نئے علاقے میں ایک فلیٹ خرید لیا جو ایک نو تعمیر شدہ بلڈنگ کی پہلی منزل پر واقع تھا اور اس فلیٹ میں منتقل ہو گئی لیکن وہ یہاں بالکل اکیلی نہیں تھی۔ اکیلے رہنے سے تو اس کو ہول آتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ نورن کو بھی لیتی آئی تھی۔

نورن کا پورا نام نورالنساء تھا لیکن اس کی عرفیت نورن تھی اور اڈے پر سب لوگ اسے نورن ہی کہتے تھے۔ نورن ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی اور ملتان کی رہنے والی تھی۔ برسوں پہلے اس کے میاں نے اس کو گھر سے نکال دیا تھا کیونکہ وہ کسی بچے کی ماں نہیں بن سکی تھی اور نورن اِدھر اُدھر کے دھکے کھاتی ہوئی کسی نہ کسی طرح کراچی آ گئی تھی اور یہاں آ کر وہ سڑکوں پر بھیک مانگتی پھرتی تھی کہ ایک روز وزیر بیگم کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وزیر بیگم نے اس سے اس کے حالات کے بارے میں پوچھا اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ

اڈے پر لے آئی۔ اڈے پر ایک ملازمہ کی سخت ضرورت تھی۔ نورن دھندے کے مطلب کی نہیں تھی۔ وہ بے حد معمولی شکل و صورت کی عورت تھی بلکہ محتاط انداز میں اسے بدصورت کہا جا سکتا تھا۔ وزیر بیگم تو اس کو یہاں ایک ملازمہ کے طور پر لے کر آئی تھی اور تب سے نورن یہیں کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے یہاں کی فضا کو' یہاں کے ماحول کو قبول کر لیا تھا۔ وہ خود دھندہ نہیں کرتی تھی لیکن دھندے کا یہ اڈہ ہی اب اس کا گھر تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اسے زندگی میں پہلی بار صرف اسی جگہ آ کر گھر کا سا سکون ملا تھا اور اس نے پہلی بار جانا تھا کہ گھر کیسا ہوتا ہے۔ جب تک شادی نہیں ہوئی تھی تب تک باپ اور بھائی کی ٹھوکروں میں رہتی تھی۔ شادی ہوئی تو میاں کی ٹھوکروں میں آ گئی اور پھر ایک دن میاں نے جوتے مار کر گھر سے نکال دیا کیونکہ وہ اس کو کوئی اولاد نہیں دے سکی تھی اور یہاں وزیر بیگم کے اڈے پر' کسی نے نورن کو ٹھوکریں نہیں ماریں۔ وہ وہاں ایک کام کرنے والی عورت کی طرح رہنے لگی اور وہاں کھانے پینے کی چیزوں کی اس قدر افراط تھی کہ نورن نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی افراط نہیں دیکھی تھی اور پہننے کے لئے ڈھیروں کپڑے تھے۔

نورن کو گلنار کے ساتھ خصوصی قرب حاصل تھا' چنانچہ وزیر بیگم کی موت کے بعد جب گلنار نے علیحدہ فلیٹ لے لیا اور نورن سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو نورن فوراً ہی راضی ہو گئی۔ اس نے بھی اڈہ چھوڑ دیا اور گلنار کے ساتھ اس کے فلیٹ میں آ کر رہنے لگی۔

نورن کا وجود گلنار کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ وہاں اڈے پر بھی نورن کو کوئی تکلیف نہیں تھی اور وہ چاہتی تو وہاں بھی آرام سے رہ سکتی تھی لیکن اس نے گلنار کے ساتھ آنے اور رہنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح وہ دونوں اس فلیٹ میں آ کر رہنے لگیں۔ یہاں تک کہ مزید ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔

مہ پارہ کو گئے ہوئے گیارہ سال کی مدت گزر چکی تھی اس طویل مدت کے دوران گلنار کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ اس کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

اس سے تعلق رکھنے والی تین قریبی ہستیاں اس سے بڑی خاموشی کے ساتھ جدا ہو گئی تھیں۔ یہی وہ تین ہستیاں تھیں جن کے ساتھ اس کا سب سے زیادہ گہرا قریبی تعلق تھا۔ اماں تھیں وہ ایک رات کو چپکے سے غائب ہو گئیں اور انہوں نے کوئی دوسری ہی دنیا

آباد کرلی‘ کوئی ایسی دنیا جس میں گلنار کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے گلنار کو اپنی زندگی سے اور اپنی دنیا سے ہمیشہ کے لئے نکال پھینکا تھا۔ ابا تھے‘ تو وہ ایک دن خاموشی سے اس دنیا سے سدھار گئے اور پھر آخری اور مضبوط ترین رشتے سے منسلک مہ پارہ تھی‘ اس کی اپنی اولاد‘ اس کے جسم کا ایک حصہ‘ اس کا اپنا خون .... وہ جس پر اسے ناز تھا اور جسے وہ وزیر بیگم کے الفاظ میں بڑھاپے کی سنہری لاٹھی سمجھتی تھی‘ وہ بھی ایک دن چپکے سے ہوا ہو گئی۔ سب چلے گئے .... سب چلے گئے .... وزیر بیگم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا جس کے ساتھ عمر کا اتنا حصہ گزارا تھا۔ وہ سب چلے گئے تھے۔ زندگی کس قدر ویران‘ کس قدر خالی‘ کس قدر ڈھنڈار معلوم ہوتی تھی‘ کتنے بے کیف‘ پھیکے اور بے معنی شب و روز تھے۔ ہر چیز کس قدر فضول اور بے مقصد لگتی تھی۔

گلنار کے پاس اپنی گاڑی تھی جسے وہ خود چلایا کرتی تھی۔ مہ پارہ کے غائب ہونے سے پہلے تو اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ گاڑی چلائے گی اور نہ اسے گاڑی چلانے کا کوئی شوق تھا۔ گھر میں کئی کئی ڈرائیور موجود تھے‘ گاڑیاں تھیں‘ اسے جب بھی کہیں جانا ہوتا تھا وہ کسی ڈرائیور کے ساتھ چلی جاتی تھی لیکن مہ پارہ کے چلے جانے کے بعد اس نے ڈرائیونگ اسکول میں باقاعدہ داخلہ لے کر ڈرائیونگ سیکھی اور پھر اپنی ایک ذاتی گاڑی بھی خرید لی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت اچھی طرح گاڑی چلانا سیکھ گئی اور کراچی میں سڑکوں پر گاڑی چلانے لگی۔

اس نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ وہ کراچی کے مختلف علاقوں میں مہ پارہ کو تلاش کر سکے اور وہ اکثر گاڑی لئے اِدھر اُدھر گھومتی رہتی‘ اس امید میں کہ شاید کہیں مہ پارہ کی جھلک نظر آ جائے لیکن اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ اسے گاڑی چلانے کی خوب پریکٹس ہو گئی تھی۔

فلیٹ میں منتقل ہو جانے کے بعد بھی اکثر شام کو جب فضا پر گہری اضمحلالی کیفیت طاری ہوتی اور جو سارے وجود میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور دل بہت اداس ہوتا تھا تو وہ نورن کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر کہیں اِدھر اُدھر سیر کے لئے نکل جاتی تھی۔ جس جگہ اس نے فلیٹ لیا تھا وہ جگہ کلفٹن سے زیادہ دور نہیں تھی۔ چنانچہ وہ دونوں اکثر کلفٹن چلی جاتی تھیں اور سمندر کے کنارے کچھ وقت گزارنے کے بعد واپس اپنے گھر آ جاتی تھیں۔

اس شام کو بھی گلنار کا جی بہت اداس تھا اور جیسے جیسے شام ڈھلتی جا رہی تھی ویسے

ویسے اس کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ فلیٹ کے کمروں کی دیواروں کے درمیان اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”چلو نورن! ذرا باہر چلتے ہیں۔“ اس نے نورن سے کہا۔ ”تھوڑی دیر تک گھوم پھر کر واپس آ جائیں گے۔“

”چلو بی بی!“ نورن نے کہا اور وہ چند منٹ کے اندر اندر چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔

فلیٹ کو تالہ لگا کر وہ دونوں نیچے آ گئیں اور گاڑی میں بیٹھ کر کلفٹن کی طرف روانہ ہو گئیں۔

غروب آفتاب میں ابھی کافی دیر تھی اور خوب اجالا پھیلا ہوا تھا مگر دھوپ کی حدت اور تمازت رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ اس ہلکے سفید اجالے میں ایک بڑی راحت افزا نرمی پائی جاتی تھی۔

وہ دونوں اپنی گاڑی میں سمندر کے قریب پہنچیں اور گلنار نے ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر اپنی گاڑی پارک کرنی چاہی۔ پارکنگ کے لئے اسے گاڑی کو سیدھا کرنا تھا اور اس مقصد کے لئے اسے تھوڑی سا ریورس کرنا تھا۔

گاڑی کو ریورس کرتے وقت اس سے ذرا سی بے احتیاطی ہو گئی۔ اس نے گاڑی کو بائیں جانب کچھ زیادہ ہی کاٹ دیا جس کے نتیجے میں اس کی گاڑی کا بایاں پہلو قریب کھڑی ہوئی گاڑی کے پیچھے دائیں حصے سے جا ٹکرایا۔ ایک چھناکے کی آواز ہوئی۔ دوسری گاڑی کی بیک لائٹ ٹوٹ گئی تھی۔

”اوہ۔“ اس نے جلدی سے گاڑی کو بریک لگائے اور پھر اسے فرسٹ گیئر میں ڈال کر آگے کی جانب لے گئی۔ اس وقت دوسری گاڑی کی ٹوٹی ہوئی کچھ اور چیزیں نیچے گریں جو ابھی ذرا اٹکی ہوئی تھیں۔

”شاید اس گاڑی کی لائٹ ٹوٹ گئی ہے۔“ نورن نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا اور پھر وہ پیچھے ہی دیکھتی رہ گئی۔

ایک عمر رسیدہ آدمی تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا ان لوگوں کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے اور ناگواری کے آثار تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس گاڑی کا مالک تھا پیشہ ور ڈرائیور نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے جسم پر نہایت نفیس اور قیمتی تھری پیس سوٹ تھا۔

”مالک بھی آ گیا کم بخت۔“ گلنار نے اسے دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”خیر ٹھیک

ہے .... آنے دو..........." اور اس کے ساتھ ہی وہ گاڑی سے نیچے اتر آئی۔

"محترمہ! آپ نے میری گاڑی کی لائٹ توڑ دی ہے۔" معمر آدمی نے گلنار سے کہا اور وہ اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ بولتے بولتے رک گیا ہو اور اس کی پوری توجہ گلنار کے چہرے پر مرکوز تھی۔

"میں معافی چاہتی ہوں بھائی صاحب!" گلنار نے جلدی سے کہا۔ "غلطی میری ہی ہے۔ میں آپ کا نقصان پورا کردوں گی۔"

اس سے اگلا لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلا اور وہ غور سے اس آدمی کو دیکھنے لگی۔ ماتھے پر دائیں آنکھ کے اوپر چوٹ کا سیاہ نشان اور کچھ جانی پہچانی سی آواز۔ وہ آدمی بھی اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بڑے غور سے دیکھنے لگے تھے۔

عمر رسیدہ گلنار اور وہ معمر آدمی دونوں ایک دوسرے کے چہروں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں ہی کو بیتے ہوئے دور دراز کے گم گشتہ دنوں کی طرف سے کچھ اشارے مل رہے تھے۔ وہ ان اشاروں کو پورے طور سے اپنے ذہن کی گرفت میں لینے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

"آپ .... معاف کیجئے گا........." پہل گلنار نے کی۔ "آپ .... بدرالحسن صاحب ہیں؟"

"جی .... جی .... بالکل۔" معمر آدمی کے ہونٹوں پر ایک نرم اور دلآویز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں بدرالحسن ہوں اور تم........." وہ فوراً ہی آپ کے بجائے "تم" پر آگیا تھا۔ "تم گلنار ہو نا؟"

"جی ہاں۔" گلنار نے کہا۔ "میں گلنار ہوں۔"

"افوہ .... کتنا عرصہ گزر گیا۔" بدرالحسن بڑی گہری نظروں سے گلنار کا جائزہ لے رہا تھا۔ بوڑھی، عمر رسیدہ عورت، جو اس وقت اس کے سامنے کھڑی تھی، ایک زمانے میں وہ حسین و جمیل لڑکی ہوا کرتی تھی جس کے ساتھ اس نے دنیا کے کتنے ممالک میں ہوٹلوں میں راتیں گزاری تھیں۔ کبھی وہ وقت تھا کہ وہ ایک پیکر جمال تھی جس کے تر و تازہ اور شاداب پیکر سے جوانی کی لپٹیں اٹھا کرتی تھیں اور اب .... اب وہ سب کچھ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ بدرالحسن کے سامنے ایک جھریوں بھرا چہرہ تھا جس پر گزرے ہوئے طویل ماہ و سال کی گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ان تہوں کو ہٹا کر پیچھے چھپے ہوئے اس چہرے کو تلاش کر لیا تھا جس کو اس نے آج سے بہت عرصہ پہلے دیکھا تھا۔

گلنار تصویر حیرت بنی بدرالحسن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ ہاں یہ بدرالحسن تھا......... یہ معمر سن رسیدہ آدمی، ہمیشہ کا ایسا نہیں تھا۔ اس کے سر کے بال جو اب آدھے سے زیادہ سفید نظر آ رہے تھے، ان دنوں بالکل سیاہ ہوا کرتے تھے اور اس کا جسم اتنا بھاری اور فربہی مائل نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ تو بڑا سبک اور بھرپور جسم تھا، سڈول اور خوبصورت اور اس جسم میں ایسی ڈھلکی ہوئی توند کا کہیں وجود نہیں تھا جو اس وقت تھری پیس سوٹ میں سے خاصی نمایاں نظر آ رہی تھی۔

بدرالحسن اور گلنار کے درمیان تقریباً چھبیس سال کا طویل فاصلہ حائل تھا۔ دونوں کی آخری ملاقات آج سے چھبیس سال پہلے ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد ان کے درمیان تعلقات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے تھے۔ بدرالحسن اور گلنار نے اس کے بعد ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔

آج سے تقریباً چھبیس سال پہلے غیر ملکی سفر سے واپس آنے کے بعد گلنار اور بدرالحسن کے درمیان صرف دو ایک بار فون پر گفتگو ہو گئی تھی اور جب مہ پارہ پیدا ہوئی تھی تو گلنار نے بدرالحسن کو فون پر ہی اس کی پیدائش کی اطلاع دی تھی اور دونوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ اس بچی کا بدرالحسن سے کوئی تعلق نہیں ہو گا اور مہ پارہ اس سلسلے میں کوئی دعویٰ نہیں کرے گی۔ بدرالحسن نے پہلے ہی کافی رقم گلنار کو دے دی تھی اور گلنار کے ساتھ اس کے معاملات طے پا گئے تھے۔

اس کے بعد سے بدرالحسن وزیر بیگم کے اڈے پر کبھی نہیں گیا اور گلنار بھی اس کو بھول گئی۔ اسے بدرالحسن کو یاد رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بدرالحسن جیسے کتنے ہی خریدار اس کے جسم کے گوشت کی دکان پر آیا کرتے تھے اور اس کی نظر میں ان کی اہمیت اور وقعت جسم سے اتارے ہوئے ایک جوڑے سے زیادہ کی نہیں ہوتی تھی۔

تاہم بدرالحسن کے ساتھ ایک خصوصیت تھی اور وہ یہ کہ بدرالحسن مہ پارہ کا باپ تھا لیکن یہ بات بس یہیں پر ختم ہو جاتی تھی۔ گلنار کی زندگی میں، مہ پارہ کی زندگی میں اس شخص کو کوئی دخل نہیں تھا اور نہ اس کے لئے کوئی جگہ تھی۔ مہ پارہ تو اس کو جانتی بھی نہیں تھی۔ اس کو تو بچپن سے یہی بتایا گیا تھا کہ اس کے باپ کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔

ان گزرے ہوئے چھبیس برسوں کے دوران گلنار نے خود بھی بدرالحسن سے ملنے کی یا اس کے بارے میں کچھ جاننے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کو تو یہ بھی نہیں

معلوم تھا کہ بدر الحسن زندہ ہے یا مر گیا اور اگر زندہ ہے تو کراچی میں ہی ہے یا کہیں اور ہے۔ نہ ہی اسے اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت تھی تو پھر بدر الحسن کو کیوں یاد رکھتی اور اس کے بارے میں کیوں سوچتی؟

اور آج کم و بیش چھبیس برس کے بعد بدر الحسن ایک بار پھر اس کے سامنے موجود تھا۔

وقت نے ان دونوں کی جوانی کو مرجھا دیا تھا' ان کے چہروں کو کملا دیا تھا اور مردہ لمحوں کی راکھ ان کی صورتوں پر مل دی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔ وہ دونوں اس وقت جیسے ایک دوسرے کا آئینہ بنے ہوئے تھے۔

"چھبیس سال......" گلنار نے نرم' کمزور اور مضطرب آواز میں کہا۔ اس کی نظریں بدر الحسن کے چہرے سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ "چھبیس سال کے بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں بدر الحسن!" گلنار بھی بے ساختگی کے عالم میں اس سے "تم" کر کے بات کرنے لگی۔ پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اس کو ایک معزز اور "شریف" آدمی سے اس طرح بے تکلف ہونے کا حق حاصل نہیں ہے اور اسے محتاط رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ "آپ ......کیسے ہیں بدر الحسن صاحب؟" اس نے جلدی سے اپنی تصحیح کر لی۔

"میں تو ٹھیک ہوں گلنار بیگم اور جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔" وہ زور سے ہنسا۔ "مگر تم میں بھی بہت تبدیلیاں ہو گئیں گلنار! کس قدر بدل گئی ہو تم۔"

"صرف میں ہی تو نہیں بدلی ہوں بدر الحسن صاحب!" گلنار اب پوری طرح سنبھل گئی تھی۔ "سب کچھ ہی بدل گیا ہے۔ چھبیس برس' چوتھائی صدی کی مدت کچھ کم تو نہیں ہوتی۔ اس دوران تو سب کچھ ہی بدل جاتا ہے۔ آپ بھی تو کتنے بدل گئے ہیں لیکن پھر بھی میں نے آپ کو پہچان لیا۔ اگرچہ تھوڑی سی دقت ضرور ہوئی۔"

"اور میں نے بھی تم کو پہچان لیا۔" بدر الحسن نے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا۔ "گو کہ مجھے بھی دماغ پر خاصا زور ڈالنا پڑا .... چھبیس سال کے طویل عرصے کے بعد کہیں اچانک مل جانے والوں کو پہچان لینا واقعی ایک حیرت انگیز بات ہے۔"

نورن اس ساری گفتگو کے دوران خاموش کھڑی ہوئی سب کچھ سن رہی تھی اور دل ہی دل میں اس منفرد منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دو جاننے والے افراد چھبیس سال کے بعد ایک دوسرے کو ملے تھے اور انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا اور اب وہ

کس قدر ذوق و شوق اور آرزو مندی کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

نورن' بدر الحسن کو نہیں جانتی تھی۔ وہ جب وزیر بیگم کے اڈے پر آئی تو اس سے کافی عرصے پہلے ہی' بدر الحسن کا وہاں آنا جانا موقوف ہو چکا تھا اور اس وقت مہ پارہ کی عمر کوئی پانچ چھ سال کی تھی۔ نورن نے گلنار سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ اس کی بیٹی کا باپ کون ہے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں کسی ماں سے اس کی اولاد کے باپ کا نام نہیں پوچھا جاتا تھا۔

"میں نے آپ کی گاڑی کی لائٹ توڑ دی ہے۔" گلنار نے اس کی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں.........."

"ارے چھوڑو اس بات کو۔" بدر الحسن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ لو .... وہ ہماری بیگم صاحبہ بھی تشریف لا رہی ہیں۔" اس نے اچانک ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ایک چار پانچ سالہ بچے کی انگلی پکڑے ہوئے اسی طرف آ رہی تھی۔ بچہ آگے جانے کے لئے تیار نہیں تھا اور بار بار رک جاتا تھا۔ عورت گھوم گھوم کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس طرح اس کا چہرہ پیچھے کی جانب ہو جاتا تھا۔ "ہمارے ولی عہد بہادر بھی ان کے ساتھ ہیں۔"

اس نوجوان عورت نے جیسے ہی نزدیک آ کر ان دونوں عورتوں کو دیکھا تو وہ ایک دم ٹھٹک کر رہ گئی اور پھر یکبارگی اس کے چہرے پر خوف کا تاثر ابھرا۔ گلنار اور نورن اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں اور پھر گلنار نے اس سے پوچھا۔ "تم مہ پارہ ہو نا؟" گلنار کی آواز کانپ رہی تھی۔

"ہاں۔" نوجوان عورت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی سارا منظر بدل گیا۔ گلنار سسکتی ہوئی اس نوجوان عورت پر پل پڑی۔ اس نے اس کو اپنے سینے سے لگایا اور بے تحاشہ اس کو پیار کرنے لگی۔ "میری جان .... میری بچی .... میری پارو .... میری پارو .... تو کہاں چلی گئی تھی میری جان .... میں نے تجھے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا........."

نورن بھی آگے بڑھ کر مہ پارہ سے لپٹ رہی تھی اور اس کو پیار کر رہی تھی اور مہ پارہ تصویر حیرت بنی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ماں .... گلنار اور نورن خالہ .... اس نے دونوں کو پہچان لیا تھا۔

ماں بیٹی کے درمیان گیارہ سال کا فاصلہ حائل تھا۔ گلنار اور مہ پارہ ایک دوسرے کو گیارہ برس کے بعد دیکھ رہی تھیں اور ان دونوں نے بلکہ ان تینوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔

"مہ پارہ........" بدرالحسن کے دماغ میں بم پھٹا۔

پچیس سال پہلے فون کی گھنٹی بجی تھی۔

"بالکل چاند کا ٹکڑا ہے چاند کا ٹکڑا........" گلنار کہہ رہی تھی۔ "اسی لئے میں نے اس کا نام مہ پارہ رکھا ہے۔ مہ پارہ کے معنی سمجھتے ہو؟"

بدرالحسن نے جلدی سے آگے بڑھ کر گلنار کو بازو سے پکڑ لیا۔

"گلنار! کیا........ کیا مہ پارہ تمہاری بیٹی ہے؟" بدرالحسن خود بھی اپنی آواز کو نہیں پہچان پا رہا تھا۔

"ہاں........ بدرالحسن!" گلنار نے بے دھیانی میں کہا اور پھر فوراً ہی اس کے دل و دماغ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ بجلی مہ پارہ کے دل و دماغ پر بھی گری تھی۔ اسے اس انداز میں اپنی ماں سے ملاقات کر کے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ جان کر کہ اس کی ماں اور بدرالحسن ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں اور اب بدرالحسن یہ بھی جان گیا تھا کہ مہ پارہ گلنار کی بیٹی ہے۔ مہ پارہ سخت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کا شوہر تو اس کی اصلیت سے بالکل ناواقف تھا اور اب امی اچانک یہاں آن ٹپکی تھیں۔ خدا جانے بدرالحسن ان کے بارے میں کیا کچھ جانتا ہو گا اور اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔

مہ پارہ کے اچانک اور غیر متوقع طور پر مل جانے کی خوشی میں گلنار رشتوں کے اس ہولناک اور لرزہ خیز گورکھ دھندے کو تو جیسے بھول ہی گئی تھی جس کا انکشاف اس پر ابھی ابھی ہوا تھا۔

"لو' وہ ہماری بیگم صاحبہ بھی تشریف لا رہی ہیں۔ ہمارے ولی عہد بہادر بھی ان کے ساتھ ہیں........"

اور مہ پارہ اپنے اور بدرالحسن کے بچے کی انگلی پکڑے ہوئے ان لوگوں کی طرف آن پہنچی تھی۔

بدرالحسن کے سلگتے ہوئے دماغ میں اچانک چند لمحوں کے دوران پچھلی یادوں کے شعلے بھڑک اٹھے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ جیسے جل کر خاکستر ہونے لگا۔

☆======☆======☆

یہ آج سے تقریباً سات سال پہلے کی بات ہے........

بدرالحسن کو دفتر میں ایک پرسنل سیکرٹری کی ضرورت تھی اور اس آسامی پر وہ کسی ایسی لڑکی کا تقرر کرنا چاہتا تھا جس کا کوئی لمبا چوڑا خاندان نہ ہو اور جو بہت سارے مسائل میں گھری ہوئی نہ ہو۔ اس کا تجربہ تھا کہ ایسی لڑکیاں اچھا خاصا مسئلہ بن جاتی تھیں جو وسیع خاندان سے تعلق رکھتی تھیں کیونکہ انہیں آئے دن چھٹی کی ضرورت رہتی تھی اور پھر وہ کام پر پوری طرح توجہ بھی نہیں دے پاتی تھیں۔

اس نے اخبار میں اشتہار دیا تھا اور جن امیدوار لڑکیوں کو اس نے انٹرویو کے لئے بلایا ان میں مہ پارہ بھی شامل تھی' ایک عام سے نام والی لڑکی........ ماہ پارہ........

اور جب وہ مہ پارہ کا انٹرویو کر رہا تھا تو اس وقت اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں یہ خیال موجود نہیں تھا کہ آج سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے اس کی داشتہ گلنار بیگم نے ایک بچی کو جنم دیا تھا جس کا نام گلنار بیگم نے مہ پارہ رکھا تھا۔ مہ پارہ تو کبھی بھی بدرالحسن کی زندگی کا ایک حصہ نہیں بنی تھی۔

مہ پارہ نے انٹرویو کے دوران اپنے بارے میں یہ بتایا کہ اس کے والدین حیات نہیں ہیں اور اس کے ایک رشتے کے انکل نے اس کی پرورش کی ہے۔ مہ پارہ نے بلوچستان یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا اور ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کا کورس بھی کیا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ سال سے کچھ زیادہ تھی اور اس نے ابھی تک کسی دفتر میں کام نہیں کیا تھا۔

مہ پارہ کے کوائف کا بغور جائزہ لینے اور اس کے عمدہ تعلیمی ریکارڈ کو دیکھنے کے بعد بدرالحسن نے اس کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا اور جب وہ اس کا بائیو ڈیٹا دیکھ رہا تھا تو اس نے مہ پارہ کے والد کے نام کو ٹھیک سے پڑھا بھی نہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اس کے مرحوم باپ کا نام کیا تھا۔

مہ پارہ نے اس کے دفتر میں کام شروع کر دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اپنی اعلیٰ کارکردگی اور حیرت انگیز صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ مہ پارہ بہت اچھی لڑکی تھی' اس عمر میں اس کے اندر ایسا احساسِ ذمہ داری موجود تھا کہ پورے دفتر کو بلا تامل اس کے اوپر چھوڑا جا سکتا تھا۔

ذمہ دار اور بے حد محنتی اور باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ مہ پارہ میں ایک اور خوبی بھی تھی اور وہ یہ کہ وہ بے حد حسین تھی' بہت حسین اور پُرکشش۔

شروع شروع میں تو کوئی ایسی بات نہیں تھی اور بدرالحسن مہ پارہ کو اس طرح پسند

کرتا تھا جس طرح اسے ایک اچھے اور ایماندار کارکن کو پسند کرنا چاہئے لیکن رفتہ رفتہ یہ پسندیدگی کوئی دوسرا ہی رخ اختیار کرنے لگی اور بدرالحسن کو احساس ہوا کہ وہ مہ پارہ سے محبت کرنے لگا ہے۔

مہ پارہ عمر میں اس کی آدھی تھی اور وہ باآسانی اس کی بیٹی نظر آتی تھی لیکن محبت کا یہ جذبہ عمر کی حدود کا پابند نہیں تھا۔

بدرالحسن کی شادی تو بہت عرصہ پہلے ہوئی تھی لیکن اس کی بیوی کا آج سے کوئی تین سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ میمونہ اس کو بہت عزیز تھی اور وہ اس کی اکلوتی بیٹی کی ماں تھی۔ وہ سب لوگ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے' دولت کی ریل پیل تھی کہ اچانک ایک المناک حادثے نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔

بدرالحسن کی بیوی میمونہ اور اس کی بیٹی دردانہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں جا رہی تھیں کہ گاڑی ایک ٹینکر سے ٹکرا گئی۔ حادثہ اس قدر شدید نوعیت کا تھا کہ گاڑی میں موجود تینوں افراد نے موقع پر دم توڑ دیا۔ بدرالحسن کے گھر میں اندھیرا پھیل گیا۔

پچھلے تین برسوں سے بدرالحسن اسی اندھیرے میں سانس لے رہا تھا اور اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا اور پھر اچانک مہ پارہ اس کی زندگی میں روشنی کی ایک کرن بن کر نمودار ہوئی۔

مہ پارہ کے لئے بدرالحسن کی یہ محبت یکطرفہ تھی۔ خود مہ پارہ کے دل میں ایسا کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ وہ اس آفس میں ایک ملازم کے طور پر آئی تھی اور خود کو ملازم ہی سمجھتی تھی۔ اس سے کچھ زیادہ سمجھنے کی اس نے کوشش ہی نہیں کی۔

تاہم کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اپنے باس کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کرنے لگی تھی اور یہ رویہ اس کے لئے پریشانی کا باعث بن رہا تھا اور پھر ایک روز یہ پریشانی اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی جب اس کے باس نے اس کو شادی کی پیشکش کی لیکن پھر کافی غور و خوض کے بعد اس نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

بدرالحسن مہ پارہ کو پا کر اس قدر خوش تھا گویا اسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہو۔ مہ پارہ کس قدر خوبصورت تھی اور پھر کتنی نوجوان .... کم عمر............ اس نے مہ پارہ پر اپنی ساری محبتیں اور چاہتیں نثار کر دیں۔

شروع شروع میں تو اسے کافی ڈر لگ رہا تھا۔ مہ پارہ عمر میں اس سے بہت کم تھی اور ان کی یہ شادی بالکل انمل اور بے جوڑ تھی۔ اس نے سنا تھا کہ عام طور سے ایسی

شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں اور میاں بیوی کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی اور عام طور سے مرد کو پچھتانا پڑتا ہے لیکن بدرالحسن کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ مہ پارہ تو بہت زیادہ محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی اور اس نے بدرالحسن کو کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ان دونوں کی عمروں میں اتنا زیادہ فرق ہے۔

جس وقت ان دونوں کا نکاح ہوا تھا جو کہ بالکل سادگی سے ہوا تھا کیونکہ بدرالحسن کی یہ دوسری شادی تھی اور وہ کسی بھی قسم کے دھوم دھڑکے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا' اس دن اور اس وقت پہلی بار بدرالحسن کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ مہ پارہ کے والد مرحوم کا نام بھی اتفاق سے بدرالحسن تھا۔ مہ پارہ کے والدین تو بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور اسے اس کے ایک رشتے کے چچا نے پالا تھا لیکن اس وقت بدرالحسن کو یہ بات بالکل یاد نہیں آئی تھی کہ تقریباً انیس بیس سال پہلے گلنار نے اس کو فون کر کے ایک بیٹی کے پیدا ہونے کی اطلاع دی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اس نے اس بچی کا نام مہ پارہ رکھا ہے۔ یہ ساری باتیں تو اتنی پرانی' بے معنی اور بے حقیقت تھیں کہ ان کو یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لیکن اب ان چند لمحوں کے دوران دل پر ایک ایسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی جس کے سامنے ہزاروں قیامتیں ہیچ تھیں۔ بدرالحسن اپنے آپ کو مرتا ہوا محسوس کر رہا تھا............ اس کے ہاتھ پیروں میں بڑے زور کی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ ہر چیز گھوم رہی تھی .... "مہ پارہ بیگم بنت بدرالحسن مرحوم .... ماہ پارہ بیگم بنت بدرالحسن مرحوم............"

نکاح خواں کی آواز ماضی کے مردہ خانے سے نکل کر اس کے دماغ کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

ہر طرف سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر کوئی بدروح اس کے دل میں اتر گئی۔ اس بدروح نے اس کے دل کو مٹھی میں لے کر دبانا شروع کر دیا۔ شدید تکلیف اور ناقابل برداشت درد کے عالم میں اس کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں نکلنے لگیں .... اس کا ہاتھ اپنے سینے پر جما تھا............ وہ گر رہا تھا............ گر رہا تھا۔

تین افراد نے فوری طور پر اسے سہارا دیا۔ گلنار' مہ پارہ اور نورن۔ ان تینوں نے اس کو گرنے نہیں دیا۔ گلنار کا پورا جسم اس قدر شدت کے ساتھ کانپ رہا تھا گویا ابھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے زیادہ عجیب و غریب'

مشکل، صبر آزما اور غیر متوقع لمحات تھے۔ یہ ایک ایسی کڑی آزمائش تھی جو دنیا میں شاذ و نادر ہی کسی کے حصے میں آتی ہے اور گلنار اس وقت اس آزمائش سے گزر رہی تھی۔

"امی .... امی!" مہ پارہ سب کچھ بھول گئی تھی اور اسے صرف اپنے شوہر کی فکر تھی۔ "انہیں .... انہیں جلدی سے .... گاڑی میں........."

"ہاں، ہاں میری بچی!" گلنار نے زار و قطار روتے ہوئے نیم مردہ آواز میں کہا۔ "چلو جلدی........."

اسی وقت چند آدمی بھی ان عورتوں کی مدد کو آ گئے اور انہوں نے بے ہوش مرد کو گاڑی میں ڈالنے میں ان عورتوں کی مدد کی۔ بدرالحسن کی گاڑی کافی بڑی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر بدرالحسن کو نیم دراز حالت میں آرام سے ڈال دیا گیا اور مہ پارہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اس کی قمیض کے بٹن کھول کر اس کے سینے کی ہلکے ہلکے مالش کر رہی تھی، گلنار نے خود ہی اس سے کہا تھا کہ وہ بدرالحسن کے پاس بیٹھ جائے اور گاڑی وہ خود چلا لے گی۔

گلنار کے لئے اس وقت گاڑی چلانا بے حد مشکل کام تھا۔ اس کے جسم کے ایک ایک روئیں میں جیسے ان گنت جہنم دہک رہے تھے۔ وہ اپنی ناہموار سانسوں میں شعلوں کی جھلسا دینے والی لپک محسوس کر رہی تھی۔ سب کچھ ختم ہو رہا تھا......... زندگی ختم ہو رہی تھی۔

ذرا سی دیر میں وہ لوگ ہسپتال پہنچ گئے اور بے ہوش بدرالحسن کو فوراً انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں داخل کر لیا گیا۔ اس پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

"کیا اس سے پہلے بھی ان کو دل کی تکلیف تھی؟" گلنار نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"دو سال پہلے ایک ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔" مہ پارہ نے روتے ہوئے کہا۔ "بہت سے ڈاکٹروں نے احتیاط کرنے کو کہا تھا اور وہ احتیاط تو ہمیشہ کرتے تھے۔ آپ انہیں کس طرح جانتی ہیں امی!؟"

مہ پارہ کو نہیں معلوم تھا کہ اس سوال کے جواب میں کیسی کیسی قیامتیں اور ہلاکتیں پوشیدہ ہیں اور نورن کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ جو کچھ معلوم تھا وہ اس وقت صرف بدرالحسن اور گلنار کو ہی معلوم تھا۔

"میں انہیں جانتی تھی بیٹی!" گلنار نے مبہم اور غیر واضح سا جواب دیا۔

ذرا ہی دیر میں مہ پارہ نے فون کر کے بدرالحسن کے کئی قریبی عزیزوں کو بلوا لیا تھا۔

مہ پارہ کے کہنے پر گلنار انہی میں سے ایک کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں تک گئی جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی اور اپنی گاڑی لے کر آ گئی۔

صورت حال ایسی تھی کہ دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے سے ٹھیک سے بات نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان گیارہ سال کی ہلاکت انگیز اور خون آلود دوری حائل تھی۔ جس کی اصل المناکی کا مہ پارہ کو کوئی علم نہیں تھا۔ جبکہ گلنار کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ کاش .... کاش .... یہ سب کچھ جاننے سے پہلے اسے موت آ جاتی .... وہ اپنی آنکھوں سے یہ لہو لہو مناظر نہ دیکھ پاتی۔ یہ تو ایک ایسا غم تھا جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ موت کا صدمہ بھی اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا صدمہ تھا۔ اگر اسے یہ اطلاع ملتی کہ مہ پارہ مر گئی ہے تو وہ کچھ عرصے تک رو دھو کر صبر کر لیتی اور یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتی کہ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ موت کے غم کا بھی تو ایک علاج ہوتا ہے اور وہ ہے صبر، لیکن جو غم اسے اب درپیش تھا اس کا تو کوئی بھی علاج نہیں تھا۔

بدرالحسن کے جو دوسرے رشتہ دار وغیرہ مہ پارہ کی مدد کے لئے ہسپتال آ گئے تھے، ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مہ پارہ نے اپنے حواس اس حد تک بجا رکھتے ہوئے کہ وہ معاملے کو زیادہ الجھنے نہ دے، گلنار سے کہا تھا۔ "امی! میرے شوہر کے کچھ رشتے دار آ رہے ہیں .... آپ .... مہربانی کر کے .... میرا مطلب ہے .... میں ان کے سامنے آپ کو آنٹی کہوں گی۔ ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہے کہ میری والدہ حیات ہیں۔"

گلنار نے اس کی یہ بات سنی اور اس کا کلیجہ ہل گیا۔ تو مہ پارہ نے اس کو مردہ قرار دے دیا تھا، اس کی بیٹی نے اسے جیتے جی مار دیا تھا؟ مگر شاید اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ اس نے اس دنیا کو مسترد کر دیا تھا جس سے گلنار کا تعلق تھا اور جب وہ اپنی بالکل الگ دنیا بسا رہی تھی تو اس میں گلنار جیسی ماں کی دور دور تک کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"تم اطمینان رکھو بیٹا!" اس نے مہ پارہ سے کہا۔ "تم ان لوگوں سے صرف یہ کہہ دینا کہ میں تمہاری ایک پرانی جاننے والی ہوں۔"

"بدرالحسن تو آپ کو میری ماں کے طور پر جانتے ہیں۔" مہ پارہ نے کہا۔ "ان کو جب ہوش آ جائے گا تو پھر ہم اس معاملے کے بارے میں بات کریں گے لیکن میں نے انہیں آپ کے بارے میں .... اس بارے میں .... کچھ نہیں بتایا ہے۔" مہ پارہ کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

"تمہیں بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے بیٹی!" گلنار کے دل میں سے آواز ابھری جو اس کے لبوں تک نہیں آ سکی۔ "وہ تو میرے بارے میں اس وقت سے جانتا ہے جب تمہارا وجود بھی نہیں تھا۔"

گلنار ہسپتال کے لاؤنج میں ایک صوفے میں دھنس گئی تھی اور اس نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس نے مہ پارہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے دماغ کے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے۔ اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟ جو کچھ ہو چکا ہے اس کا مداوا کیا ہے.......... مداوا کیا ہے؟

"دعا کرو بی بی!" نورن نے آہستہ سے گلنار سے کہا۔ اس وقت مہ پارہ اس کمرے سے جا چکی تھی۔ "دعا کرو کہ مہ پارہ بی بی کے شوہر کو اللہ صحت دے.......... خدا ان کی جان بچالے۔"

لیکن گلنار یہ دعا نہیں مانگنا چاہتی تھی۔ اس نے نورن کی بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور بدرالحسن کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح بے ہوش پڑا تھا۔ آنے والے کچھ رشتے دار تو واپس چلے گئے تھے کیونکہ رات بہت ہو گئی تھی اور باقیوں کو مہ پارہ نے خود واپس بھیج دیا تھا۔ گھر کے کئی ملازم آ گئے تھے۔ مہ پارہ اکیلی نہیں تھی' اس نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ بھی جا کر آرام کریں۔

آدھی رات کے بعد جبکہ وہ تینوں ہسپتال کے لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھیں' گلنار اور نورن کے بار بار پوچھنے پر مہ پارہ نے انہیں اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ بدرالحسن انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھا جس کے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی البتہ اس یونٹ کے باہر ایک لاؤنج تھا جو یونٹ کے اندر داخل مریضوں کے لواحقین کے لئے تھا اور وہاں اس وقت ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ مہ پارہ کے گھر کے ملازم لاؤنج کے باہر موجود تھے۔ مہ پارہ نے گیارہ سال کے طویل عرصے پر محیط اپنے حالات' ٹکڑوں میں سنائے کیونکہ بیچ بیچ میں وہ اٹھ اٹھ کر یونٹ کے شیشے والے دروازے کے پاس جاتی تھی اور وہاں سے بدرالحسن کو دیکھ کر چلی آتی تھی جو اندر ایک بیڈ پر بے ہوش پڑا ہوا تھا اور اس کے جسم کے ساتھ طرح طرح کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔

مہ پارہ نے ان دونوں کو اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ بہت تفصیلی نہیں تھا بلکہ وہ تو سرے سے تفصیلی تھا ہی نہیں۔ اس نے کافی اختصار سے کام لیا تھا کیونکہ اس وقت جو

اس کی ذہنی کیفیت تھی اس کے باعث وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتی تھی۔

مہ پارہ کو ہوش سنبھالتے ہی اس بات کا بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کہاں اور کن لوگوں کے درمیان رہ رہی ہے اور اس بہت بڑے سے' شاندار اور بے حد نفیس گھر میں کیا ہوتا ہے۔ ساری باتیں تو وہ بیک وقت نہیں سمجھ سکی تھی لیکن عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ان سارے اسرار و رموز کو سمجھتی جا رہی تھی اور سن شعور تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ان معاملات میں باشعور ہو چکی تھی۔

اس نے شروع ہی سے اس ماحول کو ناپسند کیا اور جو کچھ یہاں ہو رہا تھا اس سے نفرت کی۔ اس کو اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ جو کچھ اس کی ماں یہاں کر رہی ہے اور جو کچھ دوسری عورتیں اور لڑکیاں کر رہی ہیں کل جوان ہونے کے بعد اس کو خود بھی یہی سب کچھ کرنا ہو گا لیکن وہ اس کے لئے اپنے آپ کو قطعی تیار نہیں پاتی تھی۔

جب وہ نویں کلاس میں آئی تو جوانی کے قدموں کی بڑھتی ہوئی چاپ سن سن کر پریشان اور خوفزدہ ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے جوان ہوتے ہی اسے بھی دھندے سے لگا دیا جائے گا' پھر نئے نئے گاہک اس کے جسم کو بے رحمی کے ساتھ آلودہ کرتے رہیں گے۔ وہ اس سے بچنا چاہتی تھی۔

اس نے اپنی ماں سے درخواست کی کہ وہ اسے ہاسٹل میں داخل کرا دیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اس کو کثیف اور ناپسندیدہ ماحول سے باہر نکلنے کا موقع مل سکے گا اور پھر شاید وہ زندگی میں کوئی دوسرا راستہ اپنا سکے لیکن اس کی ماں نے اسے ہاسٹل میں داخل کروانے سے صاف انکار کر دیا۔

اس سے اگلے روز جب مہ پارہ ڈرائیور قاسم علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہوئی اسکول جا رہی تھی تو اس کی بے ساختہ سسکیوں کی آواز سن کر ڈرائیور قاسم علی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا۔ "ارے.......... مہ پارہ بی بی! تم کیوں رو رہی ہو؟"

اور یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ قاسم علی نے مہ پارہ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس وقت اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا کہ وہ مہ پارہ کی مدد کس طرح کرے گا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ وہ بھلا اس قدر مالدار اور طاقتور عورتوں سے کیا ٹکر لے سکتا تھا جن کے دروازے پر بڑے بڑے پولیس افسران اور

اعلیٰ حکام آ کر ماتھا ٹیکتے تھے۔

لیکن نیک دل اور دردمند قاسم علی نے کسی نہ کسی طرح مہ پارہ کے بچاؤ کی صورت نکال ہی لی۔ اس نے اپنے کچھ قابل اعتماد اور حوصلہ مند رشتے داروں سے بات کی جو کوئٹہ میں رہتے تھے اور انہیں سارے حالات بتا کر اس بات کے لئے راضی کر لیا کہ وہ اس لڑکی کو خاموشی سے پناہ دے دیں جو عزت کی زندگی گزارنے کی خواہشمند تھی۔ قاسم علی کے یہ رشتے دار بالکل معمولی حیثیت کے لوگ تھے اور ان کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے مہ پارہ کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور قاسم علی نے اس دن جس دن میٹرک کا آخری پرچہ تھا پہلے سے کی ہوئی ساری تیاریوں کے ساتھ مہ پارہ کو کوئٹہ روانہ کر دیا۔ مہ پارہ نے اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر بند لفافہ قاسم علی کو پہلے ہی دے دیا تھا۔ اس کی ماں اس کی تحریر کو خوب پہچانتی تھی۔ مہ پارہ ابھی نابالغ تھی اس لئے ان لوگوں کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی اور تجربہ کار و جہاں دیدہ قاسم علی نے اپنے رشتے دار کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ ”تقریباً چار سال کا عرصہ کسی نہ کسی طرح نکالنا ہے۔ پھر وہ بالغ ہو جائے گی اور اسے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہو گا۔ تب تک اس کی حفاظت کرنا تم لوگوں کا کام ہے۔ اگر ان لوگوں نے اسے تلاش کر لیا اور اپنے ساتھ لے گئے تو وہ اسے کنجری بنا دیں گے اور وہ شریف لڑکی کنجری نہیں بننا چاہتی۔“

قاسم علی کے رشتے داروں نے چار سال تک اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح مہ پارہ کی حفاظت کی۔ اس دوران قاسم علی بھی کئی بار اس سے ملنے کے لئے آیا۔ مہ پارہ نے جو برقع اوڑھ کر کالج جاتی تھی، انٹر اور پھر بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔

اس کے بعد مہ پارہ ایک بار پھر کراچی آ گئی لیکن اب اس کو کسی کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ قانونی طور پر بالغ تھی اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق رکھتی تھی۔ اسے اب کوئی فکر نہیں تھی۔

قاسم علی اس وقت تک وزیر بیگم کے پاس سے ملازمت چھوڑ چکا تھا اور اب وہ اپنی ٹیکسی چلاتا تھا۔ جو اس نے قسطوں پر خریدی تھی۔ اس کام میں اس کو کہیں زیادہ آمدنی تھی۔ اس نے ناظم آباد میں ایک اچھا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا جس میں وہ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ مہ پارہ بھی وہیں آ گئی اور آتے ہی اس نے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کے کورس میں داخلہ لے لیا۔

جس دن سے وہ کراچی سے گئی تھی اس دن سے اس کے دماغ میں یہ منصوبہ موجود

تھا کہ اس کو خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے اور کسی کا محتاج بن کر نہیں رہنا ہے۔ اس کے حالات میں اس بات کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مزید کسی کی دست نگر بنی رہے۔

کورس مکمل کرتے ہی اس نے نوکری کی تلاش شروع کر دی اور جلد ہی اس کو نوکری مل گئی۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی نوکری تھی اور اس کے باس کا نام بدرالحسن تھا۔

پھر حالات نے عجیب پلٹا کھایا اس کا باس بدرالحسن، جو اب بے اولاد رنڈوا تھا اور عمر میں اس سے دوگنا تھا اس میں دلچسپی لینے لگا اور اس نے اس کو شادی کی پیشکش کر دی۔ مہ پارہ نے تو کبھی یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ اس کا باس اس سے شادی کر درخواست کرے گا۔

ابھی تک مہ پارہ کی اپنی کوئی پسند نہیں تھی اور اس نے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ بلوچستان سے آنے کے بعد قاسم علی کے گھر والوں کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن یہ بات ظاہر تھی کہ وہ ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔

مہ پارہ نے اپنے باس کو اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں اور اس کی پرورش اس کے ایک رشتے کے چچا نے کی ہے جو معمولی حیثیت کے مالک ہیں اور ان کی ایک ٹیکسی ہے جسے وہ خود ہی چلاتے ہیں۔

مہ پارہ اتنی خوبصورت، اتنی پُرکشش اور اتنی پُرجمال تھی کہ اس سے دوگنی عمر کا بدرالحسن باقی تمام خامیوں کو آسانی سے نظرانداز کر سکتا تھا۔

لیکن مہ پارہ کے لئے کوئی فیصلہ کرنا بہت دشوار تھا۔ وہ اس قسم کے معاملات میں بالکل ناتجربہ کار تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور تب اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے قاسم علی کو سب کچھ بتا دیا اور اس سے مشورہ کیا۔

قاسم علی نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ اس پیشکش کو قبول کر لے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق بدرالحسن ایک ایسا آدمی تھا جو مہ پارہ کو مکمل تحفظ فراہم کر سکتا تھا۔ وہ مالی طور پر ایک بے حد مستحکم آدمی تھا اور اس سے شادی کرنے کے بعد مہ پارہ فکرِ معاش کی طرف سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو سکتی تھی۔

مہ پارہ نے خود بھی اس خیال سے اتفاق کیا۔ وہ اب تک بڑی بے یقینی کے حالات میں زندگی بسر کرتی آئی تھی اور اب تک وہ اپنی ماں اور اس کے ساتھیوں کے خوف سے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد نہیں کرا پائی تھی گو کہ اب وہ قانونی طور پر بالغ ہو چکی تھی۔ اسے دوسری، عام لڑکیوں کے مقابلے میں، تحفظ کی کچھ زیادہ ہی ضرورت تھی اور یہ

تحفظ اسے کسی غریب اور بے وسیلہ نوجوان کے مقابلے میں ایک مالدار اور باوسائل آدمی زیادہ بہتر طور پر فراہم کر سکتا تھا۔ مہ پارہ تو شروع سے ہی عدم تحفظ کے احساس کا شکار رہی تھی۔ جب وہ اس بڑے سے شاندار گھر میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی تو اس وقت بھی مکمل عدم تحفظ کے احساس کا شکار تھی اور وہاں سے آنے کے بعد بھی وہ ہمیشہ خوفزدہ رہی اور اب تک تھی۔ بدرالحسن کی صورت میں اسے ایک بہت مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا ملا۔ اس نے اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھا اور اس سہارے کو قبول کر لیا۔

شادی کے فوراً بعد بدرالحسن نے مہ پارہ کو دفتر میں کام کرنے سے منع کر دیا اور مہ پارہ اب گھر پر ہی رہنے لگی۔ بدرالحسن بہت دولت مند آدمی تھا اور مہ پارہ تنگدستی کے تقریباً پانچ سال گزارنے کے بعد ایک بار پھر نہایت فراغت اور خوش حالی کی زندگی گزارنے لگی اور خوش حالی کے پہلے دور میں اور اس دور میں فرق یہ تھا کہ اس دور میں وہ مکمل طور پر آزاد اور خودمختار تھی۔ اس کے پاس ڈھیروں روپیہ موجود رہتا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکتی تھی۔

شادی کے تقریباً ایک سال کے بعد قاسم علی کا انتقال ہو گیا اور اس طرح وہ کڑی بھی ٹوٹ گئی جو مہ پارہ کو اس کی پرانی دنیا سے کسی نہ کسی طرح وابستہ کئے ہوئے تھی۔

شادی کے ڈیڑھ سال کے بعد حارث پیدا ہوا اور ابھی تک وہ ان دونوں کی واحد اولاد تھا۔

مہ پارہ نے اپنے بارے میں یہ سب کچھ بتا دیا اور خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر تک فضا پر بوجھل خاموشی طاری رہی۔

"امی! میں نے آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔" قدرے توقف کے بعد مہ پارہ نے آہستہ سے کہا۔ "بس آپ اتنی مہربانی کیجئے گا کہ جب بدرالحسن ہوش میں آ جائیں تو .... انہیں اپنے بارے میں کچھ نہ بتایئے گا .... مگر مجھے کیا معلوم کہ وہ آپ کے بارے میں پہلے سے کیا کچھ جانتے ہیں .... وہ تو آپ سے واقف ہیں .... اور اب اس بات سے بھی واقف ہو گئے ہیں کہ آپ میری ماں ہیں۔"

"شرمندہ مت ہو مہ پارہ!" گلنار نے بہت دھیمی اور نیم مردہ آواز میں کہا۔ "بدرالحسن کو جب ہوش آ جائے گا تو وہ تم سے ناراض نہیں ہو گا .... بالکل نہیں .... وہ تم سے کچھ نہیں کہے گا .... یہ میرا ذمہ ہے۔"

گلنار نے اس دوران سوچ لیا تھا کہ بدرالحسن کے ہوش میں آنے کی صورت میں وہ

اس سے کیا کہے گی .... وہ اس سے کہے گی کہ فی الحال وہ مہ پارہ کو اس کی ولدیت کے بارے میں کچھ نہ بتائے اور اپنی زبان بند رکھے ورنہ .... مہ پارہ مر جائے گی .... بدرالحسن کی بیٹی .... بدرالحسن کی بیوی .... بدرالحسن کے بیٹے کی ماں .... اس کے "ولی عہد بہادر" کی ماں' مر جائے گی۔

"گلنار بی بی دعا کرو۔" نورن نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ "دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور تم بھی بیٹی مہ پارہ تم بھی دعا کرو .... خالی مت بیٹھو۔ مصلیٰ بچھا لو' دعا کرو .... دعا کرو .... میں یہاں بیٹھی ہوں۔ اگر کوئی کچھ بتانے کے لئے آئے گا تو میں سننے کے لئے موجود ہوں۔ یہاں بیٹھی ہوں میں۔"

"ہاں .... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں خالہ!" مہ پارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم لوگوں کو دعا مانگنی چاہئے۔ اس وقت دعا کی سخت ضرورت ہے۔"

"دوا کے ساتھ دعا بھی ہونی چاہئے۔" نورن نے کہا۔ "یہ لو۔" اس نے اپنی چادر اتار کر دیتے ہوئے کہا۔ "بالکل پاک چادر ہے' آج ہی الماری میں سے رکھی ہوئی نکالی تھی۔ اسے فرش پر بچھا لو۔"

لاؤنج کے فرش پر قالین پہلے سے بچھا ہوا تھا۔ مہ پارہ نے جلدی سے اس پر چادر بچھا لی اور دونوں ماں بیٹیاں اس پر بیٹھ کر دست بہ دعا ہو گئیں۔

ایک شخص' زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا اندر کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور کمرے کے باہر لاؤنج میں دو عورتیں مصلیٰ بچھائے ہوئے ہاتھ اٹھائے ہوئے اس کے لئے دعا کر رہی تھیں لیکن ان دونوں کی دعائیں ایک جیسی نہیں تھیں۔

اگر مہ پارہ کو معلوم ہو جاتا کہ اس کی ماں اس وقت کیا دعا مانگ رہی ہے تو اس کا دماغ پھٹ جاتا۔

"یا پاک پروردگار میرے شوہر کو زندگی دے۔" مہ پارہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ "ان کو ٹھیک کر دے میرے مالک اپنے حبیب پاک کے صدقے .... ان کو صحت دے میرے مولا .... یا غفور الرحیم .... ان کو اچھا کر دے۔"

"یا پاک پروردگار' بدرالحسن کو اٹھا لے۔" گلنار دعا مانگ رہی تھی۔ "اس کو اب ٹھیک نہ کرنا میرے مالک! اپنے حبیب پاک کے صدقے .... اس کو موت دے میرے مولا .... یا غفور الرحیم! اس کو ختم کر دے۔"

دونوں کی اپنی اپنی دعائیں تھیں' گلنار تو مہ پارہ کی دعا سے بخوبی واقف تھی لیکن مہ پارہ گلنار کی دعا کو کبھی بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔

گلنار کو بدرالحسن سے دشمنی نہیں تھی اور نہ اس کی یہ بددعا کسی نفرت کا نتیجہ تھی۔ یہ بددعا وہ پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ دے رہی تھی۔ بدرالحسن اور مہ پارہ کے درمیان نادانستگی کے عالم میں جو کچھ ہو چکا تھا اس کا اب اس سے بہتر حل کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا کہ بدرالحسن مر جائے .... بدرالحسن زندہ رہ کر اس بھیانک صدمے کو کس طرح جھیل سکتا تھا؟ وہ مہ پارہ سے کیا کہہ سکتا تھا؟ اس کو کیا بتا سکتا تھا؟ اور یہ سب کچھ جاننے کے بعد مہ پارہ کا کیا حال ہوتا؟ بڑا خوفناک اور خون آلود المیہ تھا۔ مہ پارہ کو بچانے کے لئے ضروری تھا کہ اسے اس بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہو اور اس کی سب سے بہتر صورت یہ تھی کہ دل کے شدید دورے کا شکار بدرالحسن اس دورے سے جانبر نہ ہو سکے اور ختم ہو جائے۔ گلنار کے خیال میں خود بدرالحسن کی بہتری بھی اسی میں تھی کہ وہ مر جائے' کیونکہ اس کے بعد وہ جب تک زندہ رہتا اس کی زندگی ایک مسلسل عذاب کا شکار رہتی۔

گلنار بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی بیٹی کے بیوہ ہونے کی' اس کے شوہر کی موت کی دعائیں مانگتی رہی۔

مہ پارہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے سہاگ کی سلامتی' اپنے شوہر کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہی۔

دونوں دعائیں' دلوں کی گہرائیوں سے پوری سچائی کے ساتھ نکلنے والی دعائیں' عرش بریں کی طرف جا رہی تھیں۔ دونوں بالکل سچے جذبوں پر مبنی تھیں' دونوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھا اور دونوں دو اجڑتے ہوئے' اجڑے ہوئے دلوں کی صدائیں تھیں اور دونوں ہی بہتری کی خواہاں تھیں۔

دو متضاد دعائیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی ایک دوسرے سے متصادم آسمانوں کی جانب اپنے اپنے سفر پر روانہ تھیں۔ دونوں ماں بیٹیاں بہت دیر تک دعائیں مانگتی رہیں اور پھر جب وہ مصلے پر سے اٹھیں تو دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دونوں کے رخسار نم ہو رہے تھے۔

جس وقت سے بدرالحسن پر دل کا دورہ پڑا تھا اس وقت سے اب تک ایک سوال کئی بار مہ پارہ کے ذہن میں سر ابھار چکا تھا۔ "امی کو دیکھتے ہی بدرالحسن کی طبیعت کیوں خراب

ہو گئی؟" لیکن اس سوال میں اتنی زیادہ شدت نہیں تھی۔ بدرالحسن پر پہلے بھی ایک بار ہلکا سا اٹیک ہو چکا تھا اور دوبارہ کبھی بھی اٹیک ہو سکتا تھا۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ اس نے اس سوال کو آہستہ آہستہ اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔

رات ڈھل رہی تھی۔ اب آخری پہر تھا اور دو تہائی رات گزر چکی تھی لیکن یہاں ہسپتال کے اس حصے میں اتنی رات گزر جانے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ یہاں خوب روشنی ہو رہی تھی' ہر طرف لائٹیں جل رہی تھیں اور کوئی نہیں سو رہا تھا۔ یہاں جتنے لوگ بھی موجود تھے وہ سب جاگ رہے تھے۔ نرسیں' ڈاکٹر اور دوسرے کارکن اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے اور وہ سب کے سب چاق و چوبند' مستعد' تیز تیز قدموں سے چلنے والے' پھرتیلے لوگ تھے۔ یہاں اضمحلال شب کی کوئی علامت موجود نہیں تھی۔

ان لوگوں کی آنکھوں سے بھی نیند کوسوں دور تھی۔ گلنار اور مہ پارہ تو مسلسل بیدار تھیں ہی' نورن بھی جاگ رہی تھی۔ گیارہ سال پہلے جب ایک دن مہ پارہ اچانک گھر سے غائب ہو گئی تھی تو گلنار کے غم میں نورن بھی شریک تھی اور آج جب مہ پارہ مل گئی تھی تو اس خوشی میں بھی نورن شریک تھی لیکن مہ پارہ کا ملنا بھی صدمے سے خالی نہیں تھا۔ اس کے شوہر پر اچانک دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔

مہ پارہ ابھی کچھ دیر پہلے اندر کمرے سے ہو کر آئی تھی اور اس نے ڈاکٹر سے اپنے شوہر کے بارے میں بات کی تھی۔ ڈاکٹر نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے بس یہی کہا تھا کہ مریض کی جان بچانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد گلنار اٹھی اور کمرے کے دروازے کے پاس پہنچی۔ اس نے بہت آہستہ سے شیشے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ اندر ایک دو منٹ سے زیادہ رکنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سیدھی ڈاکٹر کے پاس پہنچی جو اس وقت ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور پوری طرح متوجہ تھا۔ گلنار اس سے پہلے بھی کئی بار ڈاکٹر سے بات کر چکی تھی۔

"اب .... کیا حال ہے ڈاکٹر صاحب!" گلنار نے پوچھا۔

"ان کی وائف تو باہر بیٹھی ہیں نا؟" ڈاکٹر نے کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا اور گلنار نے اثبات میں جواب دیا۔

"انہیں جانے مت دیجئے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "مریض کی حالت اچھی نہیں ہے۔"

"یااللہ خیر۔" گلنار کی زبان سے نکلا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شاید خدا نے اس کی سن لی تھی۔ اس کی دعا کو شرفِ قبولیت حاصل

ہونے والا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب کہ .... مریض .... کے جانبر ہونے کے امکانات نہیں ہیں؟" گلنار اپنی دلی خوشی کو چھپاتے ہوئے اپنے لہجے میں تشویش اور دکھ کا رنگ بھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"زندگی اور موت تو ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ لوگ بھی دعا کیجئے۔"

گویا اب معاملہ محض دعاؤں پر آ گیا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر تقریباً ناامید ہو چکے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب .... اگر ضرورت سمجھیں تو کچھ اور اسپیشلسٹوں کو..........."

"ہم پہلے ہی اس کا بندوبست کر چکے ہیں۔" ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "ان کی وائف نے ان کے فیملی فزیشن کو بھی بلوایا تھا۔ وہ بھی ابھی آ کر گئے ہیں۔ مزید کسی ڈاکٹر کے آنے کی اور دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے' جو کچھ انسانی اختیار میں ہے ہم وہ کر رہے ہیں۔"

گلنار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بدرالحسن کے بیڈ کے پاس گئی۔ بدرالحسن بیڈ پر بے سدھ پڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے سرہانے لگا ہوا مانیٹر اس کے دل کی دھڑکنوں کا حساب بتا رہا تھا لیکن گلنار اس حساب کتاب کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

بدرالحسن کا چہرہ گلنار کی نظروں کے سامنے تھا اور اس کے ماتھے پر داہنی آنکھ کے اوپر وہ گہرا سیاہ نشان آج بھی اسی طرح موجود تھا جس کے بارے میں برسوں پہلے اس کے استفسار پر بدرالحسن نے بتایا تھا کہ بچپن میں ایک بار وہ درخت پر سے گر پڑا تھا اور اس کی آنکھ ضائع ہونے سے بال بال بچ گئی تھی۔ یہ نشان تب سے موجود تھا جوں کا توں اور یہ وہ نشان تھا جس کی مدد سے گلنار کو چھبیس سال کے بعد بھی بدرالحسن کو پہچاننے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس نشان کے علاوہ اور جس چیز نے گلنار کی مدد کی تھی وہ تھی بدرالحسن کی آواز۔

مگر اب بدرالحسن خاموش تھا' اس کی آنکھ کے اوپر' ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا .... وہ خاموش تھا .... اس کی آنکھیں خاموش تھیں .... سب کچھ خاموش تھا۔

"اے میرے مولا .... پاک بے نیاز۔" گلنار کے دل کی گہرائیوں سے درد میں

ڈوبے ہوئے' بے صوت و صدا الفاظ نکلنے شروع ہو گئے۔ "اس کی خاموشی کو مستقل کر دے میرے مالک یا پاک پروردگار! اب یہ اس بستر سے زندہ نہ اٹھے۔ اس کو اٹھا لے میرے مولا .... اس بدنصیب کو اپنے پاس بلا لے مالک .... اس کی مشکل آسان کر دے۔ اگر یہ بچ گیا تو یہ زندہ درگور ہو جائے گا میرے مولا .... یہ جیتے جی مر جائے گا۔ اس سے پہلے ہی اس کو ختم کر دے میرے مالک!"

"اب آپ پلیز باہر چلی جائیں۔" ڈاکٹر نے گلنار سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔ اس کمرے میں ہر بات سرگوشی میں ہوتی تھی۔ بڑا پُراسرار اور سہا سہا ماحول تھا یہاں کا۔ ہر شخص خوفزدہ معلوم ہوتا تھا' ڈاکٹر بھی' اسٹاف بھی' مریضوں کے لواحقین بھی' سب کے اعصاب پر خوف مسلط رہتا تھا' موت کا خوف .... جو سب سے زیادہ اذیت ناک اور عذاب انگیز خوف ہوتا ہے۔

گلنار نے بدرالحسن کے چہرے پر آخری نظر ڈالی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"کیسے ہیں وہ؟" مہ پارہ نے گلنار کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ شاید وہ اپنے سوال کا جواب اس کے چہرے پر ہی پڑھ لینا چاہتی تھی۔

"ابھی تو ویسے ہی ہیں۔" گلنار نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ وہ اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں کہنا چاہتی تھی۔ "بس بیٹی خدا بہتر کرے گا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

کافی دیر گزر گئی' وہ تینوں بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ گلنار' مہ پارہ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر مہ پارہ زیادہ تر خاموش تھی۔ اس کا دماغ تو صدموں سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی ماں کے جذبہ تجسّس کی تسکین کی غرض سے اس کو مختصر اپنے بارے میں بتا دیا تھا اور اس نے اپنی ماں سے بھی یہ معلوم کر لیا تھا کہ وہ اس وقت کہاں رہتی اور "کیا کرتی ہے۔"

گلنار نے اس کو اپنے بارے میں سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا تھا۔

وقت بہہ رہا تھا' دھیرے دھیرے لیکن ایک تسلسل کے ساتھ' ایک مقررہ آہنگ کے ساتھ' لمحے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ رات ختم ہونے والی تھی' صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔

مہ پارہ کافی دیر سے اپنے شوہر کے پاس نہیں گئی تھی۔ وہ اٹھ کر جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ڈاکٹر لاؤنج میں داخل ہوا اور سیدھا مہ پارہ کے پاس پہنچا۔

وہ تینوں ڈاکٹر کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں اور جو کچھ اس چہرے پر لکھا ہوا تھا وہ اس کو پڑھ سکتی تھیں۔

گلنار کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے بڑھ گئیں۔ اس کی سانسیں ناہموار ہو گئیں۔ "شاید خدا نے میری سن لی۔"

"مجھے افسوس ہے مسز حسن!" ڈاکٹر آہستہ آہستہ مسز مہ پارہ بدرالحسن سے کہہ رہا تھا۔ "ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی .... لیکن جو خدا کو منظور .... ہم نے باڈی یہاں سے ہٹوا دی ہے .... ایمبولینس کا بندوبست موجود ہے.........."

مہ پارہ کو غش آ گیا۔ نورن نے جلدی سے اس کو سہارا دیا۔ گلنار کے دل میں اطمینان اور سکون کی ٹھنڈی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وہ ایک دم سے خود کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگی تھی۔

آج سہ پہر سے لے کر اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ روح فرسا اور ہولناک باب تھا اور اب ڈاکٹر کی زبان سے نکلنے والے ان الفاظ کے ساتھ ہی' یہ باب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔

گلنار کے علاوہ مہ پارہ کو یہ بتانے والا اب کوئی نہیں تھا کہ اس کا مرحوم شوہر بدرالحسن دراصل اس کا باپ تھا۔ نورن کو اس معاملے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور بدرالحسن مر چکا تھا۔ گلنار نے اپنے آپ کو ایک نہایت دہشت انگیز اور وحشت ناک عذاب سے رہائی پاتے ہوئے محسوس کیا۔ موجودہ حالات میں تو بدرالحسن کی موت گلنار کے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث تھی لیکن ویسے بھی اسے بدرالحسن کی موت کا کوئی خاص افسوس نہ ہوتا کیونکہ اس کو اس سے کوئی دلی لگاؤ نہیں تھا۔

گلنار کو بڑی حد تک امید تھی کہ بدرالحسن کی موت کے بعد مہ پارہ اس کو اپنے پاس بلا لے گی۔ بدرالحسن بے تحاشہ دولت چھوڑ کر مرا تھا۔ کیا شاندار مکان تھا جس میں وہ مہ پارہ کے ساتھ رہتا تھا۔ کیا دولت کی فراوانی تھی۔ مہ پارہ تو واقعی کسی شہزادی کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔

"مگر میں تنہا کس طرح اس کے ساتھ رہ سکوں گی؟" وہ دل ہی دل میں سوچتی۔ "نورن کہاں جائے گی؟ وہ بے چاری تو میرے دم کے ساتھ ہے۔ میں اسے اپنے سے الگ نہیں کر سکتی۔ ٹھیک ہے' میں مہ پارہ سے کہوں گی کہ وہ میرے ساتھ ساتھ نورن کو بھی اپنے پاس رکھ لے۔"

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ مہ پارہ نے گلنار سے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ وہ اس کے گھر آ کر اس کے ساتھ رہے۔ گلنار اور نورن سوئم کے دن تک تو اس کے ساتھ رہیں اور پھر جب سوئم کی شام کو گلنار نے مہ پارہ سے کہا کہ اب وہ اپنے گھر جا رہی ہے تو مہ پارہ نے اس کو روکنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔

گلنار اپنے گھر چلی آئی۔ اس پر گہری افسردگی طاری تھی اور وہ سارے راستے روتی ہوئی آئی تھی۔ نورن اس کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ اس کے اصل دکھ کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔

آنے والے دنوں کے دوران گلنار کئی بار اپنی بیٹی کے گھر گئی۔ زیادہ تر نورن اس کے ساتھ ہوتی تھی اور کبھی کبھی وہ اکیلی بھی ہوتی تھیں مہ پارہ تو ابھی گھر سے نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ عدت کے دن گزار رہی تھی۔

بدرالحسن کے چہلم کے روز جب کافی رات گئے گلنار اپنی بیٹی سے اس وقت رخصت ہونے لگی جب زیادہ تر مہمان جا چکے تھے تو مہ پارہ نے گلنار کو ایک طرف لے جا کر آہستہ سے کہا۔ "امی! دیکھئے .... اب آپ اور نورن آنٹی یہاں نہ آیا کریں تو بہتر ہے۔ دیکھئے نا .... میں نے یہاں کسی کو نہیں بتایا ہے کہ آپ میری امی ہیں۔ دوسروں کے سامنے میں آپ کو آنٹی کہتی ہوں اور میں نے یہی بتا رکھا ہے کہ آپ میری کوئی دور کی عزیزہ ہیں۔ دیکھئے امی بُرا مت مانئے گا .... ہو سکتا ہے یہاں کوئی ایسا شخص نکل آئے جو آپ کو پہچانتا ہو اور پہچان لے جس طرح بدرالحسن نے آپ کو پہچان لیا تھا .... تو آپ خود ہی اندازہ لگایئے کہ میری کیا پوزیشن ہو گی.........."

گلنار کا جسم جیسے زمین کے اندر دھنسا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل شل اور مُردہ محسوس کرنے لگی۔

"ہاں' ہاں بیٹی ٹھیک ہے۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جلدی جلدی کہا۔ "میں تمہاری مجبوریاں بخوبی سمجھتی ہوں۔"

"ہاں امی! دیکھئے نا' بدرالحسن ایک شریف آدمی تھے' ایک معزز اور نامور آدمی .... اور میں ان کی بیوی ہوں۔ اگر میرا آپ سے تعلق ظاہر ہو گا تو.........."

"نہیں' نہیں بیٹی!" گلنار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم پریشان مت ہو میری بچی .... میں تمہاری عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔ بدرالحسن واقعی ایک شریف اور عزت دار آدمی تھا۔"

"آپ کے پاس فون تو موجود ہے' آپ جب چاہیں مجھے فون کر لیا کریں۔ میں تو زیادہ تر گھر پر ہی ہوں گی۔" مہ پارہ اسے بتا رہی تھی۔ "میں خود بھی آپ کو فون کر لوں گی۔ پھر عدت کے بعد میں خود ہی فون کر کے آپ کے پاس آؤں گی۔"

"اچھا بیٹی!" گلنار نے کہا۔ "خدا تمہیں خوش رکھے۔" اور وہ نورن کو ساتھ لے کر وہاں سے چلی آئی۔

مہ پارہ نے اسے کبھی فون نہیں کیا' یہاں تک کہ اس کی عدت کی مدت بھی ختم ہو گئی۔ گلنار خود ہی کبھی کبھی اس کو فون کر کے اس کی خیریت پوچھ لیتی تھی لیکن فون پر ہونے والی اس گفتگو کے دوران مہ پارہ نے کبھی بھولے سے ایک بار بھی گلنار سے یہ نہیں کہا کہ وہ اس کے گھر آئے' ملاقات کے لئے تو اس نے ہلکا سا اشارہ بھی نہیں دیا۔

جس دن مہ پارہ کی عدت اترنے والی تھی اس دن صبح سے گلنار کے دل و دماغ میں ایک لاوا پک رہا تھا اور یہ لاوا سارا دن پکتا رہا۔ کس کا شوہر مرا تھا' کون بیوہ ہوئی تھی' کس کی عدت اتر رہی تھی؟ بڑے دہشت ناک اور خون آشام سوالات تھے۔

اس سے ایک روز پہلے گلنار نے مہ پارہ کو فون کیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ اگلے دن یعنی عدت اترنے والے دن اس کے لئے جوڑا وغیرہ لے کر آنا چاہتی ہے لیکن مہ پارہ نے فون پر ہی اس کو منع کر دیا تھا۔

"نہیں۔" مہ پارہ نے کہا تھا۔ "یہ کچھ مناسب نہ ہو گا۔ بدرالحسن کی بہن اور بھاوج وغیرہ آئیں گی' آپ کا ان لوگوں کے سامنے آنا کچھ ٹھیک نہیں رہے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹی!" گلنار نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔"

"اب تو میں گھر سے نکل سکوں گی۔" مہ پارہ نے جلدی سے کہا۔ "میں خود کسی دن آپ کی طرف آؤں گی۔ آپ کا پتہ تو مجھے معلوم ہی ہے' میں فون کر کے آؤں گی۔"

"ضرور آنا بیٹی!" گلنار نے کہا اور فون بند کر دیا۔ نورن اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"اس کی باتوں کا بُرا مت مانا کرو گلنار بی بی!" نورن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "آخر وہ ایک عزت دار عورت ہے۔ ایک عزت دار آدمی کی بیوی .... ہم لوگ اگر وہاں زیادہ آئیں جائیں گے تو یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"ہاں نورن!" گلنار نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ واقعی ایک عزت دار آدمی کی بیوی ہے۔" اور اس سے اگلے الفاظ اس نے صرف دل ہی دل میں کہے۔ "اور ایک عزت دار آدمی کی بیٹی بھی۔"

بدرالحسن کے انتقال کو کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا اور اس دوران ماں بیٹی کی ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ فون پر ہی بات صرف اس وقت ہوتی تھی جب گلنار خود فون کرتی تھی۔ مہ پارہ نے اسے کبھی فون نہیں کیا تھا۔ گلنار کو آرزو ہی رہی کہ مہ پارہ خود بھی کبھی اسے فون کر لے۔

بدرالحسن تو مر چکا تھا اور اس کی موت نے مہ پارہ کو بچا لیا تھا جو اپنے باپ کی بیوی بن کر اس کے بچے کی ماں بن چکی تھی لیکن گلنار کے دل میں دہکنے والا یہ داغ ہر وقت تپتا رہتا تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اور جس سے مہ پارہ بالکل ناواقف تھی اس کے لئے ذمہ دار کون تھا؟ سوچتے سوچتے اس کا دماغ پھٹنے لگتا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ بدرالحسن مر چکا تھا ورنہ گلنار شاید اس کو اپنے ہاتھ سے مار دیتی اور خود کو بھی ہلاک کر لیتی۔

اور ماہ پارہ اس مرگ آفریں کرب سے یکسر بے نیاز اور ناواقف اپنی زندگی کو نئے سرے سے منظم کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی اس نئی زندگی میں بھی گلنار کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مہ پارہ بہت بڑی دولت' کاروبار اور جائداد وغیرہ کی مالک تھی اور مرنے والے کے ساتھ آدمی خود تو نہیں مر جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے اور زندگی کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

انہی دنوں نورن بہت بیمار ہو گئی۔ گلنار نے اس کا بہترین علاج کروایا لیکن اس کے جانبر ہونے کے امکانات نہیں تھے۔ اس کے پیٹ میں کینسر تھا اور اس کا علم ڈاکٹروں کو صرف اسی وقت ہو سکا جب یہ لاعلاج ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے گلنار کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔

کوئی دو ماہ کے بعد ہی نورن مر گئی۔ نورن کیا مری جیسے گلنار کی دنیا لٹ گئی۔ ایک طویل عرصے سے نورن ہی تو اس کی دکھ سکھ کی ساتھی تھیں وہ دونوں تو جیسے ایک ساتھ سانس لیتی تھیں اور ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتی تھیں اور اب نورن اس کو تنہا چھوڑ کر چپکے سے چل دی تھیں

گلنار نے مہ پارہ کو فون کیا۔ "تمہاری نورن آنٹی کا انتقال ہو گیا۔ آج بعد ظہر تدفین ہو گی۔"

"اوہ .... بہت افسوس کی بات ہے۔" مہ پارہ کی آواز جذبات کی کسی بھی گرمی سے خالی تھی۔ "دیکھئے میں آنے کی کوشش کروں گی .... اور اگر نہ آ سکوں

تو..........“

”تو کوئی بات نہیں۔“ گلنار نے کہا اور آہستہ سے فون بند کر دیا۔

وہ مہ پارہ کی مجبوری سمجھتی تھی۔ تعزیت کے لئے آنے والوں میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہو سکتی تھیں جو مہ پارہ کو گلنار کی بیٹی کی حیثیت سے لیتیں اور مہ پارہ اس دنیا کا حصہ نہیں تھی۔

نورن کی موت کے دن اور اس کے بعد بھی مہ پارہ وہاں نہیں آئی۔

نورن کی موت کے بعد گلنار کی زندگی کسی مردہ ریگستان کی طرح اجاڑ اور ویران ہو کر رہ گئی جس میں تیز و تند گرم بگولوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ سرد ہوا کے کسی جھونکے کا دور دور تک وجود نہیں تھا۔ نورن جب تک تھی تو دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر کے خوش اور مطمئن ہوتی تھیں۔ دونوں کی رفاقت ایک دوسرے کا بہت بڑا سرمایہ تھی لیکن اب گلنار اکیلی رہ گئی تھی۔ اپنی تنہائی اور محرومی کا زہر چاٹنے کے لئے اکیلی۔

سب جا چکے تھے‘ سب چلے گئے تھے‘ سب اس کی زندگی سے نکل گئے تھے۔ وہ بھی جو مر چکے تھے اور وہ بھی جو زندہ تھے۔ اماں چلی گئیں‘ ابا چلے گئے‘ مہ پارہ چلی گئی‘ اس سے الگ ہو گئی اور اب .... اب نورن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

بڑھاپے کی عمر میں کسی کی رفاقت ایک بہت بڑی انسانی ضرورت ہوتی ہے اور اگر کوئی رفیق و غمگسار میسر ہو تو زندگی کے بوجھل دنوں کی اکتاہٹ میں کافی کمی آ جاتی ہے۔ گلنار اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ اس کو نورن کی رفاقت حاصل تھی لیکن پھر اس کی یہ خوش قسمتی ختم ہو گئی۔ نورن چپکے سے اس دنیا سے سدھار گئی۔

اور اب اس کی حالت یہ تھی کہ گھر میں کوئی اس سے بات کرنے والا نہیں تھا۔ صبح کو جب وہ سو کر اٹھتی اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو جاتی تو کافی دیر تک اخبار پڑھتی رہتی اور خبروں کو باآواز بلند پڑھتی جیسے وہ انہیں کسی کو سنا رہی ہو‘ وہ یہ خبریں نورن کو سناتی تھی۔

نورن مطلق پڑھی لکھی نہیں تھی اور گلنار اسے روزانہ صبح اردو کے اخبارات میں سے اس کے مطلب کی خبریں پڑھ کر سناتی تھی اور نورن بڑے ذوق و شوق سے سنتی تھی اور اب بھی گلنار اخبار پڑھتے پڑھتے یہ بھول جاتی تھی کہ نورن اب یہاں موجود نہیں ہے‘ وہ نورن کے مطلب کی کسی خبر کو باآواز بلند پڑھنے لگتی تھی۔ پھر اسے یاد آ جاتا کہ نورن

یہاں نہیں ہے لیکن وہ پھر بھی خبریں سنائے جاتی اور نہ جانے کتنی بار‘ کتنی دیر تک‘ وہ بلند آواز میں نورن سے مخاطب ہو کر باتیں کرتی رہتی۔

صدموں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ زندگی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ سارا سینہ طرح طرح کے لو دیتے ہوئے‘ سلگتے ہوئے‘ داغوں سے بھرا ہوا تھا اور ان میں سب سے بڑا سب سے گہرا‘ سب سے زیادہ اذیت ناک داغ رشتوں کے اس گورکھ دھندے کا تھا جس میں مرحوم بدرالحسن اور مہ پارہ جکڑے ہوئے تھے۔

وہ اکثر دن اور رات کی تنہائیوں میں بیٹھی ہوئی اپنی عمر گزشتہ کے روز و شب کا حساب کیا کرتی تھی۔ اپنی زندگی کے سارے اوراق کو کھنگالتی تھی۔ مٹے مٹے حروف اور گھسی ہوئی سطروں کو پڑھنے کی کوشش کرتی تھی اور صرف ایک لفظ تھا جو اسے ساری عبارت میں ہر جگہ‘ سب سے زیادہ نمایاں نظر آیا تھا۔ تنہائی‘ وہ واقعی تنہا تھی۔ اس وقت سے لے کر جبکہ اس نے ہوش سنبھالا تھا اور شعوری زندگی کا آغاز کیا تھا آج تک جبکہ وہ اس فلیٹ میں اپنے بوڑھے وجود کے ساتھ زندگی کے آخری دن پورے کر رہی تھی‘ تنہائی ہی اس کی ساتھی رہی تھی۔ تنہائی ہی ایک ایسی رفیق دیرینہ‘ ایک ایسی مونس و غم خوار تھی جس نے کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ساری زندگی تنہا ہی رہی تھی۔ لوگوں کے ساتھ اور لوگوں کے درمیان ہونے کے باوجود وہ تنہا تھی اور آج بھی تنہائی کے ہی اثاثے کو سمیٹے ہوئے جی رہی تھی۔ اب کتنا اور جینا تھا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے‘ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بہت سے لوگ اس دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ کون جانے کب اس کی باری آ جائے‘ حالانکہ عمر تو ابھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ تقریباً چھپن برس کی تھی لیکن صدموں نے اس کو اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ اپنی اصل عمر سے کہیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی تھی اور وہ ذہنی طور پر بھی خود کو بہت بوڑھا محسوس کرتی تھی لیکن اب تو جو کچھ تھا بس یہی تھا اور اسی طرح اسی انداز میں زندہ رہنا تھا۔ زندہ رہنے کی اب کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ جو ناسور رِس رہے تھے انہیں تو اسی طرح رِستے رہنا تھا اور انہی ناسوروں کے ساتھ زندہ رہنا تھا‘ البتہ اب وقت آ گیا تھا کہ کچھ ضروری کام انجام دے دیئے جائیں۔

مہ پارہ نے بہت دنوں کے بعد فون پر اپنی ماں کی آواز سنی اور قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ”جی .... بول رہی ہوں۔“

”تم سے کچھ بہت ضروری باتیں کرنی ہیں بیٹی!“ گلنار نے کہا۔ ”کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے آ جاؤ یہ بہت ضروری ہے۔“

"میں .... وہاں آپ کے گھر؟" مہ پارہ خاصی پریشان ہو گئی تھی۔ "مگر.........."

"یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔" گلنار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی کے ساتھ کہا۔ "اور یہاں اس علاقے میں مجھے میرے ماضی کے حوالے سے کوئی نہیں جانتا .... تم ذرا دیر کے لئے چلی آؤ بالکل بے خوف ہو کر............ تمہیں پتہ سمجھائے دیتی ہوں۔"

اگلے روز شام کے چار بجے گلنار اپنے فلیٹ پر مہ پارہ کا انتظار کر رہی تھی۔ مہ پارہ کو وہاں پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی' آسان پتہ تھا۔

"آؤ مہ پارہ!" گلنار نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ سب سے پہلے تو تم کو اپنا یہ فلیٹ دکھا دوں اور یہاں کی چیزوں کے بارے میں بتا دوں۔"

مہ پارہ خاموش رہی اور گلنار اسے فلیٹ میں موجود بڑی بڑی چیزوں کے بارے میں بتانے لگی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مہ پارہ کو اس سب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"آؤ .... اب یہاں بیٹھو۔" اس نے مہ پارہ کو ڈائننگ روم میں لے جا کر بٹھایا اور پھر ایک لفافہ میز پر سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ اس فلیٹ کی گفٹ ڈیڈ ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے یہ فلیٹ مع اس کے تمام ساز و سامان کے تمہارے نام کر دیا ہے۔ تم اس ڈیڈ پر اپنے دستخط کرنے کے بعد اس کو کسی مجسٹریٹ سے اٹیسٹ کروا لینا پھر یہ فلیٹ اور اس میں موجود سارا ساز و سامان تمہارا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں اور یہاں رہ رہی ہوں اس وقت تک تو ظاہر ہے یہ سب کچھ میرے ہی تصرف میں رہے گا کیونکہ میرے پاس رہنے کے لئے کوئی دوسرا ٹھکانہ موجود نہیں ہے لیکن جب میری آنکھ بند ہو جائے گی تو تم ہی اس فلیٹ کی مالک ہو گی۔"

اپنی ماں کے یہ الفاظ سننے کے ساتھ ہی مہ پارہ بالکل ہی دوسری نظروں سے اس فلیٹ کو دیکھنے لگی۔ یہاں کی ہر چیز میں ایک نئے معنی پیدا ہو گئے تھے۔ پورے فلیٹ کی جیسے شکل ہی بدل گئی تھی۔ مہ پارہ نے پہلی بار غور کیا کہ چار کمروں پر مشتمل ایک بہت کشادہ اور روشن اور ہوادار فلیٹ کی مالیت کافی ہو گی۔

اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن گلنار نے اسے روک دیا۔ اس نے ایک چیک اس کی طرف بڑھایا۔

"میں نے وہاں سے آنے کے بعد اپنے پاس کوئی زیور نہیں رکھا تھا۔" اس نے کہا۔

"سب بیچ دیئے تھے۔ اوّل تو مجھے زیور کی ضرورت نہیں تھی اور دوسرے میں فلیٹ میں زیور رکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ رقم میں تم کو دے رہی ہوں' اسے لے لو۔"

"مگر........... امی! آپ خود..........." مہ پارہ کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔

"میرے پاس ابھی کچھ خاص ڈپازٹ سیونگز سرٹیفکیٹ موجود ہیں جن سے مجھے خاصا معقول منافع مل جایا کرے گا۔" اس نے کہا۔ "پہلے تو بہت سارے تھے لیکن پچھلے دنوں میں نے انہیں کیش کروا کر رقم بینک میں جمع کرا دی اور وہ رقم میں تم کو دے رہی ہوں۔ میں نے اپنے لئے بس اتنے سرٹیفکیٹ رکھ لئے ہیں جن کے منافع سے میرا آرام سے گزارہ ہوتا رہے اور کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اور جب میں اس دنیا میں نہ رہوں تو وہ سرٹیفکیٹ بھی تم ہی لے لینا کیونکہ میں نے نامنی میں تمہارا ہی نام لکھوایا ہے۔"

"امی .... آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟" مہ پارہ نے کمزور آواز میں کہا۔

"رہنے دیجئے اس سب کو اپنے پاس.........."

"مجھے معلوم ہے بیٹی کہ تم بہت مالدار ہو اور بدر الحسن ایک کروڑ پتی آدمی تھا۔" گلنار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا بھی تو اس دنیا میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں تو تم کو یہ سب کچھ اپنی زندگی میں اس لئے دے رہی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد کوئی تنازعہ نہ رہے اور تمہیں کسی کے سامنے یہ کہنے کی اذیت نہ برداشت کرنی پڑے کہ مرنے والی تمہاری ماں تھی اور تم اس کی اصل وارث ہو۔ اسی لئے میں نے یہ سارا بندوبست کر دیا ہے اور دیکھو .... اگر تم ان سب چیزوں کو اپنے پاس نہ رکھنا چاہو تو تم اپنی مرضی سے انہیں کسی بھی فلاحی ادارے کے حوالے کر سکتی ہو۔ یہ سب کچھ اب تمہارا ہی ہے۔ جو چاہو کرو۔ فلیٹ تو میں اس وقت تک اپنے ہی پاس رکھنا چاہتی ہوں' جب تک میں زندہ ہوں۔ میرے مرنے کے بعد جو جی چاہے کرنا اور جہاں تک کیش کا تعلق ہے تو تمہاری مرضی ہے' جس مقصد کے لئے چاہو استعمال کرو۔ میں نے تمہیں دے دیا ہے اور ہاں میں تم کو اپنی گاڑی کا بھی اوپن لیٹر دے رہی ہوں۔ جب جی چاہے مجھ سے کاغذات لے لینا اور اس کو اپنے نام ٹرانسفر کروا لینا۔"

مہ پارہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اس نے اب تک اپنی ماں کی جانب جو رویہ روا رکھا تھا وہ لاتعلقی' ناپسندیدگی اور کسی حد تک اہانت کا رویہ تھا۔ وہ اس سے دور

رہنا چاہتی تھی اور کسی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ "اس" کی بیٹی ہے لیکن اب وہ ایک عجیب اس اضطرابی کیفیت کا شکار تھی جس میں کچھ عنصر شرمندگی کا بھی شامل تھا۔

"امی! میں جانتی ہوں کہ میں آپ کے زیادہ قریب نہیں آ سکی اور اس کی وجہ.........."

"کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے بیٹی!" گلنار نے اس کو بولنے کے عذاب سے نجات دلا دی۔ "میں سب سمجھتی ہوں' میں نے بھی تم کو کیا دیا ہے؟ سوائے دکھوں کے کیا دیا ہے تم کو؟ میں جانتی ہوں کہ میں تم کو کوئی خوشی نہیں دے سکی .... مگر.......... اب جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ تمہارا ہے۔ کل میں چند روز کے لئے ملتان جا رہی ہوں۔ وہاں سے واپس آ کر تم کو فون کروں گی۔ مجھ کو چیک کے کیش ہونے کی اور گفٹ ڈیڈ کے اٹیسٹ ہونے کی اطلاع دینا اور ہاں میں تم کو فلیٹ کی ایک ڈپلیکیٹ چابی بھی دے دیتی ہوں۔ تم کسی بھی وقت یہاں آ سکتی ہو.......... کسی سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم میری بیٹی ہو' یہ فلیٹ تمہارا ہے' تم مالک ہو۔"

مہ پارہ جب اس کے پاس سے رخصت ہو گئی تو گلنار کو ایک دم ایسا لگا کہ سناٹا کچھ اور زیادہ گہرا ہو گیا ہے اور تنہائی کا بوجھ کچھ اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور انہیں دیکھنے لگی۔ وہ اسے بالکل خالی خالی لگے تنہائی' سناٹا' دل کے دہکتے ہوئے داغ اور خالی ہاتھ۔

اور اب کل اس نے ملتان جانا تھا ایک مرنے والی کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے۔

برسہا برس پہلے جب نورن کو اس کے شوہر نے گھر سے نکالا تھا اور نورن بالکل بے یار و مددگار تھی تو اس وقت اس کے شوہر کے ایک ملازم نے اپنی بیوی کے چاندی کے زیور فروخت کر کے نورن کو کچھ رقم فراہم کی تھی اور اسے حیدر آباد میں اپنے ایک عزیز کا پتہ دے کر ٹرین میں سوار کرا دیا تھا۔ نورن حیدر آباد تو پہنچ گئی لیکن اس ملازم کا رشتہ دار اس کو وہاں نہیں مل سکا۔ وہ لوگ کراچی چلے گئے تھے۔ نورن کافی عرصے تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بالآخر کراچی آ گئی تھی اور وہ یہاں کی سڑکوں پر بھیک مانگتی تھی۔

نورن اکثر اس نیک دل ملازم کا ذکر کرتی تھی جس کا نام شفیع اللہ تھا اور اس کی نیک دلی کو یاد کرتی تھی۔ وہ اس کے اس احسان کو کبھی نہیں بھولی تھی۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے اس کو جیسے اچانک اس قرض کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا اور اس نے گلنار سے

یہ وعدہ لے لیا کہ اگر وہ زندہ نہ رہے تو اس کی موت کے بعد گلنار ایک بار ملتان ضرور جائے اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر شفیع اللہ کو یا اس کی کسی اولاد کو تلاش کر کے اس کا قرض مع سود کے ادا کر دے۔

"غریب آدمی کے لئے تو چاندی کا زیور بھی ہیرے موتی سے کم نہیں ہوتا گلنار بی بی!" وہ کہا کرتی۔ "اور شفیع اللہ نے اس وقت میری خاطر اپنے ہیرے موتی لٹا دیئے تھے۔"

"میں تمہارا قرض ضرور ادا کروں گی۔" گلنار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "تم اپنے دل پر کوئی بوجھ مت رکھو۔"

نورن تو مر کر چلی گئی تھی لیکن گلنار کو اس سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد تھا۔ چنانچہ اس نے پہلے تو مہ پارہ کے ساتھ اپنے معاملات طے کئے اور پھر اس کے بعد اگلے روز وہ ٹرین سے ملتان روانہ ہو گئی۔

ملتان شہر اس کے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ یہاں کی درگاہوں اور خانقاہوں وغیرہ پر حاضری دینے اور چادریں چڑھانے کی غرض سے کئی بار آ چکی تھی۔ ٹھٹھہ' ملتان' پاک پتن' لاہور .... وہ لوگ تو جگہ جگہ جاتی رہتی تھیں لیکن نورن کو اس سے پہلے کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ وہ شفیع اللہ کا قرض ادا کر دے۔ اس کے دل میں یہ خیال پوری شدت کے ساتھ اس وقت ابھرا جب وہ موت کی دہلیز پر آن پہنچی تھی اور اپنی تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ حساب کر رہی تھی۔ اس وقت وہ خود سفر کے قابل بھی نہیں تھی چنانچہ اس نے گلنار سے اس کام کے لئے درخواست کی۔

گلنار نے ملتان پہنچ کر ایک ہوٹل میں قیام کیا اور پھر اس نے شفیع اللہ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اسے بہت زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی۔ شفیع اللہ اسے مل گیا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ گلنار نے اس کو جب نورن کے بارے میں یاد دلایا تو اس کو سب کچھ یاد آ گیا۔ گلنار نے اس کو بتایا کہ نورن اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن وہ مرتے مرتے اس کو ہدایت کر کے گئی ہے کہ شفیع اللہ کا قرض ادا کر دیا جائے۔

"یہ دس ہزار روپے کی رقم تمہارے لئے ہے۔" گلنار نے اس کو رقم دیتے ہوئے کہا۔ "اس کو قبول کرو تاکہ مرنے والی کی روح خوش ہو جائے۔"

شفیع اللہ حیران رہ گیا۔ اتنی بڑی رقم' چاندی کے چند معمولی سے زیوروں کے بدلے۔ وہ اسے لینے پر تیار نہیں تھا لیکن گلنار نے بالاصرار یہ رقم اس کو دے دی اس کے

بعد اسے ملتان میں کوئی کام نہیں تھا۔ ایک دن اس نے مختلف مزاروں اور درگاہوں وغیرہ پر حاضری دینے میں گزارا اور اگلے دن ٹرین سے ہی کراچی روانہ ہو گئی۔ دن کا وقت تھا اور ٹرین کراچی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ گلنار کی نگاہیں لانڈھی کی ملوں اور فیکٹریوں کی اونچی اونچی چمنیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ خوش تھی کہ کسی کو خوش کر کے آئی تھی اس نے نورن کا کام کر دیا تھا اور اس کا قرض اتار دیا تھا۔ شفیع اللہ آج بھی غریب ہی تھا پہلے کی طرح اور اس کے لئے دس ہزار روپے کی یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔

گلنار گاڑی کے ڈبے کے کھلے ہوئے دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ ڈبے کے دوسرے مسافروں میں سے اس وقت کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ گلنار کا ہینڈ بیگ جس میں اس کا مختصر سا سامان رکھا تھا' سیٹ پر پڑا تھا' گلنار دروازے میں کھڑی ہوئی کراچی کی قربت کی گرمی کو محسوس کر رہی تھی۔

اچانک گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے میں سے بدرالحسن اندر آ گیا۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی گاڑی میں نہ جانے کس طرح گھس آیا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں اور بھی زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سر کے سارے بال سفید تھے اور اس کے چہرے پر ایک سفید داڑھی تھی۔

گلنار نے یہ منظر ایک لمحے' محض ایک لمحے کے لئے دیکھا اور اس سے اگلے لمحے وہ دروازے کے باہر تھی۔

ایک لمحے کے لئے اس کو بڑے زور کا چکر آیا تھا اس کا دماغ جیسے ماؤف ہو گیا تھا اور اس نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اس کو بدرالحسن کا پُراسرار ہیولا نظر آ گیا تھا۔

گاڑی اس وقت قائد آباد کے علاقے میں ریلوے پُل کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم کے حصے میں گلنار کا جسم گاڑی سے نکل کر نیچے خشک ندی میں جا پڑا۔ ڈبے میں موجود لوگوں میں سے کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور یہ ڈبہ چونکہ گاڑی کا تقریباً آخری ڈبہ تھا اس لئے دوسرے مسافروں نے بھی اس منظر کو نہیں دیکھا' گلنار کا ہینڈ بیگ سیٹ پر ہی پڑا رہا۔

ایک لمحے کے اندر اندر سارے دہکتے ہوئے داغ بجھ گئے۔ سارے رِستے ہوئے ناسور خشک ہو گئے اور گلنار ایک مکمل خود فراموشی کی دنیا میں چلی گئی۔ جہاں کچھ نہیں تھا' کچھ بھی نہیں۔ نہ دکھ' نہ خوشی' نہ درد' نہ ہنسی' نہ اندھیرا' نہ اجالا' نہ دن نہ رات۔ سب کچھ آن واحد میں ختم ہو گیا اور سانس کا بندھن ٹوٹتے ہی جیتا جاگتا بدن مردہ گوشت

کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔

☆======☆======☆

مہ پارہ نے اپنی ماں کا دیا ہوا چیک اگلے ہی دن اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا تھا اور وہاں سے وہ سیدھی سٹی کورٹ گئی تھی جہاں اس نے اس گفٹ ڈیڈ کو ایک مجسٹریٹ سے اٹیسٹ کروا لیا۔ اب وہ بڑی آسانی سے اس فلیٹ کو اپنے نام منتقل کروا سکتی تھی۔ جب بھی چاہے فلیٹ کی چابی' کار کا اوپن لیٹر .... سب چیزوں کو اس نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا اور نہ معلوم ہو سکتا تھا اور مہ پارہ کی دولت میں جو کہ پہلے ہی بہت زیادہ تھی کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اس اضافے سے خود کو محروم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

چار دن کے بعد شام کو اس کے ملازم نے اطلاع دی کہ ایک پولیس انسپکٹر اس سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ مہ پارہ چونک گئی اور ذرا پریشان ہو گئی' تاہم اس نے اس کو اندر بلوا لیا۔

"یہ آپ ہی کا نام پتہ اور فون نمبر ہے نا؟" پولیس انسپکٹر نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور مہ پارہ نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھا۔

"جی ہاں۔" اس نے کہا۔ "مگر........ یہ........"

"آج قائد آباد کے علاقے میں ریلوے پُل کے نیچے ملیر ندی سے ایک عورت کی لاش ملی ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "خیال ہے کہ وہ کسی ٹرین سے گر کر ہلاک ہوئی ہے۔ اس کے لباس میں سے ہمیں یہ کاغذ ملا۔ اس کے علاوہ اور کوئی شناختی علامت نہیں تھی۔ آپ سے درخواست ہے کہ لاش کی شناخت میں قانون کی مدد کریں۔"

کچھ دیر کے بعد مہ پارہ مردہ خانے میں اپنی ماں کی لاش کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی کوشش سے سنبھالا ہوا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔

"جی' جی ہاں .... میں اس عورت کو جانتی ہوں۔" وہ رک رک کر کہہ رہی تھی۔ اس کا دماغ تیزی سے ٹھیک ٹھیک جملے بنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ "گلنار نام تھا اس کا اور یہ دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ یہ میری کرائے دارنی تھی' میں نے اسے اپنا فل فرنشڈ فلیٹ کرائے پر دے رکھا تھا۔ اس کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ یہ بالکل تنہا تھی۔"

"اوہ........" انسپکٹر نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تو پھر اس کی

لاش............"

"دفنا دیجئے۔" مہ پارہ نے جلدی سے کہا۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے اس کا کوئی نہیں ہے' کوئی اس کی لاش لینے نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "تدفین کے لئے ایدھی والوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں اور آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ کوئی اور بات پوچھنی ہو گی تو آپ کو تکلیف دیں گے۔" وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ فضول اور بے مقصد تفتیش سے جان چھوٹی۔ کون لاوارث لاشوں کے پیچھے بھاگتا پھرے۔

"اچھا ہوا وہ ختم ہو گئیں۔" مہ پارہ نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "جب تک زندہ رہتیں میرے سر پر تلوار بن کر لٹکتی رہتیں .... اگر کسی کو معلوم ہو جاتا کہ میں "ان" کی بیٹی ہوں' میں ایک شریف اور عزت دار آدمی کی بیوہ .... مسز بدر الحسن........... اور ایک طوائف کی اولاد .... توبہ..........!!!"

☆======☆======☆

وہی ایک گالی

بیٹے نے ماں کو ہلاک کر دیا

ٹنڈو جام (نامہ نگار) نشے کے لئے پیسے نہ ملنے پر بیٹے نے ماں کو قتل کر دیا۔ تفصیلات کے مطابق ٹنڈو جام سے 10 کلو میٹر قریبی گوٹھ میں ایک شخص نذیر احمد ولد محمد میر بحر نے نشہ کے لئے اپنی ماں سے کچھ رقم طلب کی' رقم نہ دینے پر اس نے غصہ میں آکر گھر میں موجود ریوالور سے اپنی ماں مسمات رضیہ بیگم کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور خود فرار ہو گیا جس کی رپورٹ ٹنڈو جام تھانے میں درج کرائی گئی۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی - 15 اپریل 1990ء)

مَیں جو کہانی آپ کو سنا رہا ہوں' وہ مسمات رضیہ بیگم کی نہیں' بلکہ مسمات حمیداں کی کہانی ہے جس کا اصل نام حمیداں بیگم تھا لیکن سب لوگ اسے حمیداں کہتے تھے۔ حمیداں کی تو پوری کہانی مجھے معلوم ہے اور وہ مَیں آپ کو سنا سکتا ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ مسمات رضیہ بیگم اور مسمات حمیداں کے مقدرات میں کیا کچھ مشترک تھا لیکن مَیں ایک بات یقین کے ساتھ جانتا ہوں۔ ان دونوں کی موت ایک ہی انداز میں ہوئی تھی' دونوں کو ان کے اپنے سگے بیٹوں نے قتل کیا تھا۔

☆======☆======☆

مکان کے دروازے پر گھوڑی کے قدموں کی ٹاپوں کی مخصوص آواز کو احمد دین عرف احمدے نے فوراً پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے تیز ہو گئیں۔

اس کے دروازے پر کوئی گھڑسوار آیا تھا۔ کون ہو سکتا تھا؟ اس کے پاس گھوڑی پر سوار ہو کر آنے والا کون ہو سکتا تھا سوائے ملک صاحب کے کسی آدمی کے .... مگر ملک صاحب کا کارندہ تو ابھی پچھلے ماہ ہو کر گیا تھا.......... اتنی جلدی وہ کس لئے اس کے پاس آ سکتا تھا؟

"احمدے .... اوئے احمدے۔" گھر کے باہر سے گھوڑی کی ٹاپوں کی ہلکی ہلکی آوازوں کے ساتھ ایک بھاری' تحکمانہ' کھردری' جارحانہ اور کھرکھری آواز بلند ہوئی اور احمدے نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔

یہ اس گاؤں کے زمیندار ملک عطاء اللہ کے گماشتے سید نور حسین کی آواز تھی اور یہ وہ آواز تھی جو احمدے جیسے لوگوں کے لئے نحوست اور کم نصیبی کی علامت تھی۔ یہ آواز جب جاگتی تھی تو احمدے جیسے لوگوں کے نصیب سو جاتے تھے۔ یہ آواز جب اونچی اٹھتی تھی تو ان لوگوں کے سر نیچے جھک جاتے تھے۔ اس آواز کا اتار چڑھاؤ' ان کی زندگیوں کے نشیب و فراز کا تعین کرتا تھا۔

"اوئے احمدے .... ارے کہاں مر گیا؟" سید نور حسین کی آواز میں غصے کی گھن گرج شامل ہو گئی۔

"آیا جی۔" احمدا اپنی دہشت و وحشت کے طلسم سے باہر آتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "آیا شاہ جی آیا.........." وہ اندر سے ہی یہ اعلان کر دینا چاہتا تھا کہ اس نے ملک عطاء اللہ کے خاص کارندے سید نور حسین کو پہچان لیا ہے۔

وہ جلدی سے اپنی پھٹی پرانی چادر کو سنبھالتا ہوا' گھر کے باہر نکلا اور اس نے دروازے پر سید نور حسین کو گھوڑی پر سوار کھڑے ہوئے پایا۔

"السلام علیکم شاہ جی!" اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑ کر نور حسین کو سلام کیا۔ نور حسین کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ "اتنی دیر لگا دی گھر سے نکلنے میں؟" نور حسین نے اس کے سلام کا جواب دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی اور محض سر کے ایک ہلکے سے اشارے کو کافی سمجھا۔ "میں کب سے یہاں کھڑا ہوا چلا رہا ہوں اور تُو سنتا ہی نہیں ہے؟"

"بس آ گیا شاہ جی!" احمدے نے تقریباً گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "ذرا گائے کو چارہ ڈال رہا تھا.........."

"ہوں۔" نور حسین نے اسے کڑی اور ٹیڑھی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "خوب گائے کا دودھ پی رہا ہے' تُو بھی اور تیری بیوی بھی۔ دونوں خوب عیش کر رہے ہو آج کل' کیوں؟ اور دوسروں کا جو مال لے رکھا ہے وہ واپس نہیں کیا جاتا؟"

"نہیں نہیں شاہ جی!" احمدے نے جلدی سے مکمل معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے گائے پال کر جرم کیا ہے اور اسے اس کی سزا ملنی چاہئے۔ "ہم تو زیادہ تر دودھ بیچ دیتے ہیں۔ اگر نہ بیچیں تو کام کیسے چلے؟ آپ تو جانتے ہیں شاہ جی! بس تھوڑا بہت بچوں کی ضرورت کے لئے رکھ لیتے ہیں اور باقی تو.........."

"اچھا اچھا' اب بک بک نہ کر اور جلدی سے لال مکان میں آ جا۔" نور حسین نے اسے ہدایت دی۔ "ملک صاحب نے تجھے بلایا ہے۔"

"اچھا جی۔" اس نے حیرت کے ساتھ کہا۔ "ابھی پچھلے ہی مہینے تو ملک صاحب یہاں سے آ کر گئے تھے۔"

"تو کیا دوبارہ یہاں آنے کے لئے ویزا لینا پڑتا ہے؟" نور حسین نے سختی کے ساتھ احمدے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ان کا گاؤں ہے' ان کی جاگیر ہے' جب جی چاہے آئیں اور

جتنی بار جی چاہے آئیں۔ کیا تُو انہیں روک لے گا؟"

"ارے نہیں شاہ جی!" احمدے نے حد درجہ عاجزی اور مسکینی کے ساتھ کہا۔ "مالک ہیں وہ تو.......... سرکار ہیں ہماری.......... سر آنکھوں پر آئیں۔ جم جم آئیں' بھلا میں روکنے والا کون ہوتا ہوں۔"

"اچھا جلدی سے آنا۔" نور حسین نے گھوڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ملک صاحب نے بلایا ہے۔ میں چلتا ہوں۔"

"شاہ جی.......... کچھ لسی پانی.........." احمدے نے کہا لیکن نور حسین نے اس کی بات کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی اور گھوڑی کو آگے بڑھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

احمدے نے دروازہ بند کیا اور گھر کے اندر آیا۔ دروازے کے قریب ہی اس کی بیوی حمیداں کھڑی ہوئی تھی اور اس نے اس کے اور نور حسین کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو کو غور سے سنا تھا۔

"کیوں آیا تھا یہ منحوس نورا؟" حمیداں نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔ منہ پر تو "شاہ جی!" اور پیٹھ پیچھے "نورا" وہ لوگ نور حسین کا ذکر اسی طرح کرتے تھے۔ "یہ ملک اتنی جلدی کیوں آ گیا ہے؟"

"تم نے سنا نہیں؟" احمدے نے ایک زہرخند کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا۔ "نورا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا ملک کو اس گاؤں میں آنے کے لئے ویزے کی ضرورت ہے؟"

"تو اب اس نے تم کو بلایا کس لئے ہے؟" حمیداں نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "اس کی پچھلے مہینے تو تم سے ساری بات چیت ہو چکی ہے۔ اب کیا کام آن پڑا ہے؟"

"یہ تو جا کر دیکھنے سے ہی معلوم ہو گا نیک بخت۔" احمدے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "جاتا ہوں۔"

اس نے اپنی پھٹی پرانی چادر کو اپنے سر سے پگڑی کی طرح لپیٹا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

احمد دین احمدے نے اپنے باپ سے ایک چھوٹا سا مکان' تھوڑی سی زمین اور بہت سی غربت ورثے میں پائی تھی اور ان تینوں اثاثوں میں سے جس اثاثے میں سب سے زیادہ اضافہ ہوتا رہا تھا وہ آخری اثاثہ تھا۔ پہلے دو اثاثوں کی مالیت اور افادیت تو وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ آخری اثاثہ بڑھتا اور پھیلتا گیا۔

احمدے کو ملنے والا یہ زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا اس زمین کا ایک حصہ تھا جو کبھی بہت بڑی ہوا کرتی تھی لیکن پھر تقسیم ہوتے ہوتے' چھوٹی ہوتی چلی گئی تھی اور جب احمدے کی باری آئی تو اس کے مقدر میں ایک بہت چھوٹا سا ٹکڑا آیا جو ایک مختصر سے کنبے کی گزر اوقات کے لئے ہی ناکافی تھا جبکہ احمدے کا کنبہ کوئی ایسا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ جب احمدے کا باپ مرا ہے تو اس وقت احمدے کا کنبہ ایک ماں' دو بہنوں' ایک بیوی اور ایک بچے پر مشتمل تھا۔ گویا احمدے سمیت چھ افراد کھانے والے تھے اور زمین کا یہ حقیر سا ٹکڑا ان سب لوگوں کے پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ جب احمدے کا باپ زندہ تھا تب بھی یہی صورت تھی اور اسی لئے گھر کا خرچہ چلانے کی غرض سے احمدے کا باپ اور خود احمدا' جاگیردار ملک عطاء اللہ کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ گو کہ ان کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا موجود تھا' تاہم ان کی حیثیت کھیت مزدور کی سی تھی۔

باپ مر گیا تو کنبے میں سے ایک آدمی کم ہو گیا لیکن دراصل کنبے کا آدھا ذریعہ آمدنی ختم ہو گیا تھا۔ پہلے تو دونوں باپ بیٹے مل کر کماتے تھے۔ اب احمدا اکیلا رہ گیا تھا۔ اس لحاظ سے کنبے کی آمدنی بھی آدھی رہ گئی تھی۔

ماں اور دونوں بہنیں گھر کے دیگر بہت سارے کام کاج میں لگی رہتی تھیں اور وہ لاکھوں محنت کش عورتوں کی طرح دیہی معاشی سرگرمی میں پورے طور پر شریک تھیں لیکن عورت کا کام تو کسی گنتی شمار ہی میں نہیں تھا۔ جب بھی کمانے والے کے حوالے سے بات ہوتی تو صرف مرد کا ہی نام لیا جاتا تھا اور اسی حوالے سے احمدا اپنے کنبے کا اب واحد کمانے والا تھا۔

مرنے والے نے دو لڑکیوں کا بوجھ بھی احمدے کے سر پر ہی رکھ چھوڑا تھا۔ خود تو چین سے مر کر چلا گیا تھا اور احمدے کو اس بھاری سماجی عذاب میں مبتلا کر گیا تھا۔

دونوں لڑکیوں کے رشتے تو بچپن سے ہی طے تھے لیکن پاس پلے بھی تو کچھ ہونا چاہئے تھا۔ اس کے بغیر شادیاں کہاں سے ہو جاتیں اور یہاں تو یہ حال تھا کہ اگر پیٹ کو تھا تو تن کو نہیں تھا اور اگر تن کو تھا تو پیٹ کو نہیں تھا۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ لڑکیوں کو بٹھا کر بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

ملک عطاء اللہ بہت بڑا جاگیردار تھا اور راولپنڈی کے نواح میں واقع اس کی جاگیر کا علاقہ میلوں میل تک پھیلا ہوا تھا جس میں بہت سے گاؤں شامل تھے۔ احمدے کا گاؤں

بھی انہی میں سے ایک تھا اور اس کا نام سکندر پور تھا۔

ملک عطاء اللہ اس گاؤں میں نہیں رہتا تھا۔ اس کی حویلی ایک دوسرے گاؤں میں تھی۔ ویسے وہ اپنی جاگیر کے تمام علاقے میں برابر آتا رہتا تھا اور اس کے گماشتے اور کارندے بھی برابر آتے رہتے تھے۔

سکندر پور اپنے نام کے بالکل برعکس تھا۔ یہاں کوئی مقدر کا سکندر موجود نہیں تھا۔ شانِ سکندری اگر تھی تو صرف ملک عطاء اللہ کے لئے جو سکندر پور میں نہیں رہتا تھا۔ سکندر پور کے رہنے والے تو سب کے سب بہت ہی زیادہ غریب اور پسماندہ لوگ تھے۔ ان میں سے بہت کم خوش نصیب ایسے تھے جن کے پاس اپنا کوئی قطعہ اراضی موجود تھا۔ اکثریت کھیت مزدوروں اور مزارعوں کی تھی۔ سب کے سب غریب و مفلوک الحال اور ایک دوسرے کی مالی مدد کرنے سے یکسر قاصر۔

چنانچہ بہنوں کی شادی کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے احمدے کو ملک عطاء اللہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑا۔ ملک عطاء اللہ بڑی خوشی کے ساتھ احمدے کو قرض دینے پر تیار ہو گیا اور اس نے اس نوجوان کو یقین دلایا کہ وہ اپنے غریب کمیوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور پھر یہ تو لڑکیوں کی شادی کا معاملہ تھا۔ بھلا وہ کیوں کر انکار کر سکتا تھا۔

"میں تھوڑا تھوڑا کر کے آپ کا قرض ادا کروں گا حضور!" احمدے نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور ملک عطاء اللہ نے بڑے مشفقانہ انداز میں گردن ہلائی۔ "دستاویز میں نے تیار کروالی ہے۔ تُو انگوٹھا لگا دے، تجھے قرض مل جائے گا.......... خوشی خوشی بہنوں کی شادی کر۔"

احمدے کی سات پشتوں میں کوئی خواندہ نہیں تھا۔ تحریر کے الفاظ اس کی نظر میں اجنبی اور نامانوس کیڑے مکوڑے تھے جو اپنے اندر نہ معلوم کون کون سے مفہوم پوشیدہ رکھتے تھے۔ تحریر کا طلسم کدہ اس کے لئے ایک ایسی دنیا تھی جس میں اس کا کوئی گزر نہیں تھا۔ اس کے آباؤ اجداد بھی صرف انگوٹھا ہی لگاتے چلے آئے تھے اور اس نے بھی آنکھ بند کر کے ایک ایسی دستاویز پر انگوٹھا لگا دیا جس کی تحریر کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ملک عطاء اللہ کے منشی نے مطلوبہ رقم اس کے حوالے کر دی۔

"اس میں.......... اس میں کیا لکھا ہے سرکار؟" احمدے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"فضل دین تمہیں بتا دے گا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔" ملک عطاء اللہ نے اٹھتے ہوئے اور اپنے منشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ کمرے میں منشی فضل دین اور احمدے کے علاوہ اب کوئی اور نہیں تھا۔ منشی انگوٹھا لگی ہوئی دستاویز کو بہت سنبھال کر ایک بستے میں دوسرے کاغذوں کے ساتھ باندھ رہا تھا۔

"کیا لکھا ہے منشی اس دستاویز میں؟" احمدے نے فضل دین سے پوچھا۔ فضل دین خود سے تو کچھ بول ہی نہیں رہا تھا۔ عجیب نحس قسم کا آدمی تھا۔

"اور کیا لکھا ہو گا یارا؟" منشی فضل دین نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "وہی لکھا ہوا ہے جو قرض کی اس قسم کی دستاویزات میں لکھا ہوتا ہے۔ تم نے اپنی زمین ملک صاحب کے پاس گروی رکھ کر ان سے قرضے کی رقم حاصل کی ہے اور کیا؟"

"مگر.......... مگر میں نے تو زمین رہن رکھنے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔" احمدے نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "ملک نے بھی ایسا کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ قرضے کے لئے میری زمین رہن رکھیں گے۔"

"اوئے.......... اوئے تو تیرا کیا مطلب ہے بھائی؟" فضل دین نے اسے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "ملک صاحب نے کوئی خیرات خانہ کھولا ہوا ہے؟ خیرات بانٹ رہے ہیں وہ؟ کہاں سے تجھے قرض دے دیتے اور کیوں دے دیتے؟"

"مگر بھائی فضل دین.......... مجھ سے تو ملک صاحب نے کوئی ایسی بات کی ہی نہیں.........." احمدے نے کمزور اور اعتماد سے خالی آواز میں کہا۔ "میں تو.........."

"اوئے تُو یہ بتا کہ کیا کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو کسی ضمانت کے بغیر قرضہ دے سکتا ہے؟" فضل دین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آخر کوئی اپنا روپیہ دیتا ہے تو اس کی واپسی کی ضمانت بھی تو چاہتا ہے۔ ایسا پاگل کون ہے جو بغیر کسی ضمانت کے قرضہ دے دے گا؟"

"تو.......... تو.......... اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اگر میں وقت پر قرضہ نہ ادا کر سکا تو اس کے بدلے میں میری زمین ضبط ہو جائے گی۔"

"ہاں یارا ہاں.........." منشی فضل دین نے جھلا کر جواب دیا۔ "اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا آیا ہے۔ ملک صاحب نے کوئی دنیا سے نئی بات تو نہیں کی ہے۔"

"مگر بھائی منشی فضل دین، میری زمین کی قیمت تو قرضے کی اس رقم سے کہیں زیادہ

ہے جو میں نے ملک صاحب سے لیا ہے۔" حیران و پریشان احمدے نے کہا۔

"اچھا بھئی تو ایسا کر یہ دستاویز پکڑ۔" فضل دین نے بستے میں سے دستاویز نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے پھاڑ کر پھینک دے اور رقم واپس کر دے اور پھر رقم کا کہیں اور سے بندوبست کر لے جہاں سے تجھے رقم مل جائے' لے لے اور میرا دماغ مت کھا۔ میں ملک صاحب سے کہہ دوں گا کہ تجھے قرضہ نہیں چاہئے۔ اللہ اللہ خیر سلا .... لا رقم نکال۔"

"کاش میں ایسا کر سکتا۔" احمدے نے دل ہی دل میں کہا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بہنوں کی شادی کے لئے رقم کہیں اور سے نہیں مل سکتی تھی۔ کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔

"نہیں نہیں منشی فضل دین۔" اس نے جلدی سے دستاویز کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو .... بس اپنی معلومات کے لئے پوچھ رہا تھا۔"

"تو اب تسلی ہو گئی یا اور کچھ پوچھنا باقی ہے؟" فضل دین نے درشتی کے ساتھ کہا۔

"نہیں .... بس ٹھیک ہے۔" احمدے نے وہاں سے اٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور پھر وہ باہر نکل گیا۔ اس کی جیب میں کچھ رقم آ گئی تھی لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جوئے میں جیتی ہوئی تھوڑی سی رقم ہو جس کے عوض وہ اپنا سب کچھ ہار چکا ہو۔

احمدا' ملک عطاء اللہ کی زمینوں پر تو پہلے ہی کام کرتا تھا اور یہ کام کا سلسلہ اب بھی جاری رہا۔ مگر ایک فرق کے ساتھ' اس کے کام کی نوعیت اب تقریباً بے گار کی سی تھی۔ اسے اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں مل رہا تھا کیونکہ وہ ملک صاحب کا مقروض تھا۔ معاوضے کی رقم قرضے کے حساب میں کٹ جاتی تھی اور احمدے کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔

بہنوں کی شادیاں تو ہو گئیں۔ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں اور احمدے نے اطمینان کا سانس لیا۔ کم از کم یہ ایک بڑا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ اب سر پر کوئی ایسا بوجھ موجود نہیں تھا جو راتوں کی نیندیں حرام کر دے۔

حساب کتاب رکھنا ملک عطاء اللہ اور اس کے منشی کا کام تھا۔ احمدے جیسے آدمی کے پاس' جسے پوری طرح گنتی بھی نہیں آتی تھی' حساب کتاب رکھنے کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔ وہ تو صرف ملک عطاء اللہ یا اس کے منشی کی بات پر ہی بھروسہ کر سکتا تھا۔ اور ان لوگوں کی باتیں ناقابل فہم تھیں۔ احمدا تو بس گدھے کی طرح بغیر کوئی

معاوضہ لئے ہوئے ملک عطاء اللہ کے لئے کام کرتا چلا جا رہا تھا اور قرضہ تھا کہ جوں کا توں برقرار تھا۔

وہ اپنے چھوٹے سے قطعہ اراضی پر بھی کام کرتا تھا اور اس سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس سے وہ بڑی مشکل سے اپنا اور اپنے گھر والوں کا گزارا کرتا گیا۔ گھر میں ماں تھی' بیوی تھی' حمیداں اور دو بچے تھے۔ بہن کی شادی کے وقت تو ایک بچہ تھا لیکن اب حمیداں دو بچوں کی ماں تھی۔ دونوں چھوٹے تھے اور انہیں ماں کی طرف سے نگہداشت اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حمیداں کا اچھا خاصا وقت بچوں میں ہی خرچ ہو جاتا تھا۔ اس کی ساس تو ایک ہی اکھل کھری عورت تھی۔ وہ بچوں کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔ اس کا وجود تو جیسے دنیا سے نفرت اور بیزاری کی ایک مکمل علامت تھا۔ جب تک نندیں موجود تھیں' تب تک خاصہ کام وہ کر لیتی تھیں اور اب ان دونوں کی شادی کے بعد تو سب کچھ حمیداں اور اس کی ساس کو ہی کرنا پڑ رہا تھا اور اس میں بھی حمیداں کا ہی حصہ زیادہ تھا۔ وہ تو کام کرتے کرتے دہری ہوئی جاتی تھی۔ مگر کام تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ ایک صبح سے جو بیل کی طرح کام کرنا شروع کرتی تو شام ہو جاتی' سورج ڈھلنے لگتا اور پھر بھی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تو بہت سے کام باقی ہیں۔

احمدا سارا دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ پہلے تو اسے کچھ تھوڑی بہت فرصت مل ہی جاتی تھی لیکن ملک عطاء اللہ سے قرض لینے کے بعد تو اب جیسے اس کی زندگی سے فرصت کے تصور کا ہی خاتمہ ہو چکا تھا۔ اسے ہمہ وقت ملک کی زمینوں کے کسی نہ کسی کام میں مشغول رہنا پڑتا تھا۔ آخر قرضے کی ادائیگی جو کرنی تھی۔

عطاء اللہ کی جاگیر میں جتنے بھی گاؤں شامل تھے' ان میں سے تقریباً ہر گاؤں میں اس کا ایک مکان ضرور موجود تھا جس میں اس کے مقامی گماشتے رہتے تھے اور جب ملک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ خود وہاں آتا تھا تو اسی مکان میں ٹھہرتا تھا اور پھر اسی مکان میں گاؤں والوں کی طلبی ہوتی تھی۔ وہیں مقدر کے فیصلے ہوتے تھے' وہیں قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں' وہیں تقدیر سازی کا کام ہوتا تھا۔

ایسا ہی ایک مکان گاؤں سکندر پور میں بھی موجود تھا جو "لال مکان" کہلاتا تھا اور ملک عطاء اللہ جب بھی گاؤں سکندر پور آتا تھا اسی مکان میں ٹھہرتا تھا اور یہیں لوگوں سے ملاقاتیں کرتا تھا۔

اس کا گماشتہ سید نور حسین اس مکان کے ایک حصے میں رہتا تھا اور سکندر پور میں

اس کی حیثیت گویا "نائب السلطنت" کی سی تھی۔ ملک عطاء اللہ کی جانب سے وہ سکندر پور کے معاملات میں سیاہ و سفید کا مالک تھا اور اپنی مرضی سے کوئی بھی فیصلہ کر سکتا تھا۔ البتہ بڑے بڑے اور اہم معاملات میں ملک عطاء اللہ کی رضامندی ضروری تھی۔

پچھلے ماہ جب ملک عطاء اللہ سکندر پور آیا تھا تو اس نے اپنے شاہی دربار میں احمدے کو بھی طلب کیا تھا اور اسے یہ مژدہ جاں فزا سنایا تھا کہ اگر اس نے جلد ہی قرضے کی ساری رقم کی ادائیگی کا بندوبست نہیں کیا تو اس کی زمین ضبط کر لی جائے گی۔

"مگر سرکار! میں تو برابر قرض ادا کر رہا ہوں۔" احمدے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "میں تو آپ کے لئے بلامعاوضہ کام کر رہا ہوں .... کچھ نہیں لے رہا ہوں آپ سے۔ اس طرح قرضے کی رقم تو ادا ہو رہی ہے.........."

"بیشک ہو رہی ہے لیکن بے وقوف آدمی، کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ رقم میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ آخر سود کہاں جائے گا؟ اصل کے ساتھ سود کی ادائیگی بھی تو لازم ہے۔ کبھی حساب لگا کے دیکھ، ابھی اصل تو کچھ ادا ہی نہیں ہوا ہے.........."

احمدے کی سمجھ میں اصل اور سود کا یہ چکر بالکل نہیں آیا۔ وہ تو سیدھی سادی یہ بات جانتا تھا کہ وہ ملک جی کے لئے بہت کام کر رہا تھا اور اس کے معاوضے کی رقم قرضے کی ادائیگی میں جمع ہو رہی تھی۔ صحیح تھا کہ اس نے نقدی کی صورت میں قرضے کی کوئی رقم واپس نہیں کی تھی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ وہ قرضے کی رقم کسی نہ کسی شکل میں ادا تو کر رہا تھا۔

بحالت مجبوری اس نے ملک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلی فصل پر کچھ نہ کچھ نقد رقم ادا کرے گا۔ اس کے بعد ملک وہاں سے واپس چلا گیا تھا۔

لیکن اس بات کو تو ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا اور اگلی فصل میں ابھی کافی دیر تھی۔ مگر ملک عطاء اللہ ابھی سے آن دھمکا۔

☆======☆======☆

لال مکان کی طرف جاتے ہوئے احمدے کے دماغ میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ نہ جانے کیا بات ہو گئی تھی اور ملک نے کیوں بلایا تھا۔ نورے نے تو کچھ بتایا بھی نہیں۔ وہ تو گھوڑی سے نیچے بھی نہیں اترا۔ بس گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے اس کو حکم دے کر چلا گیا۔ ٹھیک سے بات بھی نہیں کی۔

جب وہ لال مکان کے پاس پہنچا تو اس نے جاگیردار ملک عطاء اللہ کی شاندار اور لمبی

چوڑی کار کو مکان کے باہر والے میدان میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ کار بری طرح مٹی دھول میں اٹی ہوئی تھی اور اب اس کو صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یہ گاؤں کے لوگوں کی ہی ذمہ داری تھی کہ وہ بالٹیوں میں پانی لے کر آئیں اور ملک کی کار کو خوب اچھی طرح دھو کر صاف کریں۔

احمدے نے اس کار کو کئی بار دیکھا تھا اور اس کی چکنی، سخت اور ہموار سطح پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ خود بھی ان گدیلی سیٹوں پر بیٹھ کر دیکھے جو گاڑی کے اندر آگے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ کئی بار اس کا جی للچایا تھا لیکن یہ ایک ایسی خواہش تھی جو پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

گاؤں کا موچی، کمالو اسے لال مکان کے باہر ہی نظر آ گیا۔ وہ اندر سے نکل کر آ رہا تھا۔ احمدے کو اس طرف آتا دیکھ کر وہ رک گیا۔ اس کے چہرے سے اداسی ظاہر ہو رہی تھی۔

"کئی دن کی محنت کے بعد تیار کی تھی جوتی۔" اس نے اس سے رزدارانہ اور پُراسرار انداز میں کہا۔ "مگر ملک صاحب جی کو پسند نہیں آئی۔" کمالو کے لہجے میں جیسے صدیوں کی تھکن گھل گئی تھی۔

"کیا تم نے ملک صاحب کے لئے جوتی بنائی تھی؟" احمدے نے اس سے پوچھا۔

"نہیں، ملکانی کے لئے۔" کمالو نے جواب دیا۔ "پچھلے ماہ جب ملک صاحب آئے تھے تو ملکانی کے پیر کا ناپ بھی دے گئے تھے اور کہا تھا کہ ایک عمدہ سی جوتی بنا کر رکھوں۔ جوتی کی ایک جوڑی بھی ساتھ دے گئے تھے۔ میں نے تو اسی دن سے کام شروع کر دیا تھا۔ کیا بھروسہ ان لوگوں کا، چند روز بعد ہی حکم آ جائے کہ لاؤ جوتی۔ تو میں نے تو اپنا کام بہت پہلے شروع کر دیا تھا اور آج جب ملک صاحب آئے تو میں فوراً جوتی لے کر پہنچا۔ مگر انہوں نے اسے دیکھتے ہی ناپسند کر دیا.........."

"اوئے۔" احمدا اور کمالو دونوں سید نور حسین عرف نورے کی آواز سن کر چونک پڑے۔ وہ لال مکان کے کھلے ہوئے سامنے والے برآمدے میں کھڑا ہوا بڑی خشمگیں نگاہوں سے انہیں گھور رہا اور للکار رہا تھا۔ "اوئے احمدے! ملک صاحب تیرا انتظار کر رہے ہیں اور تُو وہاں کھڑا کھڑا باتیں بنا رہا ہے؟ تیری کچھ مت تو نہیں ماری گئی ہے؟"

"آیا جی آیا۔" احمدا نے بھاگتے ہوئے کہا۔ "بس آ گیا جی، میں تو آ ہی رہا تھا۔ بس ذرا کمالو سے حال چال پوچھنے لگا۔" اور وہ تیزی کے ساتھ چلتا ہوا لال مکان کے کھلے ہوئے

برآمدے میں داخل ہو گیا جہاں سامنے ہی نور حسین عرف نورا کھڑا ہوا تھا۔

برآمدے میں ایک دروازہ تھا جو ایک اندرونی کمرے میں کھلتا تھا اور اس کمرے میں ملک عطاء اللہ کا دربار لگتا تھا۔ یہ کمرہ کافی بڑا تھا اور اس میں بہت سے لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔

احمدا جب نورے کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تو اس وقت ملک عطاء اللہ کے پاس گاؤں کے چند اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں دری کا فرش بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر سفید چادر اور ایک چھوٹا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ دو گاؤ تکئے بھی رکھے تھے۔ تخت پر صرف ایک فرد بیٹھا تھا' ملک عطاء اللہ' اور باقی لوگ اس کے سامنے فرش پر دری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ احمدا بھی اندر داخل ہونے کے بعد سلام کر کے ایک طرف کو دبک کر بیٹھ گیا۔ وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ کوئی مجرم ہو اور اپنے جرائم کی سزا کا فیصلہ سننے کے انتظار میں ہو۔

"ارے .... بڑی دیر لگا دی تُو نے آتے آتے۔" ملک عطاء اللہ نے قدرے خفگی کے ساتھ اس سے کہا۔ "کہاں رہ گیا تھا؟"

"بس جی' شاہ جی جیسے ہی میرے پاس گئے ویسے ہی میں چل پڑا۔" اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"باہر میدان میں کھڑا ہوا کمالو موچی کے ساتھ گپیں لڑا رہا تھا۔" نور حسین نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"خیر .... اچھا اب یہ بتا تُو ارادے کیا ہیں؟" ملک عطاء اللہ نے نورے کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے احمدے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "رقم کا بندوبست کیا تُو نے؟"

"ابھی کہاں سرکار!" احمدے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "آپ جب پچھلی بار آئے تھے تو یہی طے پایا تھا کہ اگلی فصل پر میں آپ کو کچھ رقم دینے کی کوشش کروں گا اور اگلی فصل میں تو ابھی دیر ہے ملک صاحب جی!"

"ہاں احمدے!" ملک عطاء اللہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اگلی فصل میں ابھی دیر ہے۔ کافی دیر ہے اور میں اتنے دن انتظار نہیں کر سکتا۔"

"مگر سرکار!" احمدے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی رقم کا بندوبست کہاں سے کروں؟ اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور .... سرکار! میں تو رات دن

آپ کی خدمت کر رہا ہوں .... شاہ جی سے پوچھ لیجئے۔ بڑی جان توڑ محنت کر رہا ہوں آپ کی زمین پر .... اور ...."

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔" ملک صاحب نے لاپرواہی کے ساتھ اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس طرح سارا قرضہ تو ادا نہیں ہو سکتا اور نہ ادا ہو رہا ہے۔ اس کے لئے کچھ اور راستہ سوچنا ہو گا۔"

"میں تو نوکر ہوں آپ کا سرکار!" احمدے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں کر رہا ہوں اور اس کے علاوہ تو میرے پاس اور کچھ ہے نہیں۔ میں کام تو بہت کر رہا ہوں سرکار! آپ شاہ جی سے پوچھ لیجئے ...." اس نے ایک بار پھر اپنی بات دہراتے ہوئے اپنی محنت کو نقدی کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

"بچے کتنے ہیں تیرے؟" اچانک ملک عطاء اللہ نے ایک بالکل غیر متعلق سوال پوچھ لیا اور احمدے کو بڑا تعجب ہوا۔ ملک صاحب جیسے آدمی نے اس سے اس کے بچوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ تو بڑے اعزاز کی بات تھی۔ ورنہ اس جیسے چھوٹے اور معمولی آدمی سے ملک صاحب کو بھلا اتنی دلچسپی کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ اس سے اس کے بچوں کے بارے میں پوچھیں۔ ملک کی جاگیر کے علاقے میں اس جیسے تو نہ جانے کتنے لوگ بھرے پڑے تھے جن کے بے شمار بچے تھے' جو حشرات الارض کی طرح پل بڑھ رہے تھے۔ زندگی کے جدید تصورات سے نا آشنا' جہالت' پسماندگی اور بے توقیری کی فضا میں' کچلی ہوئی شخصیتوں' مسخ شدہ کرداروں اور غلامی کے بوجھ تلے دبی ہوئی روحوں کے درمیان' نسلیں کی نسلیں پرورش پا رہی تھیں' جن کے لئے زندگی صرف حیوانوں کی طرح ان تھک کام اور زمینداری' جاگیرداری اور مالکوں کی بے لگام چاکری کا نام تھا۔ یہی تو وہ لوگ تھے جو آج کے "کمی کمینوں" کی اولاد اور کل کے "کمی کمین" تھے اور یہی تو "کمی کمین" تھے جن کا "گندا" خون اشرافیہ کے جسم کی ساری توانائی' حرارت اور بالیدگی کا سرچشمہ تھا۔ اسی "گندے" خون سے تو اشرافیہ کے جسم کی رگ رگ آسودہ تھی۔

"دو بچے ہیں سرکار!" احمد نے جلدی سے جواب دیا۔ "ایک بیٹی ہے اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹی چار برس کی ہے اور بیٹا کوئی ڈیڑھ برس کا ہے۔"

"اور دو بہنوں کی تو شادی کر چکا ہے؟" ملک نے گویا اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

"جی سرکار!" احمدے نے فوری طور پر جواب دیا۔ "انہی کی شادی کے لئے تو میں نے آپ سے قرضہ لیا تھا ورنہ سرکار کچھ نہ کچھ کر کے روٹی تو میں سب کے لئے کما ہی لیتا

تھا۔

"اور تیری بیوی حمیداں کیا کرتی رہتی ہے سارا دن؟" ملک نے پوچھا اور اسے تعجب ہوا کہ ملک آج اس کے گھر والوں کے بارے میں اتنی بہت سی باتیں کیوں پوچھ رہا ہے۔

"حمیداں .... جی سرکار .... وہ گھر کے کام کاج کرتی ہے۔ جانوروں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بچوں کو سنبھالتی ہے۔ ہزار کام ہوتے ہیں سرکار .... اس بے چاری کو بھی دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی۔ سارا دن بس لگی ہی رہتی ہے۔"

"اچھا تو ایسا کر حمیداں کو حویلی بھیج دے۔" ملک عطاء اللہ نے کہا۔ "وہ وہاں رہے گی اور کام کرے گی۔ مہینے میں دو ایک بار یہاں سکندر پور تم لوگوں سے مل لیا کرے گی۔ حویلی میں چھوٹی ملکانی کو ایک ملازمہ کی سخت ضرورت ہے۔ ویسے تو اور بہت سی کام کرنے والی عورتیں ہیں لیکن چھوٹی ملکانی کو اپنے لئے ایک علیحدہ عورت کی ضرورت ہے۔ حمیداں وہاں جا کر رہے گی' حویلی میں کام کرے گی تو اس طرح تم دونوں مل کر اپنے قرضے کا بوجھ کم کر سکو گے۔ ورنہ میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری یہ چھوٹی سی زمین بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔ اگر قرضہ ادا نہیں ہو گا تو پھر ایسا ہی ہو گا۔ چلو' میں اپنی طرف سے کچھ نہ کروں لیکن میں ہی سب کچھ تو نہیں ہوں۔ میرے بیٹوں کا بھی تو ہر چیز میں عمل دخل ہے۔ آخر وارث ہیں وہ میرے۔ ان کی بات بھی تو سننی ہو گی۔"

احمدے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا اور اس کے دماغ میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ وہ تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حمیداں کو اپنے سے علیحدہ کر دے۔ بھاتا اس کی محبت تھی' اس کی چاہت تھی اور اس کے گھر کی ضرورت بھی۔ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی اور اس کا دایاں بازو بھی۔ زندگی کے سفر کی تمام صعوبتوں میں وہ اس کی مکمل شریک تھی۔ وہ اپنا دایاں بازو کاٹ کر کس طرح ملک کے حوالے کر سکتا تھا۔

"نہیں ملک صاحب جی!" اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "حمیداں چلی گئی تو پھر میرے بچوں کو کون سنبھالے گا؟ گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"ارے تیری بڈھی جو ہے۔" ملک عطاء اللہ نے احمدے کی ماں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ "وہ کیا کرتی رہتی ہے سارا دن؟ خالی ہی تو رہتی ہے۔ اب تو اسے کوئی کام نہیں۔ وہ بچوں کو سنبھال لے گی اور بچوں کو مائیں کب سنبھالتی ہیں احمدے! ماؤں کو دوسرے دھندوں سے کہاں فرصت ہوتی ہے؟ جن گھروں میں نانیاں اور دادیاں موجود

ہوتی ہیں' وہاں بچوں کو وہی سنبھالتی ہیں' مائیں نہیں سنبھالتیں۔"

"مگر .... ملک صاحب جی .... لڑکا تو ابھی بہت چھوٹا ہے .... اور میری اماں تو .... میرا مطلب ہے بچے ان سے ہلے ہوئے نہیں ہیں۔"

"اچھا ایک بات تو بتا احمدے!" ملک عطاء اللہ نے اپنے بجھے ہوئے پائپ کو سلگاتے ہوئے کہا۔ "جو عورتیں اپنے ایک ایک اور دو دو دن کے بچوں کو چھوڑ کر مر جاتی ہیں ان کے بچوں کا کیا ہوتا ہے؟ آخر انہیں تو کوئی نہ کوئی سنبھالتا ہی ہے اور تیرے بچے تو اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ تیرے گھر میں تیری ماں موجود ہے' وہ انہیں با آسانی سنبھال سکتی ہے۔"

"اس میں مشکل ہی کیا ہے؟" نورے نے اپنے آقا کی بات کی تائید کرنا ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ "کون سے دس بارہ بچے ہیں جن کو سنبھالنا مشکل ہو؟ دو ہی تو بچے ہیں اور تم تین آدمی' حمیداں چلی جائے گی تو تم دو رہ جاؤ گے۔ گھر کا کام بھی کم ہو جائے گا۔ تمہاری اماں چاہے تو سب کچھ بڑی آسانی سے سنبھال سکتی ہے۔"

"کوئی زبردستی والی بات نہیں ہے احمدے!" ملک عطاء اللہ نے پینترہ بدلتے ہوئے کہا۔ "تیری مرضی نہیں ہے تو نہ سہی لیکن یہ سمجھ لے کہ اس صورت میں تُو اپنی زمین سے محروم ہو سکتا ہے۔ میں نے تو تیرے سامنے معاملے کا ایک حل رکھا ہے۔ آگے تُو جانے اور تیرا کام۔ کل کلاں کو پھر روتا نہ پھرنا کہ میری زمین میرے ہاتھ سے نکل گئی۔"

احمدا ایک عجیب و غریب عذاب میں مبتلا تھا۔ ایک طرف تو اس کی زمین تھی جو اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ پیاری تھی۔ یہ نہ صرف اس کے آباؤ اجداد کی نشانی تھی' بلکہ اس کے رزق کا وسیلہ بھی تھی۔ اب تک وہ اور اس کے گھر والے اسی زمین سے روٹی کماتے چلے آئے تھے۔ اگر یہ زمین نہ رہی تو پھر کچھ بھی نہیں رہے گا۔ روٹی کا بھی کوئی آسرا نہیں ہو گا۔

لیکن دوسری طرف حمیداں تھی' حمیداں سے جدا ہونا بھی تو اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے گھر میں جتنی بھی روشنی تھی وہ حمیداں کے دم سے ہی تو تھی۔ ورنہ باقی تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ اپنے گھر کی روشنی کو کیسے حویلی والوں کے حوالے کر دے؟ چھوٹی ملکانی کے لئے نوکرانیوں کی بھلا کیا کمی تھی؟ اسے تو بہت سی عورتیں مل سکتی تھیں۔

"ابھی جا۔" ملک نے اس کو سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر کہا۔ "اچھی طرح' آرام سے سوچ لے اور حمیداں سے بھی مشورہ کر لے۔ حمیداں ادھر حویلی میں چھوٹی ملکانی کے پاس

رہے گی تو کھانا' کپڑا سب کچھ ادھر ہی ملے گا۔ رہنے کو جگہ بھی ملے گی اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ تم دونوں اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کر لو۔ میں کل تک ادھر ہی ہوں۔ کل دوپہر کو آ کر مجھے بتا دینا۔ اگر حمیداں جانے پر راضی ہو گئی تو حویلی جا کر وہاں سے تانگہ بھجوا دوں گا۔ تُو خود حمیداں کو ساتھ لے کر آنا اور حویلی میں چھوڑ جانا۔ اب جا۔"

احمدا جب اٹھا تو اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور بڑی مشکل سے ملک کو اور نورے کو سلام کر کے وہاں سے باہر نکلا۔ دونوں میں سے کسی نے اس کے سلام کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

وہ جب گھر واپس پہنچا تو حمیداں دروازے کے پاس ہی اس کی منتظر تھی اور اس کی ماں' اپنی چار سالہ پوتی پر بری طرح چیخ رہی تھی جس نے اس کے گھٹنوں کی مالش کے تیل کی شیشی گرا دی تھی اور سارا تیل زمین پر بہہ گیا تھا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ بڑی مشکل سے تو اس نے کسی جاننے والے کے ذریعے دوسرے گاؤں کے حکیم کے پاس سے یہ تیل منگوایا تھا اور اس کو اس نابکار لڑکی نے گرا دیا تھا۔

جب وہ لڑکی پر چیخ چلا کر اپنے دل کا غبار نکال چکی تو حمیداں پر پھٹ پڑی جس نے ایسی نکمی اور نامعقول اولاد پیدا کی تھی جس نے بڑھیا کا جینا دوبھر کر دیا تھا اور ایسی اولاد کے ہونے سے تو بہتر تھا کہ حمیداں بے اولاد ہی رہتی' کم از کم بڑھیا چین سے رہ تو سکتی تھی۔

احمدے نے گھر میں داخل ہو کر بڑھیا کی چیخ پکار سنی اور اس کا دل کانپ اٹھا' یہ عورت .... یہ اس کے بچوں کو سنبھالے گی؟

حمیداں اپنی ساس کی بک بک جھک جھک پر قطعی کوئی توجہ نہیں دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے نزدیک بڑھیا کا کوئی وجود ہی نہ ہو اور جو کچھ وہ کہہ رہی تھی' حمیداں اسے سن ہی نہ رہی ہو۔ بڑھیا کی باتوں کو نظرانداز تو احمدا خود بھی کرتا تھا لیکن اس وقت وہ جس صورت حال کا شکار تھا اس کی روشنی میں بڑھیا کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کی اس کے لئے بڑی اہمیت تھی۔

کیا اپنے اس رویئے کے ساتھ اس کی ماں اس کے بچوں کی دیکھ بھال کر سکے گی؟

حمیداں سراپا سوال بنی ہوئی' احمدے کے سامنے کھڑی تھی اور احمدے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ اس نے گھر کے اندر داخل ہو کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم تھوڑی دیر کے لئے

خاموش نہیں ہو سکتی اماں! کیوں اس قدر شور مچا رکھا ہے؟"

ماں نے غصے بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو اپنی بچی کو کچھ کہنے کے بجائے الٹا اسی کو خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا لیکن پھر اچانک اسے یہ خیال آ گیا کہ ذرا دیر پہلے نورا آیا تھا اور اس نے احمدے کو پیغام دیا تھا کہ اسے ملک صاحب نے بلایا ہے اور احمدا ملک صاحب کے پاس سے ہی واپس آ رہا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی فکروں میں الجھ کر بڑھیا یہ تو بھول ہی گئی تھی۔ اب جو اس نے احمدے کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو اسے سب کچھ یاد آ گیا اور وہ فوراً احمدے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کیوں بلایا تھا ملک صاحب نے؟" حمیداں کا یہ سوال صرف حمیداں کا اپنا سوال نہیں تھا۔ اس میں احمدے کی بوڑھی ماں کی بیزار نگاہوں کا استفسار بھی شامل تھا۔

"زمین ہمارے ہاتھ سے جا رہی ہے۔" احمدے نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے' بڑے دردناک لہجے میں کہا جس میں ساری دنیا کی حسرتیں اور محرومیاں گھل گئی تھیں اور بڑھیا اس کی اس بات پر تڑپ اٹھی۔

زمین .... پرکھوں کی نشانی' کائنات کی سب سے زیادہ مقدس' سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ واجب احترام شے۔ زمین' جو انسان کی شناخت ہوتی ہے جو اس کے ہونے کی علامت ہوتی ہے' جو انسان کے سر کو بلند اور اس کے ہاتھوں کو مصروف رکھتی ہے .... وہ زمین اس کے ہاتھ سے جا رہی تھی۔

"نہیں۔" بڑھیا وحشت کے عالم میں چلائی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ملک سے کہو کہ وہ ہم سے ہماری زمین نہ چھینے۔ زمین کے بغیر ہم کیا کریں گے؟"

"ملک نے میرے سامنے دو شرطیں رکھ دی ہیں۔" احمدا نے کہا اور اپنی ماں اور بیوی کو اس گفتگو سے آگاہ کر دیا جو اس کے اور ملک کے درمیان ہوئی تھی اور جب اس نے اپنی بات ختم کی تو دونوں عورتیں یک دم خاموش ہو گئیں۔

دونوں کے آزار مشترکہ بھی تھے اور الگ الگ بھی اور دونوں اپنے اپنے انداز میں اس نئی نازل ہونے والی افتاد کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ آخر زندگی ان کے ساتھ اس قدر بے رحم' اس قدر سفاک کیوں تھی؟ کیا دنیا بھر کے سارے دکھ اور سارے عذاب انہی کے حصے میں آ گئے تھے؟ کیا ان عذابوں کو اس طرح تقسیم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کچھ عذاب ملک عطاء اللہ اور سید نور حسین جیسے لوگوں کے حصے میں بھی آ جاتے اور اس طرح ان دونوں عورتوں اور ان کے کنبے کے حصے میں آنے والے عذابوں میں کچھ کمی ہو

جاتی؟ آخر یہ کیسی تقسیم تھی؟ اس میں تو دور دور تک کسی انصاف کا شائبہ نہیں تھا۔

"میں .... میں نہیں جاؤں گی حویلی ...." حمیداں نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ "میرے بچوں کا کیا ہو گا؟"

"یہی تو میں بھی سوچتا ہوں۔" احمدے نے کہا۔ "بچوں ہی کا تو اصل مسئلہ ہے لیکن پھر یہ بھی ہے کہ اگر ملک کو منع کر دیتے ہیں تو یہ جو چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا ہے یہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔"

بڑھیا نے یہ جاننا چاہا کہ قرضے کی کتنی رقم ادا ہو چکی ہے اور کتنی باقی ہے لیکن احمدا اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتا سکا۔ اس بے چارے کو تو خود کسی حساب کتاب کا پتہ نہیں تھا۔ حساب کتاب رکھنا اس کا اور اس جیسے لوگوں کا کام نہیں تھا۔ یہ تو ملک عطاء اللہ اور اس کے منشی وغیرہ کا کام تھا۔ احمدے کو تو حساب کرنا بھی نہیں آتا تھا۔

دکھوں سے بوجھل' آزار سے کچلی ہوئی اور عذابوں سے زخمی آوازوں میں وہ تینوں بے یار و مددگار انسان' آپس میں اس نئے المیے کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جس کا درد اب ان کی زندگیوں میں اترنے والا تھا۔

احمدے نے ان دونوں کو بتا دیا کہ ملک نے اس کے لئے ان دو راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں چھوڑا ہے اور اسے کل دوپہر تک کی مہلت دی ہے۔

فیصلہ زمین کے حق میں ہوا۔ زمین کو بچانا ضروری تھا۔ حمیداں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور وہ بار بار اپنے بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن سے اب اسے جدا ہو جانا تھا۔ اپنے شوہر احمدے کی طرف دیکھتی تھی جس سے اب اسے الگ رہنا تھا۔ زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آنے والی تھی جو اپنے ساتھ اجنبی اداسیوں میں ڈوبے ہوئے طویل اور بے آسرا شب و روز کا ایک سلسلہ لا رہی تھی۔

اسی شام کو سلیم اور اشرف نامی دو آدمی احمدے سے ملنے کے لئے اس کے گھر آ گئے۔ وہ دونوں اسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور احمدے ہی جتنے غریب تھے۔ انہیں نورے کی زبانی اس بات کا پتہ چلا تھا کہ ملک صاحب نے حمیداں کو حویلی بلوایا ہے۔ دراصل انہیں نورے نے ہی احمدے کے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ جا کر احمدے کو سمجھائیں۔

بوڑھی اور آدم بیزار ماں اس کے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے تیار ہو گئی تھی' کیونکہ اسے دنیا میں ہر شے سے زیادہ محبت زمین کے اس ٹکڑے سے تھی جو اس کے مرحوم

شوہر کی یادگار تھا اور جس کے ساتھ اس کا نام وابستہ تھا۔ کسی نے اس پر زور نہیں دیا تھا کہ وہ اس بات کو مان لے۔ اس نے خود ہی اس صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔

اگلے دن جب دوپہر کو احمدا عطاء اللہ کے پاس پہنچا تو ملک نے اس کو دیکھتے ہی کہا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

احمدے نے ملک عطاء اللہ کو بتایا کہ اس نے اور اس کے گھر والوں نے ملک کی پیشکش کو قبول کر لیا ہے اور وہ حمیداں کو چھوٹی ملکانی کی خدمت کے لئے بھیجنے کو تیار ہیں۔

"شاباش۔" ملک نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ہوئی نا عقلمندوں والی بات۔ اب کم از کم تمہاری زمین تو محفوظ رہے گی۔ تم اور تمہاری بیوی دونوں مل کر کام کریں گے تو قرضہ جلدی اترنے کا امکان پیدا ہو گا.........."

"قرضہ کب تک اتر سکے گا ملک صاحب؟" احمدے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے تو کچھ بھی خبر نہیں ہے کہ اب تک کتنا قرضہ اتر چکا ہے اور کتنا باقی ہے۔"

"منشی فضل دین سے پوچھ لینا۔" ملک عطاء اللہ نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ "سارا حساب کتاب اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں رہتا۔ اتنے بہت سے لوگوں کے معاملات ہوتے ہیں۔ کہاں تک یاد رکھ سکتا ہوں۔ مگر ایک بات کا مجھے ضرور اندازہ ہے تمہیں اور تمہاری بیوی کو ابھی کافی عرصہ تک ہمارے لئے کام کرنا ہو گا۔"

گزشتہ روز ملک نے یہ کہا تھا کہ حمیداں کو حویلی میں کام کرنے کی صورت میں رہائش کی سہولت' کھانا اور کپڑا مفت ملے گا۔ اس لئے کسی بھی قسم کی تنخواہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر ملک نے کسی تنخواہ کا ذکر کیا ہوتا تو احمدا تخمینہ لگانے کی کوشش کرتا کہ مثال کے طور پر ایک سال کے دوران حمیداں کی تنخواہ کتنی بنی اور قرضے کی رقم میں سے کتنی رقم کم ہوئی لیکن وہ حمیداں کی فرضی تنخواہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے تو خود اپنی تنخواہ کا بھی ٹھیک سے علم نہیں تھا۔ اس کی قوت محنت زر کی صورت میں کتنے کے مساوی ہوتی ہے' اسے صحیح طور پر اس کا علم نہیں تھا۔ وہ تو اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو صدیوں سے بڑے دردناک انداز میں لٹتا چلا آیا تھا اور اس میں ابھی تک اس بات کا پورا احساس و شعور بیدار نہیں ہو سکا تھا کہ اسے لوٹا جا رہا ہے۔ لوٹنے والوں نے اس کی روح کو کچل کچل کر اس کی رگوں میں تقدیر پرستی' عاجزی' انکساری' رحم طلبی' قسمت پذیری' صبر و قناعت اور راضی برضا کا زہریلا نشہ گھول دیا تھا جس نے اس کے وجود کو خود اس کے

اپنے لئے غیر فعال اور مجہول بنا کر رکھ دیا تھا۔

ملک عطاء اللہ کا جواب سن کر احمدا خاموش ہو گیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ منشی فضل دین سے بات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہ تو سیدھی بات کا بھی الٹا جواب دیتا تھا اور جیسے کھانے کو دوڑتا تھا۔ وہ بھلا کیا بتائے گا کہ کتنا قرضہ اتر گیا اور کتنا قرضہ باقی تھا۔

"کل دوپہر کو میں تانگہ بھیج دوں گا۔" ملک عطاء اللہ نے کہا۔ "تو حمیداں کو خود ساتھ لے کر آ جانا۔ اس میں تیرا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ گھر میں ایک کھانے والے فرد کی کمی ہو جائے گی اور قرضہ بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اترتا رہے گا اور حمیداں وہاں خوش بھی رہے گی۔ اچھے اچھے کھانے کھائے گی آرام سے رہے گی' خوش رہے گی۔ زندگی بن جائے گی اس کی۔"

احمدا کچھ دیر کے بعد گھر واپس آ گیا اور اس نے حمیداں کو بتا دیا کہ وہ سفر کی تیاری کرے' کل اس کو یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ اگلے دن دوپہر سے پہلے ہی حویلی سے تانگہ آ گیا۔

روانگی سے قبل حمیداں نے دونوں بچوں کو سینے سے لپٹا لپٹا کر بہت پیار کیا اور ان پر اپنے آنسوؤں کی فراواں دولت بے دریغ نثار کی۔ انہیں دینے کے لئے اس کے پاس یہی سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ تھا۔

ملک عطاء اللہ کی حویلی جس گاؤں میں واقع تھی اس کا نام سادھن تھا اور یہ سکندر پور سے کوئی سات آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ احمدے کے لئے تو پیدل اتنا فاصلہ طے کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ حمیداں بھی تھی بلکہ اصل میں تو حمیداں کو ہی آنا تھا۔ اس لئے جاگیردار عطاء اللہ نے بڑی عنایت کی تھی اور تانگہ بھیج دیا تھا۔ اس معمولی مزارع اور کھیت مزدور کے لئے اس سے زیادہ اعزاز کی بات بھلا اور کیا ہو سکتی تھی کہ جاگیردار اس کی بیوی کے لئے تانگہ بھیجے۔

دونوں میاں بیوی جاگیردار عطاء اللہ کے تانگے میں بیٹھے اور انہیں اپنی زندگی میں پہلی بار یہ شرف حاصل ہو رہا تھا۔ مگر یہ بڑا خون آلود اور زخم خوردہ شرف تھا۔ احمدے کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ حمیداں کو حویلی نہیں' قبرستان لے جا رہا ہے جہاں سے پھر کوئی واپس نہیں آتا۔ وہ کل رات کو بہت رویا تھا اور اس نے حمیداں سے لپٹ لپٹ کر اپنی اگلی پچھلی تمام خطاؤں کی معافی مانگی تھی اور اس کی اس آہ و زاری میں حمیداں خود بھی برابر کی شریک رہی تھی۔ اس نے بھی احمدے کے شانے اور اس کے سینے کو اپنے آنسوؤں سے

تر کر دیا تھا۔

کوچوان ہولے ہولے گھوڑے کی باگیں ہلاتا جاتا تھا اور سکون کے ساتھ چل رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ایک گیت چھیڑ دیا' ہجر کا گیت' جس میں محبوبہ اپنے عاشق کو یاد کرتی ہے جو پردیس گیا ہوا ہے اور وعدے کے باوجود اب تک لوٹ کر نہیں آیا۔ شاید کوچوان کو بھی اس معاملے کا پوری طرح سے علم تھا۔ شاید اس کا دل بھی ان دونوں کے لئے دکھ رہا تھا۔

حمیداں کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو بہنے لگے' جنہیں روکنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ آنسو اس کے رخساروں پر پھیلتے گئے اور پھر ڈھلک ڈھلک کر نیچے گرنے لگے۔ احمدے نے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس نے اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

سادھن میں واقع ملک عطاء اللہ کی حویلی دور دور سے نظر آتی تھی۔ یہ ایک نہایت وسیع و عریض دو منزلہ عمارت تھی جو گاؤں کے ایک سرے پر سب سے الگ تھلگ واقع تھی۔

گاؤں کے دوسرے تمام چھوٹے چھوٹے مکانات حویلی کی توہین کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور خود حویلی بڑی حقارت کے ساتھ ان پر خندہ زن تھی۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے ناقابل برداشت معلوم ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ پُرامن بقائے باہمی کے لئے مجبور تھے۔

حویلی کا بھاری بھرکم چوبی پھاٹک کھلا ہوا تھا اور وہاں کئی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو حقہ پی رہے تھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ حویلی کا یہ پھاٹک تو پورا کھلا ہوا تھا لیکن اس سے آگے والا پھاٹک صرف تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

"آ گیا بالے۔" ان میں سے ایک نے کوچوان سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ملک صاحب بھی تجھی کو پوچھ رہے تھے۔"

"کیا دسوں جی۔" کوچوان نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سڑک نے سارا کام خراب کر دیا۔ تانگے کی بھی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ برسات کے بعد سے تو سڑک بالکل ہی بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔"

تانگے کے لئے اگلا پھاٹک بھی کھول دیا گیا اور تانگہ اندر داخل ہو گیا جہاں کوچوان

نے اسے ایک طرف کھڑا کر کے ان دونوں سے کہا کہ اب وہ نیچے اتر جائیں اور وہیں کھڑے ہو کر انتظار کریں۔

وہ دونوں نیچے اترے اور دیوار کے قریب چلے گئے۔ حمیداں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ حویلی کے وسیع و عریض صحن کو دیکھ کر اسے کسی بازار یا منڈی کا شبہ ہوتا تھا۔ یہاں کے مختلف گوشوں میں مختلف قسم کی سرگرمیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جانب چارہ کاٹنے کی مشین لگی ہوئی تھی' دوسری طرف ایک بڑے سے ترازو میں اناج تول تول کر بوریوں میں بھرا جا رہا تھا۔ ایک آدمی ایک گھوڑے کی مالش کر رہا تھا .... بہت سے مرد و عورت صحن میں اِدھر اُدھر مختلف کاموں میں مصروف تھے۔

انہیں لانے والے کوچوان نے تانگے اور گھوڑے کو وہیں روکا اور خود اتر کر ایک عورت سے باتیں کرنے لگا۔

جس عورت سے کوچوان نے بات کی تھی وہ فوراً ہی اس طرف آ گئی جہاں حمیداں اور احمدا کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان دونوں کو ایک طرف لے جا کر ایک لکڑی کے تخت پر بٹھا دیا جو ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ اس عورت نے اپنا نام سکینہ بتاتے ہوئے ان سے کہا کہ اسے حمیداں کی آمد کے بارے میں پہلے سے معلوم ہے اور یہ کہ وہ خود بھی اس حویلی کے اندر ہی کام کرتی ہے۔ سکینہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔

"تم لوگ یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ اور میں چھوٹی ملکانی کو اطلاع کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور اس کے بعد وہ حویلی کے ایک حصے میں غائب ہو گئی۔

حمیداں کو یہاں چھوٹی ملکانی کی خدمت کے لئے لایا گیا تھا' جو ملک عطاء اللہ کے بیٹے ملک ثناء اللہ کی بیوی اور اس حویلی کی بہو تھی۔ اس کا نام تو شاہدہ تھا لیکن وہ چھوٹی ملکانی کہلاتی تھی۔

سکینہ تب کی گئی ہوئی آدھے گھنٹے کے بعد واپس آئی۔ اس دوران وہ دونوں میاں بیوی وہاں کونے میں پڑے ہوئے لکڑی کے تخت پر بیٹھے رہے اور آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔

سکینہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ اس نے اس آدمی کو احمدے سے ملایا۔ اس آدمی کا نام شوکت تھا۔

"شوکت کے ساتھ چلے جاؤ احمدے!" سکینہ نے احمدے سے کہا۔ "یہ تمہیں روٹی شوٹی کھلائے گا اور پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ٹھنڈے میں تم یہاں سے چلے جانا۔

حمیداں اب میرے ساتھ زنان خانے میں جا رہی ہے۔"

"پھر' حمیداں کو گھر آنے کی اجازت کتنے دن کے بعد ملے گی؟" احمدے نے اپنے سینے میں امنڈنے والے آنسوؤں کے طوفان کو بڑی مشکل سے اندر ہی روکتے ہوئے پوچھا۔

"ایک مہینے کے بعد آنا اور دو دن کے لئے حمیداں کو گھر لے جانا۔" سکینہ نے کہا۔ "میں نے چھوٹی ملکانی سے پہلے ہی پوچھ لیا ہے۔ وہ بچوں سے بھی مل لے گی۔ دو دن کے بعد اسے دوبارہ حویلی چھوڑ جانا۔"

"رب راکھا۔" احمدے نے حمیداں کے سر پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا انداز رفیقانہ سے زیادہ بزرگانہ تھا۔ وہ پھاتا کو اس کے کسی بڑے کی طرح تسلی دینا چاہتا تھا۔ اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"رب راکھا۔" حمیداں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی لیکن وہ یہاں کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی اور ایک مستقل تحیر و تجسّس کی کیفیت کا شکار تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پُراسرار دنیا میں آ گئی ہو۔

جب اسے چھوٹی ملکانی کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ شہزادیوں جیسی اس عورت کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ بچپن میں شہزادوں اور شہزادیوں کے بارے میں کتنی کہانیاں سنی تھیں لیکن نہ کبھی کسی شہزادے کو دیکھا تھا اور نہ شہزادی کو اور اب جو عورت حمیداں کی نظروں کے سامنے تھی تو شہزادیاں شاید اسی جیسی ہوتی ہوں گی۔

چھوٹی ملکانی کا کمرہ ایک ایسی چیز تھی جو حمیداں کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ وہ یہاں کی ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اپنی اس خواہش کو بڑی شدت کے ساتھ دباتے ہوئے چپکے چپکے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

چھوٹی ملکانی نے اس سے کچھ زیادہ بات چیت نہیں کی۔ بس سرسری نظر سے اسے دیکھا اور پھر سکینہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم اسے سارا کام سکھا دینا اور سب سے پہلے تو اس کے کپڑے بدلوانا۔ یہ ان کپڑوں میں یہاں رہے گی؟"

"میں ابھی سب انتظام کر دوں گی چھوٹی ملکانی جی!" سکینہ نے فوراً کہا۔ "آپ جیسا حکم دیں۔"

"اس کو ٹھیک ٹھاک کر کے کل سے کام پر لگا دو۔" چھوٹی ملکانی نے سرسری انداز میں کہا۔ "مجھے تو یہ بالکل ہی اجڈ معلوم ہوتی ہے۔ اسے کام سکھاؤ۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ

میرے کمرے وغیرہ کی صفائی ستھرائی کرنا اور چیزوں کو سنبھالنا اچھی طرح سیکھ لے۔ کپڑوں پر استری کرنا اور دوسرے کام بھی سکھاؤ اسے۔"

"سب سکھا دوں گی ملکانی جی!" سکینہ نے جلدی سے کہا۔ "جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہو گا۔"

ایک ہفتے کے اندر اندر حمیداں کی حالت ہی بدل گئی۔

حمیداں نے ایک ایسے گاؤں میں آنکھ کھولی تھی جہاں کوئی بڑا زمیندار اور بہت زیادہ متمول شخص موجود نہیں تھا۔ یہاں کی زیادہ تر آبادی "کمی کمینوں" پر مشتمل تھی، سب کے سب غریب، محنت کش لوگ تھے۔

گاؤں میں بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ پورے گاؤں میں کوئی ایک بھی ٹی وی نہیں تھا۔ وی سی آر کا بھی صرف ان لوگوں نے نام ہی سنا تھا جنہیں گاؤں سے باہر آنے جانے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

گاؤں میں کوئی حویلی تو درکنار، کوئی بہت بڑا مکان تک نہیں تھا۔ سب سے بڑا صرف "لال مکان" تھا جس میں ملک عطاء اللہ کا کارندہ سید نور حسین رہتا تھا اور جب ملک اس گاؤں میں آتا تھا تو وہ خود بھی اسی مکان میں رکتا تھا لیکن یہ بھی ایک معمولی قسم کا مکان تھا۔ نور حسین عرف نورا ہی کو اس گاؤں کا سب سے زیادہ مالدار آدمی قرار دیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ حمیداں سادھن گاؤں میں ملک عطاء اللہ کی حویلی میں پہنچی تو اسے یوں لگا جیسے وہ کسی نئی دنیا میں آ گئی ہو یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اپنا وجود رکھتی تھی لیکن اس کی نظروں سے آج تک مخفی رہی تھی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی اور افسوس بھی کہ دنیا میں اتنا کچھ موجود تھا اور وہ اس سب سے اس قدر بے خبر تھی، اسے تو یہ سب کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

ملک کی حویلی کیا تھی، ایک طلسم کدہ تھا اور اس طلسم کدے کے سارے طلسم اس وقت پوری طرح بیدار ہو کر اپنا کام دکھانے لگتے جب شام ہوتی اور چاروں طرف اندھیرا پھیل جاتا۔ جب چاروں طرف اندھیرا پھیل جاتا تو سارے جادو جاگ اٹھتے اور حمیداں ایک سحرزدہ کیفیت میں مبتلا ہو جاتی۔ اس حویلی کے کئی کمروں میں ٹی وی تھے۔ شام ہوتے ہی پوری حویلی بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھتی۔ یہاں تو نوکروں کے رہنے کی جگہ میں بھی بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے۔ یہ کیسا تماشہ تھا کہ انگلی سے سوئچ کو دباؤ اور بس روشنی ہی

روشنی .... ٹی وی چلتے تو حمیداں کو ایسا لگتا جیسے یہ سارا طلسم کدہ، یہ روشنیوں، رنگوں، خوشبوؤں اور مسرتوں میں ڈوبا ہوا طلسم کدہ، ایک عظیم تماشہ گاہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کیسے کیسے تماشے تھے جو ایک ڈبے میں لگے ہوئے اس شیشے پر نظر آنے لگتے تھے جو ایک بٹن دباتے ہی روشن ہو جاتا تھا۔

حمیداں کے لئے تو یہ سب ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز تھا۔ اس نے دولت کے بارے میں، دولت مندوں اور ان کی زندگیوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس زندگی کی یہ شکل ہو گی۔

اس نے جب پہلے دن بلکہ پہلی رات اس زندگی کے رنگ کو دیکھا تو اس کے دل و دماغ کی دنیا میں ایک زبردست زلزلہ آ گیا۔ یہ سب کچھ اس کے لئے ایک بے خود اور مدہوش کر دینے والے انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ لوگ اس طرح بھی زندگی گزار سکتے ہیں اور گزارتے ہیں .... جس طرح اس حویلی کے لوگ رہ رہے تھے .... اور کچھ لوگ اس طرح زندگی گزارنے پر مجبور تھے جس طرح وہ خود، اس کا میاں، اس کی ساس اور اس کے دونوں بچے زندگی گزار رہے تھے۔

اس کے اندر کوئی چیز بڑے زور سے تڑخی اور پھر چیخ کر ٹوٹ گئی۔ "لعنت ہو..........." اس نے کہا۔

اس تڑخنے اور چیخ کر ٹوٹنے کے عمل کے درمیان بالکل غیر محسوس طور پر اس نے اپنے آپ کو اس نئی دنیا کا ایک حصہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کوئی فیصلہ کر چکی ہے۔

پہلے دن حمیداں غسل خانے میں فوارے کے نیچے نہائی اور وہ بھی خوشبودار صابن سے، جو اسے سکینہ نے دیا تھا۔ اس نے دانے دار، موٹے تولئے سے اپنے گیلے بدن کو پونچھا تو اس کے روئیں روئیں میں گدگدیاں سی بھر گئیں اور پھر سکینہ نے اسے ایک بہت عمدہ، ریشمی شلوار قمیض پہننے کو دی جو اس نے اپنے پرانے اور پیوند لگے لاچے اور بوسیدہ کُرتے کی جگہ پہنی تو اس نے اپنے آپ کو ایک ایسا انسان سمجھا جس نے ابھی ابھی جنم لیا ہو۔ یہاں نوکروں کی رہائش گاہ میں بھی ایک جگہ ایک پرانی الماری رکھی ہوئی تھی جس میں قد آدم شیشہ لگا ہوا تھا۔ حمیداں نے زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو پورے طور سے آئینے میں دیکھا اور وہ خود کو پہچان نہ سکی۔ یہ وہ خود تھی؟ نہیں، یہ وہ خود تو نہیں تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے چھوٹی ملکانی کے سامنے اس کی پیشی ہوئی تھی جو اس محل کی

دوسرے نمبر کی مالکہ تھی اور اس وقت حمیداں اپنے لباس اور اپنے حلیئے کے اعتبار سے اپنے آپ کو اس کے سامنے ایک حقیر کیڑے کی طرح محسوس کر رہی تھی لیکن اب .... اب .... صرف ذرا سی دیر میں سب کچھ کس قدر بدل گیا تھا۔

وہ تو اس چھوٹی ملکانی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوبصورت' پُرکشش اور پُرجمال تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی مقابلہ نہیں تھا اس کا اور چھوٹی ملکانی کا .... اور فی الحقیقت اس کا یہ احساس حُسن جو زندگی میں پہلی بار سرکشی کے ساتھ بیدار ہوا تھا' غلط نہیں تھا۔

حمیداں کی عمر اس وقت بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ گاؤں کی بیشتر لڑکیوں کی طرح اس کی شادی بھی کم عمری میں ہو گئی تھی اور وہ ماں بھی بن گئی تھی۔ بیس سال کی عمر میں وہ ایک چار سالہ بیٹی اور ڈیڑھ سالہ بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔

اور آج وہ ایک قد آدم آئینے میں اپنی کشیدہ قامت کو' اپنے اجلے اجلے حُسن کو' اپنے ریشمی پھولوں جیسے چمکیلے اور خوش رنگ لباس کو دیکھ رہی تھی اور چھوٹی ملکانی سے اپنا مقابلہ کر رہی تھی جو کسی بطخ کی طرح پستہ قد اور موٹاپے کی جانب مائل تھی اور جس کا رنگ ہلکا سانولا' آنکھیں چھوٹی اور پیشانی بہت تنگ تھی لیکن اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی روشنی تھی۔ یہ امارت کی روشنی تھی اور جب یہ روشنی کسی شخص کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے تو وہ باقی سارے عیبوں کو چھپا لیتی ہے۔

گاؤں میں چراغ جلنے کے بعد ہی سونے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں تاریکی میں ڈوب جاتا تھا۔ گھروں کے چراغ گل کر دیئے جاتے تھے اور ہر طرف بڑا گہرا اور پُراسرار سناٹا پھیل جاتا تھا جس میں کتوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کے بولنے کی پُراسرار آوازوں کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خاموشی کے اس غیر معمولی طلسم سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے تھے جو اس وقت بھی جاگتے ہوتے تھے اور ان کی تعداد بہت کم تھی۔

یہاں' حویلی میں "چراغ جلنے" کے بعد تو گویا زندگی کے ایک نئے اور بہت زیادہ خوبصورت دور کا آغاز ہوتا تھا۔ یہ روشنیوں اور رنگوں کا دور تھا۔ رنگوں سے بھری ہوئی یہ روشنیاں حویلی کے در و دیوار سے' چھتوں سے' فانوسوں سے اور ٹی وی کے اسکرین سے پھوٹتی تھیں اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک رنگا رنگ غنچے سے بکھرتے چلے جاتے تھے۔

صرف ایک ہفتے میں حمیداں نے اس نئی دنیا کو اس طرح قبول کر لیا کہ وہ خود کو بھی

اسی کا ایک حصہ سمجھنے لگی اور اب اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ بہت پہلے کیوں نہیں ہو گیا۔ اسے اپنی عمر کے گزارے ہوئے دن' ماہ و سال کے رائیگاں جانے کا احساس ہوتا تھا جو اس نے گاؤں کی اس تاریک اور بوجھل فضا میں گزارے۔

اس انتہائی طاقتور معروضی تبدیلی نے حمیداں کی جذباتی کیفیت کو بہت متاثر کیا تھا۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ وہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکے گی' بچے اسے بہت یاد آئیں گے اور وہ ان کی یاد میں چپکے چپکے آنسو بہائے گی' احمدا بہت یاد آئے گا اور اس کی محبت اسے خون کے آنسو رلائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ نئی دنیا تو اسے پورے کا پورا ہڑپ کئے جا رہی تھی اور وہ بڑی خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے منہ میں ڈال رہی تھیں

حمیداں کو سکینہ نے بہت سے کام بتائے اور سکھائے اور حمیداں نے بڑی تیزی اور عمدگی کے ساتھ وہ سارے کام سیکھ لئے۔ وہ بنیادی طور پر ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی تھی لیکن اس کو اپنی صلاحیتوں اور ذہانت کے آزمانے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"یہ بجلی کی استری ہے۔" سکینہ نے اسے استری دکھائی اور پھر اس کے استعمال کا طریقہ اسے سمجھانے لگی .... حمیداں سب کچھ بڑے غور سے دیکھ اور سن رہی تھی .... "یہ کپڑے دھونے کی مشین ہے .... یہ قالین صاف کرنے کی مشین ہے .... ٹی وی کے سوئچ کو یہاں سے آن کرتے ہیں اور پلگ کو یہاں لگاتے ہیں .... وی سی آر کو اس طرح آن کرتے ہیں .... کیسٹ کو اچھی طرح دیکھ لو۔ اسے یوں اندر ڈالتے ہیں۔ یہ تیر کا نشان دیکھ لو........." یہ سب کچھ حمیداں کے جذباتی ہیجان اور جوش مسرت میں بے حد اضافہ کرتا اور وہ نہایت توجہ اور گہری دلچسپی کے ساتھ ساری باتیں سیکھتی چلی جاتی تھی۔

چھوٹی ملکانی کو اپنی نئی ملازمہ بہت پسند آئی تھی اسے حمیداں میں کئی خوبیاں نظر آئی تھیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ خوش شکل تھی اور بڑی جلدی اپنے اندر سلیقہ پیدا کر کے خوش وضع اور خوش لباس بھی بن گئی تھی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ ذہین اور سمجھدار تھی۔ بات کو فوراً سمجھ لیتی تھی اور کام کرنے میں بہت تیز تھی۔ اس سے ایک بات ایک سے زائد بار کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اسے حمیداں جیسی بے حد معقول لڑکی مل گئی جو ان گنوار عورتوں سے بہت مختلف تھی۔

چھوٹی ملکانی کی الگ کار تھی اور چھوٹے ملک کی الگ۔ ملک صاحب اور بڑی ملکانی کی کاریں بھی الگ الگ تھیں۔ چھوٹی ملکانی اکثر اپنی کار میں بیٹھ کر سیر کے لئے جایا کرتی تھی۔ کار کو ڈرائیور چلاتا تھا جس کا نام رئیس تھا۔ چھوٹی ملکانی کے ساتھ عام طور سے حویلی کی کوئی نہ کوئی عورت ضرور جاتی تھی۔ اکثر تو سکینہ ہی جاتی تھی۔ حمیداں کو ابھی تک یہ موقع نہیں ملا تھا۔

ایک ماہ کا عرصہ یوں گزر گیا جیسے ایک دن کا عرصہ ہو اور اس کے دوران حمیداں نے بہت سے نئے آسمانوں کی سیر کرلی تھی۔ اسے تو وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے تو اس وقت پتہ چلا جب سکینہ نے باہر سے آ کر اسے یہ اطلاع دی کہ اس کا میاں احمدا اس سے ملنے اور اس کو ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہے۔

"وہ باہر ڈیوڑھی میں بیٹھا ہوا ہے۔" سکینہ نے کہا۔ "چھوٹی ملکانی کو بتا دو اور پھر چلی جاؤ۔" اور تب حمیداں کو یاد آیا کہ اسے اس جنت میں آئے ہوئے آج ایک ماہ گزر چکا ہے۔

اس نے چھوٹی ملکانی کو بتایا اور چھوٹی ملکانی نے اسے فوراً اجازت دے دی۔ "دو دن کے بعد واپس آجانا۔" اس نے کہا۔ "بلکہ یوں کروں گی کہ تمہارے لئے گاڑی بھیج دوں گی .... تم گھر پر ہی انتظار کرنا۔"

"آپ .... گاڑی بھیجیں گی؟ میرے لئے؟" حمیداں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ چھوٹی ملکانی نے یہی کہا ہے۔ "میرے لئے ....؟"

"تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے حمیداں؟" چھوٹی ملکانی نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم یہاں کام کرتی ہو۔ مجھے تقریباً ہر وقت ہی تمہاری ضرورت رہتی ہے۔ اگر میں خود گاڑی بھیج کر تمہیں بلوا لوں گی تو اس میں میرا ہی فائدہ ہے۔" چھوٹی ملکانی کی بات بالکل بے ریا تھی۔ اس نے اپنی غرض مندی کا بالواسطہ اعتراف کرلیا تھا۔

احمدے نے جب حمیداں کو دیکھا تو وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ یہ حمیداں تھی؟ نہیں .... یہ تو کوئی بیگم لگ رہی تھی۔ بھلا حمیداں کے پاس ایسے کپڑے .... ایسی چپلیں .... اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ حمیداں کس قدر اجلی اجلی اور روشن روشن نظر آ رہی تھی کہ اس کے چہرے سے خوشی جیسے پھوٹی پڑتی تھی۔

مگر حمیداں کو اس قدر خوش و خرم دیکھ کر احمدا خوش نہیں ہوا۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں تو یہ خیال کسی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا کہ حمیداں آنکھوں میں

آنسو بھرے، تصویرِ غم بنی ہوئی، اس کا خیرمقدم کرے گی اور اسے رو رو کر بتائے گی کہ اس نے اس کے اور بچوں کے بغیر، یہ مہینہ کس مشکل سے کاٹا ہے اور ایک ایک دن اسے پہاڑ لگا ہے اور وہ دونوں مل کر اپنی مشترکہ بدنصیبی کا ماتم کریں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، حمیداں تو بالکل ہی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

اور جب وہ گاؤں پہنچی تو گھر میں رہنے کے مقابلے میں اس نے گاؤں کے گھروں میں گھومنے میں زیادہ وقت صرف کیا۔ وہ ان سب لوگوں کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ وہاں حویلی میں چھوٹی ملکانی کی ذاتی ملازمہ کی حیثیت سے کیسی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ حویلی کی ان عام ملازماؤں سے بہت مختلف تھی جو سارا دن، دنیا بھر کے محنت مشقت کے مختلف قسم کے کام انجام دیا کرتی تھیں۔ وہ تو صرف چھوٹی ملکانی کے ذاتی کام کرتی تھی جو ہرگز اس قدر محنت طلب نہیں ہوتے تھے۔

اس نے دو دن اپنے گھر میں، میاں اور بچوں کے درمیان اسی طرح گزارے کہ وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار رہی۔ یہ گھر اس کا اپنا تھا، میاں اس کا اپنا تھا، بچے اس کے اپنے تھے، مگر یہ سب کچھ کس قدر میلا کچیلا اور درد آگیں تھا۔ حویلی اس کی اپنی نہیں تھی۔ اس کی وہاں دو کوڑی کی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تو صرف چھوٹی ملکانی کی نوکرانی تھی لیکن وہاں سب کچھ کس قدر صاف ستھرا اور کس قدر فرحت انگیز تھا۔

اس کا وجود ان دو الگ الگ دنیاؤں کے درمیان لڑھکتا رہا، ڈولتا رہا، گھسٹتا رہا۔

دو دن کے بعد صبح کو گاؤں میں گاڑی آگئی۔ گاؤں میں سید نور حسین کے مکان "لال مکان" کے بعد احمدے کا مکان وہ دوسرا مکان تھا جس کے دروازے پر کبھی کوئی کار آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

سارے گاؤں میں ایک دھوم مچ گئی تھی۔ کھلبلی مچ گئی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں بھاگ بھاگ کر اس کار کو دیکھنے کے لئے آ رہی تھیں جو حمیداں کو لینے کے لئے آئی تھی۔ کار میں ڈرائیور رئیس کے ساتھ عمر رسیدہ ملازمہ سکینہ بھی تھی۔

ڈرائیور رئیس اور سکینہ گاڑی سے اتر کے نیچے آئے اور انہوں نے حمیداں کے گھر والوں سے ملاقات کی۔ سکینہ تو احمدے سے پہلے بھی مل چکی تھی۔ البتہ رئیس سے ان لوگوں کی پہلی ملاقات تھی۔

رئیس اور احمدا ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف نظر آ رہے تھے۔ حمیداں ان

دونوں کے درمیان موجود فرق کا بڑی گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔

رئیس سر سے پاؤں تک عمدہ' سفید' چکنی' اجلی اجلی وردی میں ملبوس تھا۔ سفید بش شرٹ اور سفید پتلون اور سر پر سفید ٹوپی' دبلا پتلا' چھریرا بدن' سجل نقوش اور کھلتا ہوا رنگ' پیروں میں سفید عمدہ جوتے اور ان کے ساتھ سفید ہی موزے۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس وہ جیسے کسی اور دنیا کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔

احمدے کے جسم پر ایک پرانی سی لنگی تھی اور اوپر سے ایک میلا کُرتہ' جس کا رنگ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا اور کپڑا گھس گیا تھا۔ اس کے دونوں کپڑوں میں سے پسینے کی سخت بو اٹھ رہی تھی۔ احمدے کا سر ننگا تھا اور اس کے بال جو کبھی گہرے سیاہ رنگ کے ہوا کرتے تھے' دھوپ میں جھلس کر جل کر' بھوسے کی رنگت کے اور بھوسے کی شکل کے ہو گئے تھے۔

ان دونوں کو ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر دونوں کے مقدر کو بالکل الگ الگ سمجھا جا سکتا تھا۔

حمیداں' سکینہ کے ساتھ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی اور گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ رئیس اگلی سیٹ پر اکیلا تھا اور گاڑی چلا رہا تھا اور حمیداں کا دماغ ساتویں آسمان کی سیر کر رہا تھا۔ آج سے صرف ایک ماہ پہلے تک یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ وہ کسی کار میں بیٹھے گی اور کوئی ڈرائیور اس کار کو چلا رہا ہو گا۔ یہ تو ایک ایسا خیال تھا جس کا وہ خواب دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اب یہ سب ایک حقیقت تھا' وہ کار میں بیٹھی جا رہی تھی' رئیس گاڑی چلا رہا تھا۔

حمیداں واپس سادھن گاؤں' حویلی میں آ گئی اور چھوٹی ملکانی کی خدمت میں لگ گئی۔ ایک دنیا سے وہ نکل کر آئی تھی جو اس کی اپنی دنیا تھی' وہاں کی ہر چیز اس کی اپنی تھی اور ایک دوسری دنیا میں وہ آئی تھی جہاں کچھ بھی اس کا نہیں تھا اور اس کا وجود ان دونوں دنیاؤں کے درمیان جیسے تقسیم ہوا جا رہا تھا' منتشر ہوا جا رہا تھا۔ شکست و ریخت کا ایک زبردست عمل تھا جو اس کے اندر جاری تھا اور اس عمل میں رئیس کی ذات نے کچھ اور شدت پیدا کر دی تھی۔

ڈرائیور رئیس پہلے ہی دن سے اسے اچھا لگا تھا۔ وہ ایک بڑا چاق و چوبند اور مستعد قسم کا نوجوان آدمی تھا جس کی مسکراہٹ بڑی خوبصورت تھی۔ وہ اسی حویلی میں رہتا تھا اور تنہا تھا۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ حمیداں کو تقریباً روزانہ ہی اس سے ملاقات کا موقع ملتا تھا کیونکہ چھوٹی ملکانی کا کہیں نہ کہیں آنا جانا رہتا تھا۔ رئیس چھوٹی ملکانی کا ڈرائیور تھا لیکن اکثر وہ چھوٹے ملک اور چھوٹی ملکانی دونوں کے لئے ڈرائیونگ کا کام کرتا تھا۔ چھوٹی ملکانی کو جب بھی رئیس کو بلوانا ہوتا تھا وہ حمیداں کو بھیج کر ہی اسے بلواتی تھی یا پیغام بھجواتی تھی۔

اور پھر رفتہ رفتہ حمیداں رئیس کی نگاہوں میں اپنے لئے ایک ایسی گرمی محسوس کرنے لگی جس کے زیر اثر اسے اپنا وجود پگھلتا ہوا لگتا تھا اور اسے لگتا تھا رئیس کی گرم گرم نگاہیں اس کے جسم کے آر پار سرایت کئے جا رہی ہیں اور اسے جلائے ڈال رہی ہیں اور اگر وہ کچھ زیادہ دیر تک ان نگاہوں کے سامنے رہی تو جل کر خاک ہو جائے گی اور کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔

یہ سب کچھ حمیداں کے لئے بالکل نیا اور انوکھا تھا' عذاب ناک بھی اور طرب انگیز بھی۔ وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے خود قاصر تھی اور وہ اپنے آپ سے ڈرنے لگی تھی' اسے خود سے خوف آنے لگا تھا۔

اس کی شادی تقریباً چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور اس شادی میں چونکا دینے والی' دل کو تڑپا دینے والی کوئی بات نہیں تھی۔ بس' جس طرح گاؤں میں غریب لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں' اسی طرح اس کی شادی بھی ہوئی تھی۔ احمدے کو وہ پہلے سے جانتی تھی۔ ان دونوں کی شادی بہت عرصے پہلے طے ہو چکی تھی اور حمیداں نہ اس سے خوش تھی نہ غمگین۔ اس کے لئے یہ سب کچھ عام زندگی کا' معمول کے مطابق روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ ایک میکانکی عمل تھا۔ وہ بیوی بن گئی' دو بچوں کی ماں بن گئی' شادی کو پانچ سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ گزر گیا لیکن یہ سب کچھ اس کے لئے زندگی کے طے شدہ معمولات سے زیادہ اہمیت اختیار نہ کر سکا۔ بس ایسا ہی تھا' کیونکہ ایسا ہوتا آیا تھا۔

رئیس اس کی زندگی میں وہ پہلا مرد تھا جس نے اس کے دل میں ایک ایسے احساس کو بیدار کیا جس سے وہ اب تک ناواقف تھی۔ نگاہوں کی حرارت دل میں اتر کر دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو کر ایک ایسا انوکھا رنگ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ اسے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

وہ اس نئی دنیا میں آ گئی تھی' جہاں کی ہر چیز اس کے لئے نئی تھی' یہاں کے سارے

تجربے اس کے لئے نئے تھے اور انہی تجربوں میں سے ایک یہ تجربہ بھی تھا لیکن یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو اس کے وجود کو جیسے جڑ سے ہلائے جھٹکے دے رہا تھا۔

وہ ایک شادی شدہ عورت' دو بچوں کی ماں تھی اور اس کی زندگی میں اب کسی دوسرے مرد کی گنجائش موجود نہیں تھی لیکن نہ جانے کہاں سے 'کدھر سے' کیونکر ایک چور دروازہ نکل آیا تھا اور اس چور دروازے سے کوئی چپکے چپکے' دبے پاؤں لیکن جارحانہ انداز میں اندر گھستا چلا آ رہا تھا۔

ہر روز رئیس کی نگاہوں کی گرمی بڑھتی جا رہی تھی اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور زیادہ گہری اور زیادہ قاتل ہوتی جاتی تھی اور چور دروازے سے بڑھتے ہوئے اس کے قدم مزید آگے بڑھتے چلے آتے تھے۔

حمیداں بار بار ملامت کا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر اس چور دروازے کے آگے کھڑی ہو جاتی تھی اور اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ مزاحمت پر آمادہ ہو جاتی تھی لیکن رئیس کی ایک نرم مسکراہٹ' اس کی آنکھوں کی حرارت کی ایک لپک' اس کی ساری مزاحمت کو پانی کر دیتی تھی' ملامت کا ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتا تھا اور وہ خود کو اس حرارت میں پگھلا دینا چاہتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ضم کر دینا چاہتی تھی۔

بڑا شدید جذباتی آزار تھا جس سے وہ گزر رہی تھی۔ وہ خود کو بری طرح تقسیم ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا اور اس کے وجود میں جب غیر معمولی نشاط و انبساط کی خفیہ اور طاقتور لہریں' چپکے چپکے سر اٹھاتیں تو وہ انجام کے بارے میں بالکل بھول جاتی اور خود کو رئیس کے تصور میں ڈبو دیتی۔

ان دونوں میں اب اچھی خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی اور وہ اکثر کافی دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ عام سی باتیں' باتوں کے لئے تو ہزارہا موضوع ہوتے ہیں۔

"تم کبھی شہر گئی ہو حمیداں؟" ایک روز رئیس نے اس سے پوچھا۔ اس وقت وہ دونوں اکیلے تھے۔

"نہیں۔" حمیداں نے جواب دیا۔ "میں تو بس اپنے گاؤں سکندر پور سے نکل کر یہاں آئی ہوں .... اس کے علاوہ میں نے کوئی اور جگہ نہیں دیکھی۔"

"ایک بار شہر چل کر دیکھو تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیا کیسی ہے۔" رئیس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہولے سے کہا اور حمیداں جیسے پگھلنے لگی۔ اف وہ جھلسا دینے والی نگاہیں۔ "تم نے تو صرف گاؤں ہی دیکھے ہیں' جہاں زندگی رینگتی ہے' کیڑے مکوڑوں

کی طرح .... تم نے شہر نہیں دیکھے ہیں' جہاں زندگی بھاگتی ہے' تیز رفتار گھوڑے کی طرح .... بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"میں .... چھوٹی ملکانی سے کہوں گی کہ مجھے ایک بار شہر دیکھنے کا موقع دیں۔" حمیداں نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا۔ "وہ خود تو اکثر شہر جاتی رہتی ہیں۔ شاید وہ کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔"

"وہ کیوں لے جائیں گی حمیداں!" رئیس نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ جب شہر جاتی ہیں تو وہاں ان کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ تمہارا وہاں کیا کام ہے بھلا؟ مگر تم فکر نہ کرو' میں تمہیں کسی دن اپنے ساتھ شہر لے چلوں گا .... اور جب تم شہر کی سڑکوں پر میرے ساتھ چلو گی' تو لوگ پلٹ پلٹ کر ہم دونوں کو دیکھیں گے ...."

"وہ کیوں؟" حمیداں نے حیرت سے پوچھا۔ "لوگ کیوں ہمیں پلٹ پلٹ کر دیکھیں گے؟"

"اس لئے کہ میری اور تمہاری جوڑی دیکھنے والوں کو بہت اچھی لگے گی۔" رئیس کی آواز ایک بہت ہلکی سرگوشی میں بدل گئی تھی اس کی نگاہوں کی حرارت ایک دم سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی اس نے آہستہ سے حمیداں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

حمیداں نے اپنے ہاتھ کو رئیس کے ہاتھ کی گرفت سے چھڑانا چاہا لیکن وہ تو اپنے ہاتھ کو جنبش بھی نہیں دے سکی۔ اسے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس دن سے جس دن وہ پیدا ہوئی تھی' اسی ایک لمحے کے انتظار میں تھی۔ یہ لمحہ تو اس کی تکمیل کا لمحہ تھا۔ اس کے نامکمل وجود کو اپنی تکمیل کے لئے اسی ایک لمحے کی تلاش تھی۔

"حمیداں۔" اسے دور سے چھوٹی ملکانی کی آواز سنائی دی اور وہ ایک دم اس سحر سے چونک پڑی جس میں وہ غیر ارادی طور پر گرفتار تھی۔ چھوٹی ملکانی کی آواز رئیس نے بھی سن لی تھی اور اس نے جلدی سے حمیداں کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ حمیداں تیزی سے اندر کی طرف بھاگی اور رئیس جلدی جلدی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆======☆======☆

اگلے چند ماہ کی مدت کے دوران رئیس اور حمیداں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ ان کے درمیان کوئی دوری باقی نہیں رہ گئی اور حمیداں پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ اصل میں تو مرد وہ ہوتا ہے جس کے بغیر جینے کا عورت تصور بھی نہ کر سکے اور رئیس اس

کے لئے ایسا ہی مرد تھا' جس کا انتخاب اس نے خود کیا تھا' جسے اس کے دل نے قبول کیا تھا اور جہاں تک احمدے کا تعلق تھا تو اسے احمدے سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اسے احمدے سے ہمدردی تھی۔ وہ اس کا شوہر ضرور تھا لیکن اس کے انتخاب میں اس کا اپنا کوئی حصہ نہیں تھا۔ یہ دل کا سودا نہیں' یہ تو محض ضابطے کی ایک کارروائی تھی۔

رئیس ملتان کا رہنے والا تھا اور وہاں سے بغرض ملازمت لاہور آیا تھا۔ یہاں اسے ایک جگہ ڈرائیور کی نوکری مل گئی لیکن اس خاندان نے جلد ہی کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا اور رئیس کو اپنے ایک جاننے والے خاندان کے حوالے کر دیا جو راولپنڈی کے نواح میں بہت بڑی جاگیر کا مالک تھا اور یوں رئیس ملک عطاء اللہ کے خاندان کی ملازمت میں آ گیا اور اس کی بہو' چھوٹی ملکانی کا ڈرائیور بن گیا۔ رئیس نے حمیداں کو بتایا کہ اس کے گھر میں اس کی ایک بوڑھی خالہ اور ایک نیم معذور خالہ زاد بہن کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ رئیس کے ماں باپ تو بچپن میں ہی مر گئے تھے اور اسی خالہ نے اس کی پرورش کی تھی جو خود بھی بے انتہا غریب تھی اور اس لئے اسے زیادہ تعلیم نہیں دلوا سکی۔ وہ بے چاری خود کُرتے کاڑھ کے اور اسی قسم کے دوسرے چھوٹے موٹے کام کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ تاہم اس نے رئیس کو پرائمری تک تو تعلیم دلوا ہی دی تھی تاکہ اسے کم از کم اردو لکھنا پڑھنا تو آ جائے اور اس کے بعد اس نے اس چھوٹے لڑکے کو ایک مستری کے پاس گاڑیوں کی مرمت وغیرہ کا کام سیکھنے کے لئے بھیج دیا۔ یہاں رئیس نے کئی برس تک کام کیا اور وہ ایک اچھا ڈرائیور مکینک بن گیا لیکن وہاں کام زیادہ نہیں ملتا تھا۔ کبھی ملتا تھا' کبھی نہیں ملتا تھا۔ اس لئے وہ تلاش معاش میں لاہور چلا آیا اور وہاں سے راولپنڈی کے نواح میں.........

"گزشتہ برسوں کے دوران مَیں نے کافی کما لیا ہے۔" اس رات رئیس نے حمیداں کے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھراتے ہوئے کہا۔ "اگر میں کچھ عرصے تک کام نہ کروں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمارا کام چلتا رہے گا۔ ہم یہاں سے ملتان چلتے ہیں۔ وہاں چل کر ہم شادی کر لیں گے اور پھر دو چار دن رہ کر سیدھے کراچی کا رخ کریں گے۔ وہاں میرے شہر کے دو ایک لڑکے ہیں' ان کے پتے میرے پاس موجود ہیں۔ انہیں تلاش کر لیں گے اور کراچی تو ایسی جگہ ہے کہ جہاں خالی مٹی ڈھونے والے اور پتھر توڑنے والے لوگ بھی بھوکے نہیں رہتے۔ سنا ہے اس قدر کام ہے وہاں کہ آدمی گھنٹہ بھر بھی کام کے بغیر نہیں رہتا۔"

"مگر......... رئیس! .... میں تو .... میری تو شادی ہو چکی ہے۔" حمیداں نے نظریں جھکا کر بہت آہستہ سے معذرت خواہانہ انداز میں یوں کہا جیسے وہ کسی بہت بڑے جرم کا اعتراف کر رہی ہو۔

"چھوڑو اسے اور بھول جاؤ۔" رئیس نے اسے اپنے اور زیادہ قریب کرتے ہوئے کہا۔ "احمدا تمہارے لائق نہیں تھا حمیداں! سکندر پور گاؤں کو اور اس کے تمام لوگوں کو بھول جاؤ۔ ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے حمیداں .... میری اور تمہاری مشترکہ زندگی' جو ہماری محبت سے عبارت ہو گی' جس میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو گا۔"

اور یوں حمیداں نے اپنی پرانی زندگی کو بوسیدہ' پھٹے پرانے اور بدبودار لباس کی طرح اتار پھینکنے اور ایک نیا لباس زیب تن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے پر پہنچنے تک اسے آگ اور خون کے نہ جانے کتنے دریاؤں سے گزرنا پڑا لیکن وہ ان سب میں تیرتی' ہاتھ پیر مارتی' اپنے مطلوبہ ساحل کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

وہ حویلی سے' وہاں کے مالکوں کی مرضی کے بغیر ایک قدم باہر نہیں نکال سکتی تھی۔ وہ "قرضے کی ادائیگی" کے سلسلے میں آنے والی نوکرانی تھی اور اسے یہاں حویلی میں مقید رہ کر ایک غیر معینہ مدت تک بلامعاوضہ کام کرنا تھا۔ بیگار کرنی تھی۔ وہ یہاں سے کہیں اور نہیں جا سکتی تھی۔

چنانچہ وہ رات کی تاریکی میں ایک پچھلے دروازے سے چپکے سے حویلی سے فرار ہو گئی۔ رئیس تو پہلے ہی اپنی نوکری سے "استعفیٰ" دے چکا تھا اور اس نے مالکوں کو بتایا تھا کہ وہ واپس لاہور جا رہا ہے۔

ان دونوں کے سارے انتظامات پہلے سے مکمل تھے۔ حمیداں حویلی سے باہر نکلی تو رئیس اس کا منتظر تھا اور وہ دونوں تیزی کے ساتھ پیدل اگلے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے جہاں ریلوے اسٹیشن تھا اور جہاں سے انہیں اگلے ایک گھنٹے بعد ملتان جانے والی ایک گاڑی مل سکتی تھی۔ گاؤں کا فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں تھا اور وہ ایک گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچ سکتے تھے اور پہنچ گئے۔

"مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے رئیس!" حمیداں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک بہت بڑا قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن اب وہ ڈر کے مارے مری جا رہی تھی۔ وہ کسی ایک کی نہیں' بیک وقت ایک سے زائد لوگوں کی مجرم تھی۔

"ڈرو مت حمیداں!" رئیس نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "ایک بار ہم ٹرین میں بیٹھ جائیں' اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بس جلدی جلدی چلتی رہو .... قدم مت روکو۔"

حمیداں چل نہیں رہی تھی' وہ تو جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ خوف' شوق اور تجسّس' اسے بڑی تیزی سے آگے دھکیل رہے تھے اور وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں آنے والے لمحات کا نشہ بار بار مختلف شکلیں اختیار کر کے ابھر رہا تھا۔

رئیس نے اسے بتایا تھا کہ اس کی خالہ اسے بہت چاہتی ہے اور حمیداں کو اس کے ساتھ دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گی۔ وہ حمیداں کا تعارف ایک بے آسرا لڑکی کی حیثیت سے کرائے گا اور ملتان پہنچتے ہی وہ مولوی صاحب کو بلا کر نکاح پڑھوا لیں گے۔

یہ سب کچھ کیسے ہو سکے گا' کس طرح ہو سکے گا۔ رئیس کی خالہ کا رویہ اس کے ساتھ کیا ہو گا۔ ان ساری باتوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا ذہن کافی پریشان ہو رہا تھا۔ کسی کسی وقت تو اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا۔ آخر اس نے یہ سب کیا ہی کیوں؟

وہ دونوں اسٹیشن پہنچ گئے اور رئیس نے ملتان کے دو ٹکٹ بھی خرید لئے۔ حمیداں سر سے پاؤں تک ایک سیاہ برقع پہنے ہوئی تھی۔ اسٹیشن پر روشنی میں اس نے اپنے چہرے کو نقاب سے پوری طرح چھپا رکھا۔ چھوٹے سے دیہی اسٹیشن کا پلیٹ فارم کچا تھا اور یہاں مٹی کے تیل کی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ بجلی ابھی اس گاؤں میں نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

کچھ ہی دیر کے بعد گاڑی آ گئی اور رئیس نے حمیداں کو زنانہ ڈبے میں سوار کر دیا۔ انہیں الگ الگ ڈبوں میں سفر کرنا تھا۔ حمیداں کو سوار کرا دینے کے بعد اس نے خود بھی اپنے لئے کسی نہ کسی طرح ایک ڈبے میں جگہ بنالی۔

حمیداں زندگی میں پہلی بار ٹرین میں بیٹھی تھی اور شدید ہیجان' تجسّس' خوف اور بے یقینی کا شکار تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ کیونکر ہو گیا........ مگر اب تو یہ ہو گیا تھا۔

جب تک گاڑی پلیٹ فارم سے روانہ نہیں ہو گئی وہ اپنے چہرے کو نقاب سے ڈھانپے رہی۔ گاڑی اس اسٹیشن پر دو تین منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

حمیداں کے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا' بہت گہرا' گاڑھا گاڑھا اندھیرا' جس میں دور دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسٹیشن کی مریل اور مدھم روشنیاں

بہت پیچھے چھوٹ گئی تھیں اور اب اندھیرا اور صرف اندھیرا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی اندھیروں کی مسافر بن گئی ہے۔ وہ گھور اندھیروں میں' نامعلوم راستوں پر' نامعلوم منزلوں کی جانب سفر کر رہی ہے۔ اس نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ باہر دیکھنے کے لئے کچھ نہیں تھا' وہاں صرف اندھیرا تھا۔

جب افق پر سپیدہ سحری نمودار ہوا اور رات کی بہت گاڑھی اور بوجھل تاریکی دھیرے دھیرے گھلنے لگی اور اس کے پیچھے سے ہلکے ہلکے مناظر نمودار ہونے لگے تو اس وقت ٹرین ایک بہت بھرے پُرے اور سرسبز و شاداب علاقے سے گزر رہی تھی۔ حمیداں نے اس خوبصورت منظر کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اندھیرا دور ہو گیا تھا اور روشنی نمودار ہو گئی تھی۔ روشنی' جو زندگی اور امید کی علامت تھی۔

صبح کے اجالے میں جب پہلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو رئیس اپنے ڈبے سے اتر کر حمیداں کے ڈبے کی طرف آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور حمیداں کے دل کو گہرا سکون حاصل ہوا۔ نہ جانے کب سے وہ تنہائی کا عذاب جھیل رہی تھی۔

زیادہ بات کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ رئیس نے جلدی جلدی پلیٹ فارم سے اس کے اور اپنے لئے پوری ترکاری خریدی اور ناشتہ اس کے حوالے کر کے وہاں سے چلا گیا۔ گاڑی نے سیٹی بجا دی اور پھر وہ دھیرے دھیرے رینگنے لگی۔

اور وہ کوئی صبح کے دس بجے کا وقت تھا جب تقدیر نے حمیداں کی زندگی پر دائمی بربادی کی مہر لگا دی۔

کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ حمیداں تو پڑھنا نہیں جانتی تھی اور نام نہیں پڑھ سکتی تھی۔ گاڑی رکی اور رئیس اس کے پاس آیا۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" اس نے اپنی آنکھوں میں ساری دنیا کی محبتیں سمیٹ کر حمیداں سے پوچھا۔

"میں ذرا دیر کو نیچے آ جاؤں؟" حمیداں نے آہستہ سے کہا۔ "بیٹھے بیٹھے ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئیں .... میں تو اس طرح بیٹھنے کی عادی ہی نہیں ہوں۔"

"ہاں' نیچے آ جاؤ۔" رئیس نے فوراً کہا۔ "ذرا یہاں ٹہل لو۔"

حمیداں فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور دوسری مسافر عورتوں کے درمیان میں سے جگہ

بناتی ہوئی دروازے تک جا پہنچی۔ پھر وہ نیچے اتر گئی اور پلیٹ فارم پر رئیس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

اس کی ٹانگیں واقعی درد کرنے لگی تھیں اور اب جو اسے پورے قد سے کھڑے ہونے کا موقع ملا تو اس نے بڑا آرام محسوس کیا اور وہ دھیرے دھیرے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگی۔ رئیس بھی اس کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر پانی کا نل تھا۔ حمیداں پانی پینے کے لئے نل کے پاس چلی گئی۔ اس نے نل کھولا اور دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر اپنے چہرے پر چھپکے مارنے لگی۔ سارا چہرہ مٹی اور گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اسے اس طرح منہ دھونے میں بڑا مزہ آیا۔ رئیس اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اور اچانک گاڑی نے سیٹی دے دی۔

"جلدی چلو۔" رئیس نے گھبرا کر کہا۔ "گاڑی سیٹی دے رہی ہے۔" اور حمیداں ہڑبڑا کر نل کے پاس سے اٹھ بیٹھی۔ دونوں تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے اور ایک دم سے حمیداں کا برقع اس کے پیروں میں الجھ گیا اور گر پڑی۔ اس نے اس سے پہلے کبھی برقع نہیں اوڑھا تھا اور وہ اس کی بالکل عادی نہیں تھی۔ یہ وبال اپنے اوپر لاد کر وہ خود کو سخت مصیبت میں محسوس کر رہی تھی۔

رئیس نے جلدی سے اسے سہارا دیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن پیر نہ جانے کس طرح سے مڑ گیا تھا کہ زمین پر ہی نہیں رکھا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس نے کوشش کر کے اسے زمین پر رکھا اور اذیت برداشت کرتی ہوئی رئیس کے ساتھ ساتھ ٹرین کی طرف لپکی اس اثنا میں ٹرین آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ رئیس اگر تنہا ہوتا تو وہ ایک سیکنڈ میں صحیح انداز سے دوڑ کر ٹرین کو پکڑ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ حمیداں تھی جس کے پاؤں میں اچانک تکلیف ہو گئی تھی۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر ٹرین کی طرف گھسیٹ رہا تھا اور ٹرین کی رفتار ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

وہ دونوں جب ٹرین کے بالکل نزدیک پہنچے تو ڈبے ان کی نظروں کے سامنے سے تیزی سے بھاگ رہے تھے' رئیس کے لئے اب خطرہ مول لینا ممکن نہیں تھا۔ وہ حسرت سے ٹرین کو دیکھا رہا جو کٹاکٹ' کٹاکٹ کرتی ہوئی اس کی آنکھوں کے سامنے سے بھاگی جا رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" رئیس نے حمیداں کو تسلی دیتے ہوئے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہمارے سوٹ کیس میں تھا ہی کیا۔ میرے اور تمہارے کچھ کپڑے اور کچھ

اور چھوٹی موٹی چیزیں' باقی سب کچھ تو میری جیبوں میں ہے .... پیسے بھی' ٹکٹ بھی .... اور تمام ضروری کاغذات بھی.........."

"لیکن .... اب ہم ملتان کیسے پہنچیں گے رئیس؟" حمیداں بالکل حواس باختہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔

"دوسری گاڑی سے۔" رئیس نے اسے سمجھایا۔ "کوئی صرف ایک گاڑی تو نہیں چلتی۔ ہم دوسری گاڑی سے ملتان چلے جائیں گے۔"

اس نے حمیداں کو پلیٹ فارم پر ایک بینچ پر بٹھا دیا اور خود اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنی پریشانی بیان کی۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا کہ وہ اس کے سامان کو محفوظ کرنے کی کوشش کرے گا اور اب ملتان جانے والی دوسری گاڑی اسے کوئی دو گھنٹے کے بعد مل سکتی ہے۔ وہ وہاں سے واپس آیا اور اس نے حمیداں کو ساری بات بتا دی۔

"اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے حمیداں سے کہا۔ "ہم دو گھنٹے کا وقت یہیں اسی جگہ گزار دیں گے اور اگلی گاڑی سے ملتان چلیں گے۔"

حمیداں سخت شرمندہ اور خوفزدہ تھی اور اپنے آپ کو اس ساری گڑبڑ کا ذمہ دار قرار دے رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں حمیداں۔" رئیس اسے تسلی دے رہا تھا۔ "اصل میں تو میری غلطی ہے۔ مجھے خود اندازہ کرنا چاہئے تھا کہ تمہیں وہاں تک نہیں جانے دینا چاہئے تھا۔"

☆======☆======☆

حوالدار نبی داد خاں نے جب ان دونوں کے سامنے سے دوسرا چکر لگایا اور اپنی نظریں ان دونوں کے چہرے پر باری باری پیوست کیں تو اس نے ان دونوں ہی کے چہروں پر پریشانی اور خوف کی جھلک دیکھ لی۔ وہ تو بہت ہی شاطر اور تیز قسم کا آدمی تھا اور اس قسم کے معاملات کو تاڑنے میں اس کی نظر بڑی مہارت رکھتی تھی۔

سیاہ برقعے میں ملبوس لڑکی جس کا چہرہ کھلا ہوا تھا' بے حد خوبصورت تھی اور خاصی کم عمر بھی اور اس کے ساتھ جو نوجوان تھا وہ بھی زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ دونوں پلیٹ فارم پر ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کے پاس کوئی سامان نہیں نظر آ رہا تھا۔ پہلے چکر میں تو وہ ان دونوں پر سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر گیا لیکن دوسرے چکر میں جب اس نے ذرا غور سے انہیں دیکھا تو ان کے چہروں پر اچانک نمودار ہو جانے والے خوف کے سایوں نے

اس کی چھٹی حس کو بیدار کر دیا۔

تیسرے چکر میں وہ ان دونوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "کون ہو تم دونوں؟" اس نے بھاری آواز میں سوال کیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم ملتان جا رہے ہیں۔" رئیس نے جلدی سے کہا اور حوالدار کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں مختصر بتا دیا۔ "اب ہم دوسری گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دو گھنٹے بعد آئے گی۔"

"یہ لڑکی تمہاری کون ہے؟" حوالدار نبی داد خاں نے آنکھیں نکال کر کرخت آواز میں پوچھا۔ "کہاں سے اٹھا کر لائے ہو اسے؟"

بیک وقت پولیس کے حوالدار اور ڈاکو نبی داد خاں کی تجربہ کار نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے اور وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے جان بوجھ کر ایسی بات کہی جسے سن کر رئیس لرز کر رہ گیا۔

"یہ .... میں .... میں اسے کہیں سے اٹھا کر نہیں لایا۔" اس نے گڑبڑا کر کہا لیکن دل کا چور زبان پر' چہرے سے' آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ "یہ تو .... یہ میری بیوی ہے۔"

"بیوی ہے تمہاری؟" نبی داد خاں نے اسے گھور کر کہا۔ "کب شادی ہوئی تھی؟ دن تاریخ' سن بتاؤ۔"

رئیس کو سوچنے میں کچھ وقت لگا اور نبی داد کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

"کیوں بی بی!" اس نے جلدی سے حمیداں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کس تاریخ کو' کب شادی ہوئی تھی تمہاری؟"

"وہ .... ابھی بس .... حال ہی میں .... چند ماہ ہوئے ہیں۔" حمیداں کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اس نے سہم کر رئیس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔" نبی داد خاں سب کچھ سمجھ چکا تھا اور اب اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔ "تم دونوں کو تھانے چلنا ہو گا۔ وہاں تمہارے الگ الگ بیانات ہوں گے۔ اس کے بعد تمہیں واپس آنے کی اجازت مل جائے گی۔ چلو اٹھو۔"

رئیس سمجھ گیا کہ اب آسانی سے جان نہیں چھوٹ سکے گی' حوالدار کو ان دونوں پر شک ہو گیا تھا اور اگر اس نے انہیں تھانے لے جا کر ان کے الگ الگ بیانات لئے تو سخت گڑبڑ ہو جائے گی۔ بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس نے مناسب یہی سمجھا کہ حوالدار کو یہیں

کچھ دے دلا کر چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ وہ شہروں میں رہ چکا تھا۔ اس قسم کے معاملات میں کیا کرنا چاہئے' اس کا اسے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور تھا۔

"آپ ذرا میری بات سنیں حوالدار صاحب!" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور حوالدار کو ساتھ لے کر ایک طرف چلا گیا۔

"ہم عزت دار لوگ ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہماری عورتیں تھانے نہیں جاتیں۔ آپ یہیں مک مکا کر لیجئے .... میں اپنی بساط بھر آپ کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تھانے میں کچھ بھی نہیں ہو گا جی' اطمینان رکھو۔" نبی داد خاں نے بڑی نرمی سے کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ "صرف تم دونوں کے الگ الگ بیانات ہوں گے اور پھر تم وہاں سے واپس آ سکتے ہو۔ اگر وہ .... واقعی تمہاری بیوی ہے تو پھر تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بات یہ ہے سنتری بادشاہ کہ ہم دونوں کی شادی ابھی ہوئی نہیں ہے۔" رئیس کے پاس سچ بولنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ "اور میں .... میں آپ کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں .... بس ہمیں .... جانے دیں۔"

نبی داد خاں کے چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ تو ان دونوں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ آدمی اس لڑکی کو کہیں سے بھگا کر لایا ہے اور اب اس کے شبہے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

لڑکی غیر معمولی طور پر خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ ایسی لڑکیاں روز روز ہاتھ نہیں آتی تھیں۔ کتنے عرصے کے بعد ایک ایسی شاندار لڑکی ہاتھ آ گئی تھی۔

پولیس کے حوالدار کی وردی میں نبی داد خاں کی شکل میں ایک بڑا خوفناک ابلیس پوشیدہ تھا۔

وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا آدمی تھا جس میں اور بھی کئی پولیس والے شامل تھے۔ وہ لوگ مل کر ڈاکے ڈالتے تھے اور پھر شبہے میں نہ جانے کن کن لوگوں کو پکڑ کر پورے کیس کو تباہ کر دیتے تھے۔ ڈکیتی کے علاوہ یہ گروہ بردہ فروشی بھی کرتا تھا۔ ان لوگوں کے بھیانک ظلم کا شکار ہو کر کتنی ہی لڑکیوں اور عورتوں نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا تھا اور کتنوں نے اپنے جسموں کی دکانیں سجا لی تھیں۔ جن میں مرنے کی ہمت ہوتی تھی' وہ مر جاتی تھیں اور جو اپنے آپ کو اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں کر پاتی تھیں وہ بار بار مرتی تھیں

اور زندہ رہتی تھیں۔ کتنے ہی بچے تھے جو ان لوگوں کی بدولت اپنے ماں باپ سے بچھڑ کر بھیانک غلامی کا شکار ہو کر جبری مشقت کرتے تھے یا اذیت ناک معذوری کا نشانہ بن کر بھیک مانگتے تھے۔ ان لوگوں نے رنڈیوں کے کتنے ہی کوٹھوں اور اغوا کنندگان کے کتنے ہی ڈیروں کو رونقیں عطا کی تھیں اور ان کا دھندہ آج بھی جاری تھا۔

"او بے وقوف۔" نبی داد خاں نے دل ہی دل میں کہا۔ "رشوت کی پیشکش کر رہا ہے .... کیا دے دے گا؟ چند سو روپے .... اور تجھے نہیں معلوم کہ اس لڑکی سے ہم کتنا فائدہ اٹھائیں گے۔"

"تھانے تو چلنا ہو گا جوان!" نبی داد خاں نے کہا اور سامنے سے آتے ہوئے کانسٹیبل کو آواز دی۔ "باقی باتیں ہم وہیں چل کر کریں گے۔" اور تھوڑی ہی دیر میں رئیس اور حمیداں کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ رئیس کی ساری خوشامد بے اثر ثابت ہوئی تھی۔ "بااصول" پولیس والا رشوت قبول کرنے پر راضی نہیں تھا۔ وہ تو ضابطے کی کارروائی کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رئیس کو مردانہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا اور اسے بتایا گیا کہ مسماۃ حمیداں کو زنانہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا ہے جہاں اس کا بیان لیا جائے گا اور رئیس کا اپنا بیان بھی لیا جائے گا اور پھر کل انہیں ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

تھانے میں ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے حمیداں اور رئیس نے جب ایک دوسرے کو دیکھا تو ان دونوں میں سے کسی کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی کہ وہ ایک دوسرے کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔

رئیس کو لاک اپ میں بند کر دینے کے بعد حمیداں کو زنانہ لاک اپ میں نہیں بند کیا گیا۔ اسے کہیں اور لے جایا گیا اور اسی روز آدھی رات کے بعد تھانے کے لاک اپ سے ایک نوجوان آدمی کی لاش نکالی گئی اور اسے گندے نالے میں بہا دیا گیا جہاں سے وہ کبھی دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس رات کے بعد سے رئیس کو پھر کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ اس سے پہلے' اس کے بارے میں' نیز حمیداں کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا گیا اور رئیس کچھ نہیں چھپا سکا تھا۔

جب وہ دونوں نبی داد خاں کے کمرے میں تھے تو اس کا رویہ ان کے ساتھ بے حد نرم اور شریفانہ تھا۔ اس نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی اور یہی کہا کہ وہ ایک ایماندار اور باضمیر پولیس والے کی طرح صرف قانون کے مطابق کارروائی کرے گا اور اس نے رئیس کو مردانہ لاک اپ میں بند کرنے کے بعد حمیداں سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ "بی بی

تمہیں طبی معائنے کے لئے لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلنا ہو گا۔ یہ قانونی کارروائی کا ایک حصہ ہے۔"

حمیداں کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کبھی بھی دوسروں کے ہاتھ میں اس قدر مجبور اور بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ مصائب تو اس سے پہلے بھی ہمیشہ تقدیر کا حصہ تھے لیکن ساتھ ہی جدوجہد اور مزاحمت کا عمل بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا تھا لیکن اس وقت وہ جن حالات سے دوچار ہو گئی تھی' وہ حد درجہ وحشت ناک تھے۔ ان حالات سے مقابلہ کرنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ وہ ایک شادی شدہ' بچوں والی عورت تھی اور اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ نکلی تھی اور پولیس نے ان دونوں کو پکڑ لیا تھا۔ رسوائی اور تذلیل کے علاوہ اب سزا کا خوف بھی تھا جو اس کو کھائے جا رہا تھا۔ رئیس اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔

"پھر........... اس کے بعد کیا ہو گا صاحب جی؟" اس نے تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے رئیس کے ساتھ ہی رہنے دیتے جی..........."

"نہیں بی بی! یہ ممکن نہیں ہے۔" پولیس والے نے بڑی نرمی اور ملائمت کے ساتھ کہا۔ "مردوں کے لئے حوالات الگ ہوتی ہے' عورتوں کے لئے الگ۔ دونوں کو ایک ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ تم ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤ گی اور تمہیں زنانہ حوالات میں بند کر دیا جائے گا جو مردانہ حوالات کے ساتھ ہی واقع ہے۔ تم زور سے آواز دو گی تو رئیس تمہاری آواز سن لے گا۔ وہ جواب بھی دے سکتا ہے۔"

حمیداں کو ایک انتہائی محفوظ جگہ لے جایا گیا جہاں اس وقت سے لے کر اگلے کئی دن تک برابر اس کا "ڈاکٹری معائنہ" ہوتا رہا۔ "اس ڈاکٹری معائنے" کا آغاز تو خود نبی داد خاں نے کیا تھا لیکن قطار میں اور بھی بہت سے لوگ شامل تھے۔

حمیداں کی فلک شگاف' جگر خراش اور لرزہ خیز چیخوں سے عرش کا کوئی کنگرہ نہیں ہلا' زمین شق ہوئی نہ آسمان ٹوٹ پڑا' نہ کوئی طوفان آیا' نہ دنیا اتھل پتھل ہوئی۔ وحشی بھیڑیئے رات دن اس کے بدن کا گوشت ادھیڑتے رہے اور وہ شدید ترین اذیت کا شکار ہو کر چیختی چلاتی رہی۔ انہوں نے اس کے سارے وجود کو اس طرح ریزہ ریزہ کر دیا کہ پھر وہ مرتے دم تک اسے مجتمع نہیں کر سکی۔

وہ باہر کی ساری دنیا سے کٹی ہوئی' ایک تنگ و تاریک کمرے میں تھی' جہاں اس کا

گوشت کھانے والے اور خون پینے والے گدھ آتے تھے اور اسے بھنبھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ مزاحمت کرتی تھی' چیختی تھی' اپنی چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی اور پھر تھپڑوں' گھونسوں اور لاتوں کی بارش میں نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ بے سدھ ہو جاتی تھی۔ جب مار کھاتے کھاتے اور تشدد سہتے سہتے اس کا جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تو پھر اس نے ہر قسم کی مزاحمت ترک کر دی۔ اب وہ ایک زندہ لاش کی طرح تھی اور لاش کو تو کوئی بھی بھنبھوڑ سکتا ہے۔ بھلا لاش میں کیا رکھا ہے۔

رئیس کہاں تھا' اسے کچھ نہیں معلوم۔ حویلی میں اس کے فرار پر کیا ردعمل ہوا' اسے کچھ نہیں معلوم۔ اس کے شوہر' بچوں اور ساس نے اس کی اپنے آشنا کے ساتھ فرار کی خبر سن کر کیا کہا' اسے کچھ نہیں معلوم۔

اس کے دل سے وقت کا' دنوں کا احساس بھی ختم ہو چکا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آج کون سا دن تھا اور اسے اس کمرے میں آئے ہوئے کتنے دن گزر چکے ہیں۔ یہاں اس مقتل میں' نہ دن تھا' نہ رات تھی' نہ صبح تھی' نہ شام تھی۔ بس ایک رو تھی جو ساری دنیا کی بے غیرتی' بے حیائی اور ذلالت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے گزر رہی تھی .... گزرے جا رہی تھی .... ہر چیز کس قدر گھناؤنی' کس قدر قابل نفرت تھی۔

"ایمان دار" پولیس افسر وہاں روزانہ کم سے کم ایک چکر ضرور لگاتا تھا اور حمیداں نے اس سے ایک بار بھی رئیس کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس کا اب رئیس سے کیا تعلق رہ گیا تھا؟ اس سب کے بعد جو کہ اس کے ساتھ ہو چکا تھا' وہ اب کوئی خواب نہیں دیکھ سکتی تھی اور ویسے بھی اس "ایمان دار" پولیس افسر کے آنے کے بعد حمیداں کے رہے سہے حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے اور وہ کچھ نہیں کہہ پاتی تھی۔

اس نے پہلی بار اس دن رئیس کے بارے میں پوچھا جب اسے یہاں سے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔

وہ رات کا وقت تھا جب اسے اس خفیہ مکان سے نکال کر ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا۔ تین مسلح آدمی اس کے ساتھ تھے۔ ایک گاڑی چلا رہا تھا۔ یہ چاروں آدمی کون تھے' وہ نہیں جانتی تھی۔ شاید اس نے ان کو دیکھا تھا یا نہیں دیکھا تھا۔ اس مکان میں اس کے پاس بہت سارے آدمی آتے رہے تھے اور اس کے لئے وہ سب کے سب بے چہرہ آدمی تھے۔ ان آدمیوں کی کوئی شکل نہیں تھی' ان کا کوئی نام نہیں تھا۔ گاڑی میں بٹھانے سے پہلے انہوں نے اسے زبردستی ایک پیالہ دودھ پلایا جو سخت بدمزہ تھا۔ نہ جانے اس میں کیا

ملا ہوا تھا۔

"رئیس .... رئیس کہاں ہے؟" اس نے ان لوگوں کے حکم پر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی حالت تو بس ایک سحر زدہ معمول کی سی تھی جو عامل کے اشاروں پر ناچنے کا پابند تھا۔

"ارے ہم تجھے رئیس کے پاس ہی تو لے جا رہے ہیں۔" ان میں سے ایک نے ہنس کر کہا۔

"رئیس کے پاس؟" اس نے بے یقینی اور حیرت کے ساتھ کہا۔ "لیکن وہ ہے کہاں' کیا وہ تھانے میں ہے؟"

"ارے تو رئیس کے لئے اتنی بے چین کیوں ہے؟" ان میں سے ایک نے وحشیانہ انداز میں ہنستے ہوئے اسے آنکھ ماری۔ "رئیس کے پاس ایسی کیا چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے؟ ارے ہم رئیس سے کیا کم ہیں؟"

وہ سب کے سب خبیثوں کی طرح ہنسنے لگے لیکن حمیداں ان کی ہنسی سے نہیں ڈری۔ اس نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب ڈر کر کیا کرتی؟ کس سے ڈرتی اور کیوں ڈرتی؟ مکمل طور پر شکست و ریخت کا شکار ہونے کے بعد اس نے اس شکستگی کو قبول کر لیا تھا۔ اب بھلا اس کے پاس ایسی کیا چیز بچی تھی جس کے چھن جانے کا اسے خوف لاحق ہو؟

ان لوگوں نے اسے رئیس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ حمیداں کبھی نہیں جان سکی کہ اس رات حوالات میں رئیس نے زندگی سے موت کی جانب وہ مختصر سا سفر کس طرح طے کیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کے لئے رئیس کی موت کتنی ضروری تھی۔

اور شاید یہ اچھا ہی تھا کہ حمیداں کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس طرح اس کے دل میں ایک موہوم سی امید تو روشن رہی کہ رئیس زندہ ہو گا اور زندگی کے کسی موڑ پر اس سے شاید ملاقات ہو جائے۔ اجنبیوں کی طرح ہی سہی۔

گاڑی چلی اور اس کے ساتھ ہی حمیداں پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ اس کا سبب سمجھ گئی۔ اسے دودھ میں خواب آور دوا کھلا دی گئی تھی اور اب اسے شاید کہیں بہت دور لے جایا جا رہا تھا۔ وہ راستے میں مشکلات بھی تو پیدا کر سکتی تھی۔ اس کا پرسکون رہنا ضروری تھا۔

اور رفتہ رفتہ وہ بالکل پرسکون ہو گئی۔ اس کا دماغ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا ....

ڈوبتا چلا گیا.........

☆======☆======☆

اور پھر جب آہستہ آہستہ اس کا دماغ بیدار ہونا شروع ہوا تو اس کو سب کچھ یاد کرنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا.......... اس منحوس ریلوے اسٹیشن سے لے کر اس مقتل تک کی ایک ایک بات یاد آ گئی جہاں اسے بار بار پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔

وہ ایک کمرے میں' ایک بستر پر پڑی ہوئی تھی اور کمرے کی کھڑکی سے آنے والی دھوپ اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ یہ دن کا وقت تھا۔ کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا لیکن باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بڑا گہرا سناٹا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس مکان میں اس کے علاوہ اور کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور اس نے اپنے اردگرد ایک نظر ڈالی۔ یہ ایک درمیانہ سائز کا کمرہ تھا اور معمولی طریقے سے آراستہ۔ وہ بے چہرہ آدمی اسے نہ جانے کہاں لے آئے تھے' یقیناً کوئی بہت لمبا سفر تھا تبھی تو وہ لوگ اسے گہری نیند سلا کر یہاں لائے تھے۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس چلی گئی جو کمرے میں ایک طرف واقع تھی۔ اس نے اس کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا لیکن یہ کھڑکی کہیں باہر نہیں کھلتی تھی۔ یہ ایک دوسرے کمرے میں کھلتی تھی اور اس کمرے کا منظر حمیداں کی نظروں کے سامنے تھا۔

یہاں زمین پر فرش بچھا ہوا تھا اور دو نوجوان لڑکیاں اس پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی سو رہی تھیں۔ دونوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت گہری نیند ہیں۔

حمیداں تعجب سے انہیں دیکھنے لگی۔ کمرے میں آنے والی دھوپ سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کافی دن چڑھ چکا ہے' بلکہ شاید ایک پہر دن گزر بھی چکا ہے لیکن یہ دونوں لڑکیاں ابھی تک سو رہی تھیں اور وہ بھی اس قدر مدہوشی کے عالم میں' اتنی گہری نیند کہ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ وہ انہی خیالات میں گم تھی کہ اچانک وہ ایک دم سے چونک پڑی اور اس کے سارے جسم میں برف جیسی ٹھنڈک کی ایک لہر دوڑتی چلی گئی۔

اس کی نظر اس کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی ایک شے پر پڑی۔ یہ ایک سارنگی تھی جو کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی اور ہوا سے ایک طرف کا کپڑا سرک گیا تھا اور

سارنگی کا کچھ حصہ نظر آنے لگا تھا۔

حمیداں کو معلوم ہو گیا کہ وہ کہاں آ گئی ہے۔

حمیداں زندگی بھر اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس نے رنڈی کا کوٹھا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوٹھا تو دور کی بات تھی اس نے تو کبھی کسی رنڈی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے گاؤں میں کوئی رنڈی نہیں رہتی تھی۔ تاہم اس نے رنڈیوں اور بھڑووں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور اب اسے یکبارگی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ رنڈی کے کوٹھے پر آ گئی ہے۔

اپنے گھر سے نکل کر ملک عطاء اللہ کی حویلی میں جانے سے لے کر' اس مقتل میں پہنچنے تک جہاں اسے بار بار پھانسی دی جاتی رہی تھی' وہ گوناگوں تجربات کے ہزارہا ہفت خواں طے کر گئی تھی۔ صرف اس کا اپنا لباس ہی پارہ پارہ نہیں ہوا تھا' ساری دنیا بھی تو اس کے سامنے ننگی ہو گئی تھی۔ وہ ان ساری باتوں کو جاننے اور سمجھنے لگی تھی جن کے بارے میں پہلے محض سوچنا بھی گناہ تھا۔ برسہا برس کے تجربے سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ اس نے چند دن میں حاصل کر لیا تھا۔

"اچھا.......... تو یہ ہے آخری انجام.........." اس نے آہستہ سے دل ہی دل میں کہا۔ "وہ لوگ مجھے رنڈی کے کوٹھے پر چھوڑ گئے ہیں۔"

اور نہ جانے کیوں اسے اچانک ایک قسم کا سکون محسوس ہوا۔ شاید اس کے لئے اب سب سے زیادہ محفوظ اور مناسب جگہ یہی تھی۔

صرف چند ماہ کے عرصے میں تقدیر اسے کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ ملک عطاء اللہ نے تو اسے اپنے قرضے کی وصولی کے لئے اپنی حویلی میں ملازمہ کے طور پر رکھا تھا اور اس نے جو وہاں سے چھلانگ ماری تو سیدھے کوٹھے پر آ کر دم لیا.......... دھت تیری تقدیر کی!

وہ ایک دم اپنے خیالات سے چونک پڑی کیونکہ اس نے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ریشمی ساڑھی میں ملبوس ایک کافی سن رسیدہ' سانولی رنگت لیکن تیکھے نقوش والی ایک عورت اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

حمیداں نے ساڑھی سب سے پہلے ملک عطاء اللہ کی حویلی میں دیکھی تھی۔ بڑی ملکانی تو کبھی ساڑھی نہیں پہنتی تھی لیکن چھوٹی ملکانی کو اس نے اکثر ساڑھی پہنے دیکھا تھا اور وہ اس عجیب و غریب لباس کو بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔ اس کے گاؤں میں

تو کوئی عورت ساڑھی نہیں پہنتی تھی اور جب پہلی بار اس نے چھوٹی ملکانی کو ساڑھی باندھتے دیکھا تھا تو وہ بڑے غور سے اس لمبی چوڑی بھاری بھرکم ریشمی چادر کو دیکھتی رہی تھی۔

اور اب یہ بڈھی عورت اسے ساڑھی میں نظر آ رہی تھی۔ ساڑھی تو بڑے لوگوں کا لباس تھا۔ یہ بات حمیداں جانتی تھی۔ تو کیا کنجریوں کا شمار بھی "بڑے لوگوں" میں ہوتا تھا؟

وہ عورت دروازہ کھول کر اندر آ گئی اور حمیداں کی طرف دیکھ کر بڑی نرمی اور دل آویزی کے ساتھ مسکرائی۔

حمیداں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ قدرے بھاری بدن کی خوش ادا عورت تھی اور اس نے ساڑھی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ باندھا ہوا تھا جس کے باعث اس کی شخصیت کچھ اور زیادہ دلکش معلوم ہوتی تھی۔

"کیا حشر کیا ہے تمہارا ان حرامی کے پلوں نے۔" اس نے اچانک بولنا شروع کر دیا۔ "سارے بدن پر نیل ڈال دیئے ہیں سؤر کے بچوں نے‘ میں نے تو ان کو بہت گالیاں دیں۔ میں نے ان سے کہا گدھے کے بچو‘ ذرا انسان بنو.......... تمہاری تو.........."

حمیداں حیرت سے اس عورت کی طرف دیکھ رہی تھی جو بڑی روانی اور صفائی کے ساتھ فحش گالیاں بک رہی تھی جو اس کی زبان‘ اس کے لباس اور اس کی شخصیت کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

"آپ کون ہیں؟" حمیداں نے اس عورت سے پوچھا۔ "اور مجھے یہاں کون لایا ہے؟"

"تمہیں یہاں وہی لائے ہیں کنجر کی اولاد جو اپنی ماؤں اور بہنوں کو کوٹھوں پر نچاتے ہیں۔" عورت نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اور میں.......... میں وہ ہوں جو تم جیسی لڑکیوں کو نہر میں ڈوب جانے سے‘ کنویں میں چھلانگ لگانے سے اور ریل کی پٹڑی پر لیٹ جانے سے بچاتی ہوں۔ میں نے تم کو ان لوگوں سے خریدا ہے اور اب یہی تمہارا گھر ہے۔"

"لیکن میں.......... میں یہاں.......... یہ تو.......... کوٹھا ہے۔"

"ہاں‘ یہ کوٹھا ہے۔" عورت نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "چلو نہ رہو یہاں۔ اب یہ بتاؤ کہ کہاں جاؤ گی؟ اپنے گھر والوں کے پاس‘ ہے ہمت اتنی ان کے پاس جانے کی؟ اپنے عاشق کے پاس‘ کیا وہ اب تمہیں منہ لگائے گا؟ تم تو اب اس کے لئے ایک جوٹھا برتن ہو حمیداں! اور کوئی مرد جوٹھے برتن میں کھانا کھانا پسند نہیں کرتا۔ تم کہاں جاؤ گی

حمیداں؟"

حمیداں اسے تعجب کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اس عورت کو تو اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا۔ شاید انہی لوگوں نے بتایا ہو گا۔ مگر انہیں کس نے بتایا؟ خود اس کا تو کسی نے بیان ہی نہیں لیا تھا۔ اس نے تو اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہاں‘ رئیس نے بتایا ہو گا۔ رئیس کا بیان لیا گیا ہو گا اور اس نے سب کچھ قبول دیا ہو گا.......... خیر‘ یوں ہی سہی.......... مگر وہ تھا کہاں؟

عورت کا نام نیلم تھا۔ "مجھے یہاں سب لڑکیاں نیلم آپا کہتی ہیں۔ تم بھی مجھے نیلم آپا کہہ سکتی ہو۔"

اچانک حمیداں نے اپنا سر نیلم کے کندھے پر رکھ دیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اسے اس آشوب کے بعد پہلی بار ایک ایسا کندھا ملا تھا جس پر سر رکھ کر وہ رو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ روئی اور خوب روئی۔ اس قدر روئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اس پر نیم بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ وہ اس طرح رو رہی تھی گویا آج اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں خود اپنے آپ کو ڈبو کر فنا کر دے گی۔

"بس‘ بس کر حمیداں بس کر۔" نیلم نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بس بہت ہو چکا۔ ان ساری پرانی باتوں کو بھول جا اور ایک بات اچھی طرح جان لے.......... تیری پرانی دنیا میں اب تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تجھے اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑنا ہو گا۔ تجھے ایک نئی زندگی شروع کرنی ہو گی۔"

حمیداں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ محض بلک بلک کر روتی رہی۔

"دیکھ بیٹی! میری بات سن۔" نیلم نے اس سے کہا۔ "مردوں کی بنائی ہوئی اس دنیا میں ایک ٹھکرائی ہوئی‘ بے آسرا‘ بے آبرو عورت کا آخری ٹھکانہ بس یہی کوٹھا ہی ہوتا ہے اور یہاں آنے کے بعد عورت خود بے آبرو نہیں ہوتی۔ وہ ساری دنیا کو بے آبرو کرتی ہے۔ وہ اپنے چہرے کی کالک کو ساری دنیا کے چہرے پر مل دیتی ہے.........."

نیلم اور بھی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن حمیداں اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔ وہ تو صرف آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہ سب کیسا ہو گا؟ کیونکر ہو گا؟ وہ یہ کیسے کر سکے گی؟

اسی وقت وہ دونوں لڑکیاں بھی اس کمرے میں آ گئیں جنہیں حمیداں نے دوسرے کمرے میں سوتا دیکھا تھا۔ اب وہ دونوں جاگ گئی تھیں اور شاید باتوں کی آواز سن کر ادھر

آ گئی تھیں۔

"ان سے ملو۔" نیلم نے دونوں لڑکیوں کی طرف باری باری اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تاجی ہے اور وہ زمرد.......... ان کے علاوہ اور بھی لڑکیاں ہیں جن سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ اچھا لڑکیو! حمیداں کو غسل خانے لے جاؤ۔ اسے نہانے دھونے اور کپڑے بدلنے کی سخت ضرورت ہے۔"

"حمیداں .... یہ تو بہت فضول سا نام ہے آپا!" تاجی نے کہا۔ "بالکل دیہاتی' گنواروں جیسا نام۔ اس نام کو بدل دیجئے آپا! اس قدر خوبصورت اور حسین لڑکی اور نام حمیداں .... بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

"ہاں' یہ تو ٹھیک۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اتنی خوبصورت شخصیت پر اتنا بدصورت نام واقعی اچھا نہیں لگتا۔ اچھا چلو تم ہی اس کے لئے کوئی خوبصورت سا نام تجویز کرو۔"

"نغمہ۔" تاجی نے فوراً ایک لمحے کے توقف کے بغیر کہا۔ گویا وہ یہ نام پہلے سے سوچے بیٹھی ہو۔

"نغمہ۔" نیلم نے آہستہ سے یہ نام دہرایا۔ "ہاں' یہ اچھا اور خوبصورت نام ہے۔ تو پھر یہ طے ہو گیا' اسے حمیداں کوئی نہیں کہے گا۔ سب اسے نغمہ کہیں گے۔"

"نئی زندگی کا آغاز نئے نام کے ساتھ۔" تاجی نے اپنے جسم کو ایک پھیرا دیتے ہوئے' لہرا کر' بڑی ادا کے ساتھ کہا۔ "مس نغمہ .... ہماری نئی دریافت .... نیا چہرہ.........."

اور وہ سب کی سب ہنسنے لگیں لیکن حمیداں کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہیں آ سکی۔ کیا کوئی شخص اپنی موت پر بھی ہنس سکتا ہے؟

حمیداں نے غسل خانے میں جا کر کپڑے اتارے اور پہلی بار اپنے بے لباس جسم کو غور اور توجہ کے ساتھ دیکھا اور خوف و دہشت کے عالم میں اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سارا جسم کس قدر داغ دار ہو رہا تھا۔

اس کے منع کرنے کے باوجود تاجی نے زبردستی اس کا میک اپ شروع کر دیا۔ نیلم نے اسے ایک بہت خوبصورت شلوار قمیض پہننے کو دیا تھا جو اس کے ناپ کا تھا اور اور تاجی نے جب اس کا خوب میک اپ کر دیا اور حمیداں نے اپنے آپ کو قد آدم آئینے میں دیکھا تو وہ خود کو بالکل نہ پہچان سکی۔ یہ وہ نہیں تھی' یہ تو کوئی اور لڑکی تھی۔ وہ اس قدر

خوبصورت' اس قدر حسین تو نہیں ہو سکتی تھی۔ میک اپ نے تو اسے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔

نیلم نے اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ کافی دنوں کے بعد ایک اس قدر غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکی ہاتھ آ گئی تھی۔ "دھوم مچا دے گی کوٹھے کی۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "ایسا شاندار دانہ تو اس پورے بازار میں کسی کوٹھے پر نہیں ہو گا۔ مگر ذرا سنبھالنا پڑے گا۔ دھیرے دھیرے' آرام سے راہ پر لگانا ہو گا۔"

اور نیلم کو یقین تھا کہ وہ اسے راہ پر لے آئے گی اور وہ پوری کی پوری قیمت بہت جلد واپس وصول کر لے گی جو اس نے اس کے عوض بردہ فروشوں کو ادا کی تھی۔ کم بختوں نے کافی رقم اینٹھ لی تھی لیکن پھر بھی' سودا برا نہیں تھا۔

"عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔" نیلم بڑی کڑی تنقیدی نظروں سے حمیداں عرف نغمہ کو نئے سرے سے دیکھ رہی تھی۔ "کم از کم بارہ پندرہ سال تو بڑے آرام سے کھینچے گی اور اگر اپنے آپ کو ذرا ٹھیک ٹھاک رکھے تو اس کے بعد بھی کئی سال تک چل سکتی ہے.........."

مگر مشکل تو یہی ہے کہ دھندے میں عورت کی جوانی کی عمر بڑی مختصر ہوتی ہے.........."

حمیداں کو اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کون سے شہر کے کس علاقے میں ہے اور اسے بتایا گیا کہ وہ لاہور میں ہیرا منڈی کے علاقے میں ہے۔

لاہور .... حمیداں نے اس شہر کا نام بارہا سنا تھا اور اس کے بارے میں رئیس کی زبانی اتنی باتیں سنی تھیں کہ یہ شہر اس کے خوابوں میں بس گیا تھا۔ رئیس نے اس شہر میں کافی عرصہ گزارا تھا اور وہ جب یہاں کی شان و شوکت اور خوبصورتی کے قصے سناتا تو حمیداں کو یہ ساری باتیں کسی دوسری دنیا کی معلوم ہوتیں۔ رئیس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ شادی کے بعد وہ اسے لاہور ضرور لے جائے گا اور وہ کچھ دن اس شہر میں رہیں گے۔ پھاتا کے دل میں لاہور کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔

اور اب وہ لاہور آ گئی تھی۔ لاہور کو دیکھنے کی اس کی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ مگر کس طرح؟ اس وقت' جبکہ اس کی ہر آرزو قتل ہو چکی تھی۔

اس شام حمیداں عرف نغمہ نے پہلی بار اس بازار کی رونق دیکھی جہاں عورتوں کا گوشت فروخت کیا جاتا ہے۔

شام ہوتے ہی جیسے ساری دنیا کی رونقیں اس بازار کے گلی کوچوں میں اتر آئی تھیں۔ ہر طرف سے طبلے' سارنگی اور گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ساری فضا میں موسیقی کا رس گھلا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے اردو اور پنجابی کے گانوں کی آوازیں بلند ہو

رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ صرف رقص' موسیقی اور نغمے کی دنیا ہے۔

نیلم نے حمیداں عرف نغمہ کو ایک ایسی کھڑکی میں پردے کے پیچھے کھڑا کر دیا تھا جہاں سے وہ گلی کا منظر دیکھ سکے اور فوراً اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ وہ نغمہ کو چند دن آرام کرنے کا اور اس سارے ماحول سے روشناس ہونے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ علاوہ ازیں اس پر ذرا نظریں رکھنی تھیں۔ کافی رقم دے کر اسے خریدا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اِدھر اُدھر نکل جائے اور مصیبت کا باعث بنے۔

اور جب بیرونی کمرے میں مجرا ہو رہا تھا تو حمیداں اندرونی کمرے کی چلمن سے لگی بیٹھی تھی اور بڑی حیرت اور اشتیاق کے ساتھ لڑکیوں کو ناچتے اور گاتے دیکھ رہی تھی۔ یہ منظر اس کے لئے اس قدر نیا اور انوکھا تھا کہ وہ اس کے سحر میں گم ہو کر رہ گئی۔

کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا جس پر جا بجا گاؤ تکئے رکھے ہوئے تھے۔

وہاں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور تاجی اور زمرد' زرق برق لباسوں میں ملبوس سولہ سنگھار کئے ہوئے' حور پری بنی ہوئی' ان کے سامنے رقص کر رہی تھیں اور گا رہی تھیں۔ ایک طرف سازندوں کی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی۔ طبلے ٹھنک رہے تھے' سارنگی کے سُر گونج رہے تھے اور گانے والیوں کی آوازیں ان کے پیروں کے گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ مل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں اور کمرہ رنگ و نور و آہنگ سے بھرا ہوا تھا۔

حمیداں کو یہ سب کچھ کسی بہت ہی خوبصورت اور رنگین تصویر کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ وہ کوئی زندہ منظر دیکھ رہی ہے۔ یہ سب کچھ تو صرف ایک تصویر تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ لوگوں نے اپنی جیبوں میں سے نوٹ نکال نکال کر ناچتی ہوئی لڑکیوں کی طرف اچھالنا شروع کر دیئے۔ نیلم بھی وہاں کمرے میں موجود تھی اور اس وقت اس کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دن والی نیلم اور رات والی نیلم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت تو اس نے اپنی عمر کے دس سال کم کر لئے تھے۔

نوٹ سنبھالنے کا کام نیلم کا تھا۔ تماش بین جو نوٹ اچھالتے تھے وہ نیلم فوراً اپنے قبضے میں کر لیتی تھی اور ساتھ ہی جھک جھک کر آداب بھی کرتی جاتی تھی۔

لیکن بہت سے تماش بین ایسے بھی تھے جو یہ چاہتے تھے کہ لڑکیاں ان ہی کے ہاتھ سے نوٹ لیں۔ وہ نوٹ کو انگلیوں میں دبا کر کسی لڑکی کو اشارہ کرتے تھے اور وہ رقص کے پھیرے لگاتی ہوئی وہاں تک آتی تھی اور اس شخص کے ہاتھ سے نوٹ اچک لیتی تھی لیکن وہ نوٹ بالآخر نیلم کے پاس ہی جاتا تھا۔

حمیداں اس پوری فضا سے مسحور ہو کر رہ گئی تھی اور ایک نشے کا سا عالم تھا جس میں حمیداں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔

وہ اپنے اس سحر سے اس وقت چونکی جب تاجی اور زمرد رقص کا آخری پھیرا لے کر تماش بینوں کے آگے رکوع کی حالت میں جھک کر اور دایاں ہاتھ اٹھا کر انہیں آداب کرتی ہوئی ہٹنے لگیں۔ موسیقی تھم گئی تھی اور فضا میں اب اگر کوئی آواز تھی تو ان دونوں کے گھنگھروؤں کی وہ بہت ہلکی سی آواز جو پیروں کے زمین پر آہستگی کے ساتھ پڑنے کے باعث پیدا ہو رہی تھی۔

زمرد اور تاجی واپس اس کمرے میں آ گئیں جہاں حمیداں پردے کے پاس بیٹھی ہوئی دوسرے کمرے کے سارے مناظر دیکھتی رہی تھی۔ تماش بین اب بھی بیٹھے ہوئے تھے' وہ گئے نہیں تھے۔

دوسرے کمرے سے دو اور لڑکیاں نکل کر آئیں۔ وہ بھی تاجی اور زمرد کی طرح خوب بنی ٹھنی تھیں اور رقص و موسیقی کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ ایک بار پھر سب کچھ اسی طرح شروع ہو گیا اور نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔

یہ مرد کا ایک اور نیا روپ تھا جو حمیداں نے کوٹھے پر دیکھا۔ کوٹھے پر آیا ہوا مرد تو عجز و نیاز کا پیکر' انکسار و اخلاق اور مروت و نرم گفتاری کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ تو وہ مرد تھا جو عورت کے آگے بچھا بچھا جاتا تھا۔ اس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر اپنے آپ کو قربان کئے ڈال رہا تھا۔ یہ کیسے مرد تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ حمیداں نے تو ان مردوں کو دیکھا تھا جو گِدھوں کی طرح اس کا گوشت نوچتے رہے تھے۔ یہ تو کتوں کی طرح دم ہلانے والے مرد تھے۔

اگلے ہی دن سے حمیداں کی تربیت کا دور شروع ہو گیا۔ نیلم نے اسے ایک عمر رسیدہ استاد کے حوالے کر دیا جس نے اسے گانے بجانے کی تعلیم دینی شروع کر دی اور حمیداں یہ سب سیکھنے لگی۔ کچھ بھی تو مشکل نہیں تھا۔

اور پھر وہ بڑی تیزی کے ساتھ بدلنے لگی' اتنی تیزی کے ساتھ کہ اسے خود اپنے اوپر حیرت ہوتی تھی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتی تھی کہ اس نے کس قدر آسانی کے ساتھ اس نئے طرز زندگی کو اپنا لیا تھا اور وہ اس فضا کا' اس ماحول کا ایک حصہ بن گئی تھی اور اس نے اپنے زخم خوردہ وجود کو اس کے اندر مکمل طور پر ضم کر دیا تھا۔ وہ اب حمیداں نہیں رہی تھی' وہ اب نغمہ تھی۔

ہر روز شام کو جب نیلم کے کوٹھے پر وہ تماش بینوں کے سامنے شاخ گل کی طرح لچکتی، مہکتی نمودار ہوتی اور رقص کے پھیرے شروع ہوتے تو دیکھنے والے مسحور و مدہوش ہو کر کسی دوسری دنیا میں پہنچ جاتے۔ نوٹوں کی ایسی زبردست بارش ہونے لگتی کہ اس سے پہلے نیلم کے کوٹھے پر کبھی اتنے نوٹ نہیں برسے تھے۔ نیلم دونوں ہاتھوں سے نوٹ بٹورتی اور نغمہ کی جوانی کی درازی کی دعائیں مانگتی۔

جسم فروشی حمیداں کا پیشہ بن گیا اور اب وہ بلا خوف و خطر، تحفظ کے پورے احساس کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ نہ کسی سے چھپ چھپ کے ملنے کی ضرورت تھی نہ کسی چیز کے چھن جانے کا خوف تھا۔ کچھ نہیں تھا۔ وہ ہر خطرے، ہر خوف سے بے نیاز تھی۔

یہ بڑی عجیب و غریب دنیا تھی جہاں وہ آ گئی تھی اور یہاں اس نے انسانی رشتوں کی بہت مختلف شکلیں بھی دیکھیں۔ یہاں آ کر اسے اندازہ ہوا کہ کوٹھے کو عورت کی زندگی میں کتنا اہم مقام حاصل ہے اور کوٹھا اس جیسی عورتوں کے لئے، ان عورتوں کے لئے جن پر ہر گھر کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور جنہیں سماج کے کوڑا گھر میں پھینک دیا جاتا ہے، کس قدر مضبوط اور کس قدر قابل اعتماد پناہ گاہ ہے۔ ایک بار یہاں آ جانے کے بعد عورت ہر خطرے سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ یہ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے جس کے چھن جانے کا اسے کوئی خدشہ نہیں ہوتا۔ یہاں اس کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں اور پانے کے بہت کچھ ہوتا ہے۔

یہاں اسے تاجی ملی، جس کی ماں کی، زمیندار کی حویلی میں زمیندار کے کارندوں کے ایک پورے گروہ نے ساری رات عصمت دری کی تھی کیونکہ تاجی کے باپ نے زمیندار کی بیگار کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اگلے دن تاجی کی ماں نے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس سے اگلے دن تاجی کے باپ نے زمیندار پر حملہ کر دیا اور لاٹھیاں مار مار کر اس کو ہلاک کر دیا اور خود ہمیشہ کے لئے جیل چلا گیا۔ زمیندار کے گھر والوں نے تاجی اور اس کی بوڑھی نانی کو گاؤں سے نکال دیا اور ان کا سب کچھ چھین لیا۔ دونوں شہر جا کر بھیک مانگنے لگیں۔ پھر کئی سال کے بعد نانی مر گئی اور تاجی کئی مردوں کے ہاتھوں سے گزرتی ہوئی یہاں تک آ گئی۔

یہاں اسے زمرد ملی، جس کا نکھٹو باپ کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا اور نشہ کر کے سارا دن گھر پڑا رہتا تھا۔ زمرد کی ماں محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھی اور پھر ایک

دن وہ زمرد کو ساتھ لے کر اپنے شوہر کے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی اور اس نے ایک کوٹھی میں نوکری کر لی۔ کوٹھی میں صاحب کے نوجوان بیٹے نے اسے چین نہ لینے دیا اور وہ ایک کوٹھی سے دوسری کوٹھی میں بھاگتی رہی اور ایک دن ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو کر مر گئی۔ زمرد کو کسی نے یتیم خانے پہنچا دیا لیکن وہاں کی ہر وقت کی مار، ڈانٹ پھٹکار اور آدھے پیٹ کھانے سے گھبرا کر وہ چپکے سے وہاں سے فرار ہو گئی۔ اس کی عمر اس وقت کوئی سات آٹھ سال کی تھی کہ کسی نے اس کو نیلم کے کوٹھے پر پہنچا دیا اور تب سے وہ یہیں تھی۔

یہاں، حمیداں عرف نغمہ کو شمیم ملی، جسے ایک لڑکا محبت اور شادی کا جھانسہ دے کر اس کے گاؤں سے بھگا کر لایا تھا۔ شمیم ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی اور اپنے گھر سے بہت سارے زیورات اور نقدی لے کر آئی تھی۔ وہ لڑکا اس کا سب کچھ لے کر اور اسے ایک معمولی درجے کے ہوٹل میں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ شمیم کو جب ہوش آیا تو وہ پوری طرح لٹ چکی تھی۔ برباد ہو چکی تھی۔ ہوٹل کے مالک نے ہوٹل کے بل کی وصولی اس کے جسم سے کی اور پھر شمیم یہاں آ گئی کیونکہ اب وہ اپنے گھر واپس نہیں جا سکتی تھی۔

یہاں اسے شادو ملی جس کے ماں باپ نے اس کی شادی ایک ایسے آدمی سے کر دی تھی جو عمر میں اس سے چار گنا بڑا تھا۔ شادو پندرہ سال کی تھی اور اس کے میاں کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ شادو کے والدین اس شخص کے مقروض تھے اور ان کے پاس قرض کی واپسی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس مالدار بوڑھے کے مطالبے پر انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی اور بوڑھے نے قرضہ معاف کر دیا۔

لیکن شادو زیادہ عرصے تک بوڑھے شوہر کے ساتھ نباہ نہیں کر سکی۔ وہ اس کے نوجوان ملازم کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی اور وہ شخص اسے ساتھ لئے ہوئے اپنے گھر، علاقہ غیر چلا گیا۔ وہاں کچھ عرصے کے بعد کسی دشمن نے اسے قتل کر دیا اور شادو کو اغوا کر لیا۔ کافی عرصے تک شادو ان لوگوں کی قید میں رہی پھر ایک دن موقع پا کر ایک ٹرک ڈرائیور کے ساتھ وہاں سے نکل بھاگی۔ لاہور سے کچھ فاصلے پر ٹرک پر چھاپہ پڑا اور پولیس نے اسے گھیر لیا۔ شاید اس میں کوئی غیر قانونی مال تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے شادو کو نکل جانے کا موقع دیا اور شادو وہاں سے بھی بھاگی اور پھر اس کی آخری منزل یہ کوٹھا تھا۔

"اور اب مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔" شادو نے مسکراتے ہوئے حمیداں عرف نغمہ سے کہا تھا۔ "ہاں میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں اطمینان سے بیٹھی ہوں۔ دھندہ کرتی ہوں اور روٹی کھاتی ہوں۔ کسی سوّر کے بچے کا احسان نہیں ہے میرے کندھوں پر۔ ساری دنیا کو جوتی کی نوک پر مارتی ہوں۔ نہ کوئی سالا بوڑھا شوہر' نہ ماں باپ کی گردن پر اس کے قرضے کا بوجھ .... نہ کسی کے ساتھ بھاگنا' نہ اس کے دشمنوں کے ہاتھوں اغوا ہونا۔ ارے ہم تو بازار کا مال ہیں نغمہ .... ہمیں کوئی اغوا کر کے کیا کرے گا؟ جو کچھ اسے چاہئے ہے وہ ویسے ہی ہم سے لے لے۔ ہم کون سی عفت مآب بیبیاں ہیں جنہیں اپنی عصمتوں کے لٹ جانے کا ڈر ہو گا؟ ہم تو خود اپنے آپ کو سر بازار لٹاتے ہیں میری جان .... مگر مفت نہیں .... خریدار دیکھ کر .... اور وہ بھی خوب بھاری جیب والا خریدار دیکھ کر .... اور جس کی جیب میں ٹکے نہیں اس سالے کی پیٹھ پر ایک لات.........." شادو نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ساری دنیا کے مردوں کی ماؤں اور بہنوں کو بڑی غلیظ گالیاں دیں۔

حمیداں نے یہ محسوس کیا کہ کوٹھوں پر کچھ لڑکیاں ایسی تھیں جو کوٹھوں ہی کی پیداوار تھیں۔ کچھ لڑکیاں وہ تھیں جو عام گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن کسی نہ کسی روح فرسا اور دردناک سانحے کے نتیجے میں یہاں تک آن پہنچی تھیں۔ ایسی لڑکیوں میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی الگ داستان تھی۔ ہر ایک کا اپنا المیہ تھا اور ان گوناگوں المیوں میں بہت سے عناصر مشترک تھے۔

اور پھر.......... وہ لڑکیاں بھی تھیں جو کوٹھے والیوں کی اولادیں تھیں لیکن ان کی ماؤں نے انہیں اس جگہ سے دور رکھا تھا۔ یہاں بہت سی مائیں ایسی تھیں جن کی بیٹیاں اس بازار سے دور' پڑھ رہی تھیں' ہوسٹلوں میں رہ رہی تھیں یا پڑھ لکھ کر کسی کام میں مصروف تھیں۔

رنڈیوں کے کوٹھوں پر رہنے والے جو مرد تھے وہ زیادہ تر انہی رنڈیوں کی اولاد اور ان کے رشتے دار تھے۔ یہ مردوں کی ایک عجیب و غریب قسم تھی جو حمیداں نے یہاں دیکھی۔ یہ عورتوں کی غلامی کرنے والے اور عورتوں کی کمائی کھانے والے مرد تھے۔ یہ گاہکوں کی راہ میں دیدہ و دل فرش کرنے والے' بصد عجز و انکسار اپنی عورتوں کے گوشت کے خوان ان کی خدمت میں پیش کرنے والے لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو گالی سن کر بھی ہنس دیتے تھے' کیونکہ ان کا اپنا وجود خود ایک گالی تھا اور وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے چہروں پر بے غیرتی اور دردناک بے حسی کے سائے منڈلایا کرتے تھے۔ خود اپنی سگی ماؤں اور بہنوں کے جسموں کے سودے کرنے والے لوگ تھے۔ یہ لوگ حمیداں کو ایک دوسری دنیا کی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔

یہاں ایسے مردوں اور عورتوں کی ایک کھیپ کی کھیپ موجود تھی جن کی شناخت صرف ان کی ماں سے ہوتی تھی۔ یہ ماؤں اور نانیوں کی دنیا کے لوگ تھے۔ ان کی زندگیوں میں ماں تھی اور نانی تھی اور کوئی باپ نہیں تھا' کوئی دادا نہیں تھا' کوئی دادی نہیں تھی۔ اولاد کو صرف اور صرف اس کی ماں کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔

کوٹھے والیاں اپنے آپ کو حاملہ ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں لیکن پھر بھی گڑبڑ ہو ہی جاتی تھی۔ مگر اب تو یہ معاملہ اتنا زیادہ پریشان کُن نہیں تھا۔

"کوئی زمانہ تھا کہ بڑے جتن کرنے پڑتے تھے بیٹی!" نیلم حمیداں کو اونچ نیچ سمجھا رہی تھی کہ یہ بھی اس کی تربیت کا ایک حصہ تھا۔ "ہوشیار دائیاں ہی یہ کام کر سکتی تھیں کہ عورت کو اس عذاب سے نجات دلوا دیں اور وہ بھی بعض اوقات ناکام ہو جاتی تھیں اور کتنی عورتیں تو اس چکر میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی تھیں .... مگر وہ سب گئی گزری باتیں ہیں۔ اب تو کوئی مشکل نہیں ہے .... ڈاکٹرنیاں موجود ہیں۔ فٹافٹ کام کر دیتی ہیں۔ پیسے تو ضرور کافی لیتی ہیں لیکن پیسے لے کر کام بھی پکا کر دیتی ہیں۔"

حمیداں' اب نیلم کے لئے ایک نوٹ چھاپنے والی مشین بن چکی تھی اور نیلم کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ مشین کو بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں رکھے اور اس کے اندر کوئی خرابی نہ پیدا ہونے دے۔ مشین کو رکنا نہیں چاہئے تھا۔ چلتے رہنا چاہئے تھا' چلتے رہنا چاہئے تھا۔

حمیداں عرف نغمہ کی زندگی میں ہر رات کو ایک نیا مرد آتا تھا اور صبح کو جب وہ رخصت ہوتا تھا تو وہ اس کی شکل تک بھول جاتی تھی۔ اس کی شخصیت' انفرادیت' اس کا وجود' اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ مرد اس کے نزدیک ایک گاہک تھا۔ صرف ایک گاہک .... خریدار' اور وہ دُکاندار تھی .... اور دُکاندار صرف گاہک کی جیب اور اس کی قوت خرید کو دیکھتا تھا۔

اسی عالم میں کوئی دو سال کا عرصہ گزر گیا.......... حمیداں نے کمائی کر کر کے ڈھیر لگا دیئے۔

اور پھر ایک دن اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے .... اور اس کے

ساتھ ہی اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ اس کے لئے ایک انتہائی سنسنی خیز اور تجسّس آمیز انکشاف تھا۔ اس کے ہونے والے بچے کا باپ کون تھا؟ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی نہ جان سکتی تھی اور نہ جاننا چاہتی تھی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ وہ ماں بننے والی تھی۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ فوراً نیلم کو اس کی اطلاع دیتی اور نیلم اسے ساتھ لے کر کسی بھی لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی جاتی۔ پچھلے دنوں تاجی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور نیلم اسے لیڈی ڈاکٹر شہناز بیگم کے پاس لے گئی تھی۔ چند گھنٹے کے بعد دونوں واپس آ گئی تھیں اور تاجی "ہلکی پھلکی" ہو چکی تھی۔ البتہ گھر آ کر نیلم نے لیڈی ڈاکٹر کو بڑی گالیاں دی تھیں کیونکہ اس نے یہ کہہ کر زیادہ رقم کا مطالبہ کیا تھا کہ خاصے دن ہو گئے ہیں اور کیس پیچیدہ ہو گیا ہے۔

اگر حمیداں نیلم کو بتا دیتی تو ایک ہی دن میں اس کو بھی اس وبال سے نجات مل جاتی لیکن نہ جانے کیوں وہ ایسا کرنے میں پس و پیش کر رہی تھی۔ اس کے اندر سے، اس کے وجود کی گہرائیوں میں سے کوئی آواز بلند ہو رہی تھی۔ کوئی چپکے چپکے اشارے کر رہا تھا .... مجھے آنے دو............ مجھے آنے دو............ میں تمہارا ہی تو روپ ہوں۔ مجھے قتل مت کرو............ مجھے آنے دو۔

رنڈیوں کی بہت سی اولادوں کا حشر حمیداں کی نظروں کے سامنے تھا۔ اگر لڑکی ہو گی تو رنڈی اور لڑکا ہوا تو بھڑوا............ اکثریت کی قسمت تو یہی تھی البتہ بعض خوش قسمت ایسے بھی تھے جو زندگی کی شاہراہ پر کسی اور طرف نکل جاتے تھے۔

"نہیں نہیں۔" اس نے خوفزدہ ہو کر اپنے آپ سے کہا۔ "ایسا نہیں ہو گا............ ایسا نہیں ہونا چاہئے............ یہ .... یہ اس کے ساتھ ظلم ہو گا............" لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو اس کے لئے تیار نہیں کر سکی کہ نیلم کو سب کچھ بتا کر اس "وبال" سے نجات حاصل کر لیتی۔ وہ جذباتی کشمکش کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑی تھی جہاں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ پہلے سے دو بچوں کی ماں تھی، جن کا باپ اس کا شوہر احمدا تھا، جس کے بارے میں اب اسے کچھ نہیں معلوم تھا، نہ اس کے بارے میں، نہ بچوں کے بارے میں .... تب سے اب تک کتنی ہی راتیں ایسی گزری تھیں جب اس نے اپنی ویران آنکھوں سے ماضی کو کھنگالنے کی کوشش کی تھی اور اس گہری دھند میں اپنے شناسا چہروں کو تلاش کرنا چاہا

تھا............ احمدے کا چہرہ............ بوڑھی خرانٹ ساس کا چہرہ............ دونوں بچوں کے چہرے............ اور پھر............ پھر رئیس کا چہرہ............ لیکن دھند اس قدر گہری اور دبیز تھی کہ ٹھیک سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سارے مناظر دھندلا گئے تھے۔ سب کچھ غائب ہو چکا تھا۔ وہ گاؤں............ سکندر پور............ اس کی مانوس فضائیں، غربتوں کے عذاب، محرومیوں کے روگ، ناامیدیوں کے آزار............ اور پھر............ سادھن گاؤں............ ملک عطاء اللہ کی حویلی............ رئیس رئیس............ رئیس............ اس کے دل کی ایک ایک دھڑکن سے ایک یہی آواز بلند ہونے لگتی اور اب تو یہ سب کچھ محض ایک بھولا بسرا خواب تھا............ ایسا خواب جو کبھی کبھی خود ماضی کے جھروکوں میں سے نکل کر بڑی گہری اداسی کے ساتھ جھانکنے لگتا تھا۔

اسے اپنے دونوں بچوں کے بارے میں تو کچھ نہیں معلوم تھا اور اب وہ ایک تیسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس نازائیدہ وجود کے ساتھ اس کی وابستگی، اس جان لیوا تنہائی کا ایک فطری ردعمل تھا جس سے وہ دوچار تھی۔ اس کے چاروں طرف رات دن، صبح و شام، ایک ہنستی کھیلتی، گاتی گنگناتی شاد آباد دنیا تھی لیکن اس بھری پُری دنیا میں وہ بالکل اکیلی تھی، مکمل طور پر اکیلی اور جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے ویسے ویسے اپنی تنہائی کا احساس اور زیادہ بڑھتا جاتا تھا۔ "اور ایک وقت وہ آئے گا جب لوگ میری صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے............ تب کیا ہو گا؟"

دن گزرتے رہے اور وہ اپنی جذباتی کشمکش کا شکار ہو کر کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ کافی دن گزر گئے اور پھر ایک روز نیلم کی دوررس اور تجربہ کار نگاہوں نے خود ہی معاملے کو تاڑ لیا۔

نیلم نے جب اس سے پوچھا تو اس نے انکار نہیں کیا اور اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اس کو بہت پہلے سے معلوم تھا لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس پر نیلم نے اس کو بہت اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی لیکن نیلم کی باتوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو حمیداں کو پہلے سے خود نہ معلوم ہو اور جس کا اسے احساس نہ ہو۔ وہ سب کچھ جانتی تھی لیکن وہ اپنی اندرونی مزاحمت کے بہت قوی جذبے پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ آنے والے کو نہیں روکے گی اور اس نے حتمی طور پر نیلم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

نیلم کے لئے یہ سب کچھ انتہائی تشویشناک تھا لیکن وہ زبردستی نہیں کر سکتی تھی۔

اگر وہ حمیداں پر سختی کرتی تو اس امر کا امکان تھا کہ معاملہ اور زیادہ خراب ہو جاتا۔ حمیداں آزاد بالغ انسان تھی' وہ اپنی مرضی سے کہیں اور بھی جا سکتی تھی۔ بہت ساری الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔

مشین کے اچھے خاصے عرصے کے لئے رک جانے کی صورت میں نیلم کو سراسر نقصان تھا لیکن اب اس نقصان کو برداشت کرنے کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ مستقل نقصان برداشت کرنے کے مقابلے میں عارضی' تھوڑا نقصان برداشت کر لینا بہتر تھا۔

کوٹھوں کی اس دنیا میں بیٹے کی ولادت ایک لعنت سمجھی جاتی تھی۔ جو کوٹھے والیاں حاملہ ہو جاتی تھیں ان کی دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ان کی بیٹی پیدا ہو تاکہ ان کے بڑھاپے کا سہارا بن سکے' جب یہ بوڑھی ہوں تو ان کی جوان بیٹی ان کی جگہ سنبھال سکے اور بیٹا .... خدا دشمن کو بھی نہ دے .... وہ بھلا کس کام کا تھا۔ اپنے لئے بھی آزار' دوسروں کے لئے بھی آزار۔

نیلم نے اس صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اب وہ دعائیں مانگتی تھی کہ حمیداں کے بیٹی پیدا ہو' تاکہ کوئی مسئلہ نہ بنے۔

"جب میرا وقت تھا تو میں نے کمائی کی۔" وہ حمیداں اور دوسری لڑکیوں سے کہتی۔
"اور اب تمہارا وقت ہے' تم لوگ کما رہی ہو۔ میں تمہاری سرپرست کے طور پر موجود ہوں۔ آج ہوں' کل نہیں ہوں گی۔ پھر تمہی لوگوں کو یہ سارا کاروبار سنبھالنا ہو گا۔ تمہی میں سے کسی کو میری جگہ لینی ہو گی اور آئندہ کے بارے میں سوچنا ہو گا۔ خدا کرے کہ نغمہ کے بیٹی پیدا ہو۔"

لیکن خدا نے اس کی دعا قبول نہیں کی۔ نغمہ کے بیٹی نہیں بیٹا پیدا ہوا۔ وہ جب ولادت کے بعد کوٹھے پر واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ وہ یہاں سے اکیلی گئی تھی اور اب اپنے وجود سے زندگی پانے والے ایک ذی روح کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس لڑکے کے خد و خال میں اسے اپنی آمیزش کے علاوہ کسی اور کی جھلک بھی صاف طور پر محسوس ہوتی تھی لیکن وہ کون تھا' اس کا نام کیا تھا' وہ کیا کرتا تھا' کہاں رہتا تھا؟ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

اس کے دل میں ایک بار بھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے بچے کے باپ کو جانے۔ اس کے لئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تو صرف اس بات کی تھی کہ وہ اس کا بیٹا تھا۔

حمیداں نے اپنے بیٹے کا نام حفیظ رکھا۔

یہ اس کی ایک بہت دیرینہ تمنا تھی۔ جب وہ سادھن گاؤں میں ملک عطاء اللہ کی حویلی میں تھی اور اس نے اور رئیس نے ایک ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت حمیداں نے سوچا تھا کہ جب اس کا اور رئیس کا پہلا بیٹا پیدا ہو گا تو وہ اس کا نام حفیظ رکھے گی۔ باپ کے نام سے کچھ ملتا جلتا اور اب کئی برس کے بعد بیٹا تو پیدا ہو گیا تھا اور اس نے اس کا نام حفیظ بھی رکھ دیا تھا لیکن اس کا باپ کون تھا؟ چلو' باپ کوئی بھی سہی' بیٹے کا نام تو حفیظ تھا۔ تمناؤں کی فریب کاریاں بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہیں۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد صرف حمیداں نے ہی نہیں' خود نیلم نے بھی اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ نیلم اپنے نقطہ نظر سے سوچ رہی تھی۔ حفیظ کی شکل میں ایک ایسا آدمی مل رہا تھا جو آئندہ چل کر اس کوٹھے کی چاکری کرنے والوں کی صف میں شامل ہو سکتا تھا۔ یہ تو وہ "سستی لیبر" تھی جو کوٹھوں پر پلنے کے بعد صرف کوٹھوں کی ہی خدمت کر سکتی تھی اور نیلم حفیظ کے لئے بھی ایسا ہی چاہتی تھی۔

لیکن حمیداں کچھ اور سوچ رہی تھی۔ وہ حفیظ کو یہاں سے الگ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اسی وقت یہ سوچ لیا تھا کہ وہ حفیظ کو اسکول بھیجے گی اور اسے ہوسٹل میں رکھے گی اور اس نے اپنے اس ارادے کا اظہار بھی کر دیا۔ نیلم نے اس کی مخالفت کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ابھی تو وہ وقت آنے میں بہت دیر تھی۔

مگر وقت تو پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ ماہ و سال بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ حمیداں کی زندگی میں اس کے علاوہ اور کوئی بڑی تبدیلی نمودار نہیں ہوئی کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اردگرد کی ہر چیز کی عمر میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

چھ سال کی مدت یوں گزر گئی جیسے ہوا کا ایک جھونکا دبے پاؤں آ کر گزر جائے اور کسی کو اس کے آنے اور جانے کا احساس بھی نہ ہو۔

حمیداں کو اس بالاخانے پر آئے ہوئے آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو اس کی عمر بیس سال کے قریب تھی اور وہ نوجوان تھی اور اب گزرے ہوئے ماہ و سال اس کی نوجوانی کی ساعتوں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ گو کہ وہ اب بھی جوان تھی بلکہ بھرپور طور پر جوان تھی لیکن اب بہت زیادہ وقت نہیں بچا تھا اور اسے خود بھی اس بات کا احساس تھا۔

حفیظ نیلم کی آنکھ کا تارا تھا جسے وہ نانی کہتا تھا' وہ ایک دم کے لئے بھی اسے اپنی آنکھوں کے سامنے سے جدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس کی ہر جا و بے جا خواہش کو پورا کرنا نیلم کے لئے ضروری تھا اور حفیظ شروع سے ہی ایک ضدی' سرکش اور غصیلا بچہ تھا اور اگر اس کی کوئی بات نہ مانی جاتی تو وہ رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتا تھا لیکن اس کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ نیلم اس کی ہر خواہش کو پورا کر دیتی تھی۔ حفیظ سارا وقت کوٹھوں پر اور گلی میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا۔

چھ سال کی عمر میں جب حمیداں نے حفیظ کو اسکول میں داخل کروانا چاہا تو نیلم نے اس کی سخت مخالفت کی۔

”نا نغمہ نا۔“ نیلم نے کہا۔ ”بچے پر ابھی سے اتنا ظلم مت کرو' ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی سے اسکول.......... نہیں.......... اس پر بہت بوجھ پڑ جائے گا۔“

”مگر آج کل تو لوگ چار پانچ سال کی عمر سے بچوں کو اسکول بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔“ حمیداں نے چڑ کر کہا۔

”یہ وہ لوگ کرتے ہیں جن سے بچوں کو سنبھالا نہیں جاتا۔“ نیلم نے جواب دیا۔ ”ابھی تو میں موجود ہوں۔“ اور یوں یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ البتہ یہ بندوبست ضرور کیا گیا کہ حفیظ کو مائی موتی کے کوٹھے پر رہنے والے ایک مولوی صاحب کے پاس بھیجا جانے لگا۔

یہ مولوی صاحب لنگڑے تھے اور برسوں سے مائی موتی کے کوٹھے پر رہتے تھے۔ گنڈے تعویذ بھی کرتے تھے' عملیات بھی کرتے تھے اور بچوں اور بچیوں کو اردو اور قرآن شریف بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ سہ پہر کو ان کے پاس' آس پاس کی گلیوں کے بہت سے بچے پڑھنے کے لئے آ جاتے تھے۔

حفیظ نے پہلے ہی دن وہاں دو بچوں سے جھگڑا کیا اور مولوی صاحب نے اپنی دیرینہ عادت کے مطابق اپنا بید سنبھال کر حفیظ کی پٹائی کر دی۔ حفیظ دھاروں دھار زار و قطار روتا ہوا واپس گھر بھاگ آیا اور نیلم نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو لنگڑے مولوی کی سات پشتوں کو پُن کر رکھ دیا اور یوں مولوی صاحب کے مکتب میں حفیظ کی پڑھائی ایک دن بھی نہ ہو سکی۔ وہ پھر سے' پہلے کی طرح سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا تھا اور یوں دیکھتے دیکھتے ایک سال کا عرصہ اور گزر گیا۔

حمیداں صاف طور پر یہ محسوس کر رہی تھی کہ حفیظ روز بروز زیادہ ضدی' سرکش اور بے کہنا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں تھی اور دل ہی دل میں

اور کبھی کبھی باآواز بلند غصے کے عالم میں اس کے نامعلوم باپ کو گالیاں دیا کرتی تھی جس کی گندی اور نابکار عادتیں اس نے ورثے میں پائی تھیں۔ خدا معلوم کون منحوس جنگلی تھا جس کے نطفے سے اس نے جنم لیا تھا۔

حفیظ کوٹھے کے ماحول میں پل رہا تھا' بڑھ رہا تھا۔ جہاں بچوں کی کسی قسم کی تربیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اگر وہ لڑکی ہوتا تو دوسری بات تھی۔ اسے بالکل بچپن سے ہی پیروں میں گھنگھرو باندھ کر ناچ گانے کی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا۔ اگر وہ لڑکی ہوتا تو ایک قیمتی اثاثہ ہوتا لیکن وہ بدنصیب تو لڑکا تھا۔

سات سال کی عمر میں حمیداں نے اسے نیلم کی مخالفت کے باوجود اسکول میں داخل کروا دیا اور کئی دن پہلے سے وہ اس کو اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتی رہی کہ اسے اسکول جانا ہے اور اسکول جانے کے فوائد اسے سمجھاتی رہی۔ اس نے اس کے لئے جس اسکول کا انتخاب کیا تھا وہ گھر سے بہت زیادہ دور نہیں تھا اور فی الحال اس نے مراد خاں طبلچی کی یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ روز صبح حفیظ کو اسکول چھوڑنے اور دوپہر کو اسے لینے جائے۔

حمیداں اسے خود اپنے ساتھ لے کر اسکول گئی اور جب داخلہ لینے والی ٹیچر نے داخلہ فارم اس کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیجئے اسے پُر کر دیجئے۔“ تو حمیداں جیسے زمین میں گڑ گئی۔

وہ اس وقت بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس بے چاری استانی کا لباس تو اس کے مقابلے میں ایک چوتھائی قیمت کا بھی نہیں ہو گا اور قیمتی لباس کے علاوہ حمیداں کے کانوں میں جو لمبے لمبے' نہایت خوبصورت آویزے جھلملا رہے تھے' تنہا ان کی مالیت ہزار ہا روپے کی ہو گی۔ اس کا خوبصورت اور تراشیدہ جسم اور اس کا بے حد پُرجمال چہرہ اس کی شخصیت کو نہایت درجہ پُروقار اور متاثر کُن بنائے ہوئے تھے۔

”آپ.......... آپ ہی پُر کر دیں جی.......... میں.......... دراصل..........“

”امی کو لکھنا نہیں آتا ہے مس!“ حفیظ نے معصومیت آمیز سچائی کے ساتھ اس کی مشکل حل کر دی۔ اسے یہ بات تو پہلے ہی بتا دی گئی تھی کہ اسکول کی استانی کو ”مس“ اور ”استاد کو ”سر“ کہتے ہیں۔ ”وہ تو دھوبی کا حساب بھی جمیلہ آپا سے لکھواتی ہیں۔“ اس کا اشارہ کوٹھے پر آنے والی اس نئی لڑکی کی طرف تھا جو میٹرک پاس تھی۔

ٹیچر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بے یقینی کے ساتھ بہت خوبصورت' فیشن

ایبل اور مہذب و تعلیم یافتہ نظر آنے والی اس خاتون کو دیکھنے لگی جسے لکھنا نہیں آتا تھا۔ نہ اردو' نہ انگریزی' کیونکہ فارم تو دونوں زبانوں میں چھپا ہوا تھا اور والدین کی سہولت کے لئے اسے کسی بھی زبان میں پُر کیا جا سکتا تھا۔

"واہ ری قسمت واہ۔" بے چاری ٹیچر نے حمیداں کے لمبے لمبے طلائی آویزوں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "الف کے نام لٹھ نہیں جانتیں اور ٹھاٹ باٹ دیکھو تو شہزادیوں جیسے .... واہ۔"

"اچھا اچھا' کوئی بات نہیں۔" ٹیچر نے جلدی سے مصنوعی خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لایئے میں بھرے دیتی ہوں .... بچے کا نام؟"

اور جب اگلے مرحلے میں ٹیچر نے بچے کے باپ کا نام پوچھا تو حمیداں نے فوراً کہا۔

"محمد رئیس .... مرحوم۔"

اور ایسا کہتے وقت اس کا دل کانپ اٹھا۔

حفیظ کی پیدائش ہسپتال میں ہوئی تھی اور وہاں بھی حمیداں نے اپنے "شوہر" کا نام رئیس لکھوایا تھا اور حفیظ کے برتھ سرٹیفکیٹ میں بھی اس کے باپ کا نام رئیس ہی لکھا ہوا تھا۔

اور ایک بار پھر اس نے حفیظ کے باپ کے طور پر رئیس کا نام لیا تھا لیکن اس بار اس نے رئیس کے ساتھ "مرحوم" کا لفظ لگایا تھا اور ایسا کہتے وقت وہ تھرا اٹھی تھی۔

"خدا کرے وہ جہاں کہیں بھی ہو اچھی طرح ہو' خوش و خرم ہو۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں بدنصیب اس زندہ کو مردہ لکھوا رہی ہوں۔"

لیکن اس "بدنصیب" کو یہ نہیں معلوم تھا کہ رئیس کو مرے ہوئے تو آٹھ سال گزر چکے ہیں۔ گندے نالے میں بہتی ہوئی اس کی لاش' نالے میں ہی نیچے اگی ہوئی گھاس پھوس میں پھنس کر گل سڑ کر ختم ہو گئی تھی اور ملتان میں بیٹھی ہوئی اس کی غریب بیوہ خالہ اور نیم معذور خالہ زاد بہن آج بھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ خالہ کا خیال تھا کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں شاید کہیں لمبا نکل گیا ہے اور آج بھی اس کے بوڑھے اور ناتواں دل میں یہ آس موجود تھی کہ ایک نہ ایک دن اس کا بھانجا اس کے پاس ضرور واپس آئے گا۔ بھلا وہ اپنی اس خالہ کو کس طرح فراموش کر سکتا تھا جس نے ماں بن کر اس کو پالا اور وہ اپنی نیم معذور خالہ زاد بہن کو کیونکر فراموش کر سکتا تھا جس نے ہمیشہ اس سے اتنا بہت سا پیار کیا تھا اور ان دونوں ستم رسیدہ اور فریب خوردہ خواتین کو یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا

کہ آج سے آٹھ سال پہلے' ان کے شہر سے بہت دور ایک تاریک رات میں ایک گندے نالے میں ایک نوجوان کی لاش بہائی گئی تھی' جو نالے میں ہی گل سڑ کر ختم ہو گئی تھی۔ وہ لاش رئیس کی تھی اور سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے یہ جرم کیا تھا اور کسی کو رئیس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ رئیس کی گمشدگی کی خبر کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ اس کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ ملک کے کسی تھانے میں درج نہیں کرائی گئی۔

"محمد حفیظ ولد محمد رئیس مرحوم۔" ٹیچر نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔

"پتہ؟"

حمیداں کو معلوم تھا کہ اسے کیا پتہ لکھوانا ہے۔ وہ ہیرا منڈی کا پتہ نہیں لکھوانا چاہتی تھی۔ اس نے پہلے ہی ایک جاننے والے سے بات کر لی تھی اور اس کے گھر کا پتہ لکھوا دیا۔

حفیظ کو اسکول میں داخل کروا کے حمیداں نے سمجھ لیا تھا کہ سارا مسئلہ حل ہو گیا اور اس کا بیٹا پارس بن جائے گا' عالم فاضل بن جائے گا' پڑھ لکھ کر اس ماحول سے باہر نکل جائے گا۔

حفیظ ابھی تو چھوٹا تھا اور اس ماحول کے اسرار و رموز کو پورے طور پر نہیں سمجھتا تھا جس میں وہ رہ رہا تھا لیکن حمیداں یہ سوچ سوچ کر لرزا کرتی تھی کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا اور اس کو اس بات کا پورا شعور ہو جائے گا کہ وہ ایک رنڈی کا بیٹا ہے' تو پھر اس کا کیا ردعمل ہو گا۔ اگر وہ لڑکی ہوتا تو سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ حمیداں اگر اسے اپنا جیسا نہ بھی بنا پاتی تو بھی اس کی نظروں میں اس قدر گر نہیں سکتی تھی لیکن حفیظ تو بیٹا تھا' لڑکا تھا' مرد تھا .... وہ اس زخم کو کیسے برداشت کرے گا؟

لیکن بہت سے حقائق اسے تسلی دینے کے لئے موجود تھے۔ انہی کوٹھوں میں مختلف عمروں کے کتنے ہی لڑکے تھے جن کی بہنیں اور مائیں اور خالائیں باقاعدہ رنڈیاں تھیں اور وہ سب کے سب کیسے آرام سے' کیسی ڈھٹائی سے زندہ تھے۔ حالات نے انہیں سب کچھ برداشت کرنا اور ایک خاص انداز سے جینا سکھا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنے آپ کو تسلی دے دیتی تھی۔ "جب وہ اور زیادہ بڑا ہو جائے گا تو پھر میں دھندہ چھوڑ دوں گی۔ ہاں اور کیا۔ تب تک میرے پاس اتنا پیسہ جمع ہو چکا ہو گا کہ میں بغیر دھندہ کے بھی گزارا کر سکوں گی۔ اسے پڑھا لکھا کر کسی قابل کر دوں گی تو پھر مجھ کو دھندہ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

حفیظ کے بڑے ہونے کی صورت میں وہ اور کیا کیا کرے گی' اس کا کوئی واضح نقشہ اس کے ذہن میں نہیں تھا اور ابھی سے کوئی نقشہ بنانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ابھی تو اس وقت کے آنے میں بہت سال باقی تھے۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ سب کچھ حمیداں کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا اور اپنی پریشانیوں کے دوران جب وہ اپنی اب تک کی زندگی کے بارے میں سوچتی تو اسے صاف طور پر یہ نظر آتا کہ آج تک کچھ بھی اس کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ اس کی مرضی اور اس کی آرزو کے خلاف ہی ہوا تھا اور اب بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔

مراد خاں طبلچی روزانہ صبح کو بڑی پابندی کے ساتھ حفیظ کو اسکول لے کر جاتا تھا اور دوپہر کو اسے اپنے ساتھ واپس لے کر آتا تھا۔ حفیظ اسکول میں کیا پڑھتا تھا' حمیداں اس بارے میں کچھ نہیں جان سکتی تھی کیونکہ وہ بے چاری تو مکمل طور پر اَن پڑھ تھی۔ البتہ ان دِنوں کوٹھے پر نئی آنے والی ایک لڑکی جمیلہ' میٹرک پاس تھی اور وہ حفیظ کی پڑھائی کی کچھ دیکھ بھال کر لیتی تھی۔ ابھی تو حفیظ کی پڑھائی کی محض ابتدا تھی لیکن جمیلہ کا کہنا تھا کہ حفیظ کی پڑھائی ٹھیک نہیں چل رہی ہے۔ وہ خود اسے گھیر گھار کر گھر پر کچھ پڑھانے کی کوشش کرتی تھی لیکن حفیظ اس کے قابو میں بالکل نہیں آتا تھا۔ اسکول سے آتے ہی وہ کوٹھوں کوٹھوں گھومتا پھرتا تھا اور گلیوں میں دوسرے بچوں کے ساتھ ہنگامے کرتا پھرتا تھا۔ اسے پڑھائی لکھائی سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گھر پر کبھی بھی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

"نہ جانے کس کم بخت باپ کی اولاد ہے۔" حمیداں دل ہی دل میں جھلاتے ہوئے کہتی۔ "ذرا سا بھی لگاؤ ہو اسے لکھنے پڑھنے سے۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ پریشان ہو جاتی۔

مزید سات سال کا عرصہ ایک سراٹے کے ساتھ گزر گیا اور اس مدت کے دوران حمیداں کو مایوسیوں اور ناامیدیوں کے سوا کچھ نہ حاصل ہو سکا۔ اس نے حفیظ کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا وہ کسی طرح پورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ تعلیم حاصل کر لے لیکن حفیظ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس سات برس کے عرصے میں حفیظ نے بڑی مشکل سے' رو جھینک کر پانچ جماعتیں پڑھی تھیں۔ چھوٹی جماعتوں میں تو اسے ترقی دے دی گئی تھی لیکن پھر یہ کام مشکل ہوتا گیا۔ اس کی عمر اب چودہ سال کی ہو چکی

تھی لیکن وہ اس عمر میں صرف پانچویں جماعت تک پہنچ سکا تھا۔

حمیداں کو کوٹھے پر آئے ہوئے سولہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ عمر کا ایک بڑا حصہ وہ یہاں گزار چکی تھی اور اب اس کی عمر کوئی چھتیس سال کی ہو رہی تھی۔

نوجوانی بیت گئی' پھر جوانی کے بیتنے کی باری آئی اور اب جوانی بھی بیتی جا رہی تھی۔ لمحات گریزاں کی رفتار بہت تیز تھی اور وقت کی اڑان کا تو احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ صبح شام میں اور شام صبح میں ڈھلتی چلی جاتی تھی اور یوں ایک ایک کر کے زندگی کے دن گزرتے جا رہے تھے۔

"بس .... چند سال اور۔" حمیداں دل میں سوچتی۔ "اس کے بعد سب کچھ ختم' بس پھر دھندہ بند کرنا ہے .... اس کے بعد ضرورت بھی نہیں رہے گی۔" اسے اپنی تیزی کے ساتھ ڈھلتی ہوئی عمر کا پوری طرح احساس تھا۔ گو کہ اب بھی اس کے حسن اور دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن گزرتے ہوئے ماہ و سال چہرے پر اپنی گزران کی لکیریں تو ضرور چھوڑ جاتے ہیں جنہیں کوئی نہیں مٹا سکتا۔ وہ اپنی طرف اٹھنے والی گاہکوں کی بدلی ہوئی نظروں کو پہچان رہی تھیں ان کے بدلے ہوئے تیوروں کو پہچان رہی تھی۔ گاہکوں کے چہروں پر اب اس کو دیکھ کر وہ رنگ نہیں کھلتے تھے جو کسی بیس بائیس سال کی لڑکی کو دیکھ کر کھلتے تھے۔ اس کے اردگرد کی دنیا بدل رہی تھی .... سب کچھ بدل رہا تھا۔

اور اس کا بیٹا حفیظ اب چودہ سال کا تھا .... ایک نوعمر لڑکا .... وہ انہی کوٹھوں کی فضاؤں میں پلا بڑھا تھا اور حمیداں اپنی خواہش کے باوجود اسے یہاں سے نہیں ہٹا سکی تھی۔ اس کا تو شروع سے یہ ارادہ تھا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دلوائے گی اور اپنے آپ سے' اس ماحول سے' اس کو الگ کر دے گی لیکن پھر نہ جانے کیوں' وہ یہ کر نہیں سکی۔ سب کچھ بگڑتا ہی چلا گیا۔ کوئی بات ٹھیک سے بن ہی نہیں پائی۔ حمیداں اس انتظار میں ہی رہی کہ حفیظ کم از کم پانچویں کلاس تو پاس کر لے تو پھر وہ اس کو ایک ایسے دوسرے اسکول میں بھیج دے جہاں ہوسٹل تھا۔ وہ اسے بہت چھوٹی عمر میں اپنے آپ سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی اور سب سے زیادہ تو نیلم اس بات کی مخالف تھی' وہ تو سرے سے حفیظ کو ہوسٹل بھیجنے ہی کی مخالف تھی۔ مگر حمیداں اسے جلد از جلد یہاں سے الگ کر دینا چاہتی تھی۔

لیکن حفیظ نے اس کے سارے پروگرام کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔

وہ بار بار اسکول سے بھاگ جاتا اور پھر اسے زبردستی پکڑ پکڑ کر اسکول میں بٹھایا جاتا۔

مراد خاں طیلچی بے چارہ تو کب کا مر چکا تھا اور اب وہ اکیلا ہی اسکول آتا جاتا تھا لیکن وہ اسکول جانے کے بجائے لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا اور بعض اوقات تو سارا دن گھر سے غائب رہتا۔

حمیداں بے چاری کس کس کو اس کی تلاش میں دوڑاتی اور پھر اسے اسکول کے ٹیچروں کی سپرد کر دیتی لیکن اس مارے باندھے کی پڑھائی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ حفیظ کی عمر تو بڑھتی گئی لیکن اس کی تعلیم آگے نہیں بڑھ سکی۔

اور اب وہ چودہ سال کی عمر میں پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔

حفیظ جس ماحول میں پرورش پا رہا تھا وہ رشتوں کے روایتی تقدس سے عاری' بے ننگ و نام ماحول تھا۔ یہ گالم گلوچ' فحش کلامی اور جنسی بے باکی کا ماحول تھا۔ یہاں کچھ چھپایا نہیں جاتا تھا۔ یہاں تو سب کچھ اچھالا جاتا تھا۔

اس ماحول میں پرورش پانے والا چودہ سالہ حفیظ اب ایسا ننھا نہیں تھا جو یہ نہ جان سکتا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی ماں کون ہے اور کیا کر رہی ہے اور وہ خود کیا کر رہا ہے۔

اور یہ بات سوچ سوچ کر حمیداں کا کلیجہ کٹنے لگتا تھا اور بعض اوقات وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتی اور اسے یوں لگتا کہ اس میں اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہے۔

کتنی ہی بار ایسا ہوا تھا کہ حمیداں اپنے کسی گاہک کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور حفیظ وہاں آس پاس ہی موجود تھا اور وہ دونوں کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور پھر جب حمیداں دروازے کو رات بھر کے لئے بند کرتی تو اسے یوں لگتا کہ اس کے سینے پر ہمالیہ پہاڑ رکھا ہوا ہے۔ وہ ساری رات بڑے عذاب میں گزارتی۔

لیکن حفیظ نے اس سے یہ کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ آدمیوں کے ساتھ کمرے میں بند ہو کر ساری رات کیا کرتی ہے' نہ صرف وہ خود بلکہ کوٹھے کی دوسری کئی عورتیں بھی۔ حفیظ نے اس سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ وہ ہر رات ایک نئے مرد کے ساتھ کمرے میں کیوں بند ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی ماں سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ اگر اس کا باپ مر چکا ہے' جیسا کہ اسے بالکل بچپن میں بتایا گیا تھا تو پھر اس کے اور رشتے دار کہاں ہیں۔ کیا اس کے باپ کا کوئی نہیں تھا۔

حمیداں بجا طور پر یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ سمجھوتوں کی دنیا تھی۔ اس نے' حفیظ نے اور ان سب لوگوں نے جو اس ماحول سے متعلق تھے اور ان فضاؤں کے پروردہ تھے ان حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ان سب نے ایک دوسرے کی طرف سے اپنی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ لوگ سب کچھ دیکھتے' سمجھتے' جانتے اور بوجھتے تھے لیکن زندہ رہنے کے لئے ضروری تھا کہ زبانوں کو بند رکھیں اور ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ یہ سمجھوتے اور تعاون کی فضا تھی۔

حمیداں کی مرضی اور خواہش کے برخلاف' حفیظ کوٹھے پر ہی رہ کر عمر کی اس منزل کو پہنچ گیا تھا جہاں حمیداں کے لئے اس سے کچھ چھپانا ناممکن ہو گیا تھا۔

"کاش .... کاش میں اسے آٹھ دس سال کی عمر میں اپنے سے الگ کر دیتی۔" وہ اکثر بڑے دکھ کے ساتھ سوچتی اور نیلم کے سامنے برملا اس کا اظہار بھی کرتی۔ "میں پہلے ہی اسے یہاں سے ہٹا کر کسی ہوسٹل میں.........."

"اس سے کیا فرق پڑتا بی بی!" نیلم اس کی بات کاٹ کر جواب دیتی۔ "تم اس سے کیا چھپاتیں اور کیسے چھپاتیں؟ نہیں' تم کچھ نہیں چھپا سکتی تھیں۔ رنڈی کا بیٹا تو رنڈی کا بیٹا ہی رہے گا اور اس کے ماتھے پر لگی ہوئی اس مہر کو تو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی۔ تم اگر اسے سات سمندر پار بھی بھیج دیتیں تو بھی اسے یہ بات معلوم ہو کر رہتی کہ وہ رنڈی کا بیٹا ہے۔ ایسی باتیں کسی طرح بھی چھپائے نہیں چھپتیں۔"

حمیداں خاموش ہو جاتی۔ نیلم کی بات اتنی صحیح اور بھرپور تھی کہ اس سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

حفیظ اس اسکول سے پانچویں کلاس کا امتحان نہیں دے سکا کیونکہ اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے حمیداں کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور اسے اطلاع دی کہ حفیظ کا نام اسکول کے رجسٹر سے خارج کیا جا رہا ہے۔ "مجھے افسوس ہے محترمہ! لیکن ہم ایسا کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ ہم منشیات کے عادی بچوں کو اپنے اسکول میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ ہماری طے شدہ پالیسی ہے اور ہم اس سلسلے میں سارے والدین کو باقاعدہ اطلاع دے چکے ہیں۔"

"تو کیا .... کیا حفیظ.........." حمیداں کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

"جی ہاں بیگم صاحبہ!" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "کل اس کو تیسری بار اسکول کے احاطے میں نشے کا سگریٹ پیتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ اس سے پہلے دو بار اسے پکڑا جا چکا ہے۔ اس کو خود بھی وارننگ دی گئی تھی اور ہم نے آپ کو بھی مطلع کیا تھا لیکن افسوس کہ آپ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔"

"مجھے .... مجھے مطلع کیا تھا؟" حمیداں نے چونک کر کہا۔ "مگر کیسے؟ مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔"

"ہم نے آپ کے پتے پر دو رجسٹرڈ خط بھیجے۔" ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "اور ہم نے آپ سے درخواست کی کہ آپ اسکول تشریف لا کر مجھ سے ملاقات کریں۔ یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ آپ کے بیٹے کو نشے کے سگریٹ پیتے ہوئے پکڑا گیا ہے لیکن آپ تشریف نہیں لائیں۔"

ہائے ری مجبوری، حمیداں اسکول میں اپنا صحیح پتہ بھی نہیں لکھوا سکتی تھی۔ اس نے کسی اور کا پتہ لکھوا دیا تھا اور وہ شخص شہر سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ چند ہی روز پہلے وہ واپس آیا تھا اور اس نے حمیداں کو آخری خط لا کر دیا جس میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اسے لکھا تھا کہ وہ فوراً اسکول آ کر اس سے ملاقات کرے کیونکہ اس کے بیٹے کو اسکول سے نکالا جا رہا ہے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ کے دونوں خط نہیں ملے۔" حمیداں نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ "اگر مجھے خط ملتے تو میں ضرور آتی۔ جس طرح کہ اب آئی ہوں۔ میں اس کو روکوں گی سر! وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔"

"نہیں محترمہ نغمہ صاحبہ!" ہیڈ ماسٹر نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ تو صرف اپنے بچے کے بارے میں سوچ رہی ہیں لیکن ہمیں اسکول کے تمام بچوں کے بارے میں سوچنا ہے۔ حفیظ انہیں بھی نشے کے سگریٹوں کی عادت ڈلوا سکتا ہے۔ ہم اسے اپنے اسکول میں نہیں رکھ سکتے۔ فوری طور پر اس کا نام اسکول سے خارج کر رہے ہیں۔ تاہم میں اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ میں کوئی بات اس کے خلاف نہیں لکھوں گا لیکن بہتر ہو گا کہ آپ لوگ اسے کسی دوسرے اسکول میں داخل کروانے سے پہلے اس کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ اصل میں اسے گھر والوں کی توجہ کی اشد ضرورت ہے۔"

حمیداں جب ہیڈ ماسٹر کے کمرے سے باہر نکلی تو اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ یہ لڑکا تو اسے بالکل ہی ہاتھ سے جاتا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے چودہ سال کی عمر

میں نشے کے سگریٹوں کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

"اس کو کس طرح روکا جائے؟" اس نے دل میں سوچا۔ "کاش .... اس کا باپ ہوتا .... رئیس ہوتا۔" اس کے دماغ میں اس کے باپ کے متعلق بہت سے خیالات گڈمڈ ہو گئے۔ اگر اس کا باپ ہوتا تو اس کو روکتا۔ مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیتا اور اس کا گھر سے باہر نکلنا بند کر دیتا۔ ان لوگوں کو گریبان سے پکڑتا جو اسے نشے کے سگریٹ دیتے ہیں۔ مگر باپ کہاں تھا، خدا جانے کہاں تھا۔

وہ جب گھر آئی تو اس نے نیلم کو ساری بات بتائی اور خود نیلم بھی یہ سن کر پریشان ہو گئی۔

"نرمی سے، پیار سے سمجھانا۔" نیلم نے اسے مشورہ دیا۔ "میں بھی اسے پیار سے سمجھاؤں گی۔ مرد ذات ہے، عورت ذات کی سختی برداشت نہیں کرے گا۔"

اس دن حمیداں اور نیلم دونوں نے حفیظ کو بہت سمجھایا اور حمیداں نے تو بعد میں اسے برا بھلا بھی کہا۔ حفیظ سر جھکائے، خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا اور آخر میں اس نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ آئندہ نشے کے سگریٹوں کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

"اسکول سے تو تمہیں نکال دیا گیا ہے۔" حمیداں نے کہا۔ "ذرا دیکھو .... تمہاری عمر کے کتنے لڑکے تو آٹھویں اور نویں کلاس میں پہنچ چکے ہیں اور تم تو ابھی پانچویں بھی پاس نہیں کر پائے اور اب نوبت یہ آ پہنچی کہ تمہیں اسکول سے نکال دیا گیا۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں تمہیں ہوسٹل میں داخل کروا دوں گی۔"

حفیظ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

اس دن کے بعد سے حمیداں نے فوراً ہی بھاگ دوڑ شروع کر دی اور ایک دوسرے اسکول میں پانچویں جماعت میں حفیظ کے داخلے کا بندوبست کروا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کو ہوسٹل میں بھی داخل کروا دیا۔

حفیظ ہوسٹل میں آنے سے ناخوش نہیں تھا اور اس نے اپنی ماں کی اس تجویز کی مخالفت بھی نہیں کی۔ پچھلے اسکول سے اسے جو سرٹیفکیٹ ملا تھا اس میں اس کے کیریکٹر کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی گئی تھی۔ اس لئے اسے دوسرے اسکول میں داخلہ بھی آسانی سے مل گیا اور ہوسٹل میں بھی اسے داخل کر لیا گیا۔

حمیداں کو لگا کہ اب اس کے سارے دلدر دور ہو گئے ہیں۔ خدا خدا کر کے اب سارے معاملات ٹھیک ہوتے نظر آ رہے تھے۔

"چار سال .... بس زیادہ سے زیاہ چار سال اور اس کے بعد خدا حافظ۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "پھر میں اس جگہ کو بھی چھوڑ دوں گی اور کہیں اور کرائے کا مکان لے کر رہوں گی۔ یہاں سے بہت دور۔ جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔ بس' ہم دونوں ماں بیٹے ہوں گے اور میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ بڑے آرام سے حفیظ کو آگے پڑھا سکتی ہوں۔ کاش .... وہ پڑھ لے .... میں انتظار کروں گی۔ میں اس کے پڑھنے کا انتظار کروں گی اور جب وہ اچھی تعلیم حاصل کر کے کچھ کرنے کے قابل ہو جائے گا تو پھر اس کی شادی کر دوں گی۔ کتنا اچھا ہو گا یہ سب کچھ۔"

وہ بڑی اچھی اچھی' صاف ستھری' پیاری پیاری باتیں سوچتی رہی۔ جس دن سے حفیظ یہاں سے گیا تھا اس دن سے وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کی یہاں عدم موجودگی حمیداں کے لئے بہت زیادہ سکون کا باعث تھی۔

لیکن نیلم کو اس کا یہاں سے جانا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ حفیظ تھا تو بھاگ بھاگ کر سارے کام کر دیتا تھا اور اب تو ذرا ذرا سے کام کے لئے اٹھنا پڑتا تھا۔ اچھی خاصی مشکل ہو گئی تھی۔

حمیداں نے حفیظ کو رخصت کرتے وقت اس سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ اب وہ نشے کے سگریٹوں کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور حفیظ نے یہ وعدہ کر بھی لیا تھا۔ تاہم حمیداں کے دل میں ایک کھٹک سی موجود تھی۔ "خدا کرے وہ نشے سے دور رہے۔" وہ دل میں کہتی۔

حمیداں کے لئے یہ انکشاف کہ اس کا چودہ سالہ بیٹا نشے کا استعمال کرنے لگا ہے' اگرچہ ایک ہولناک انکشاف تھا لیکن حیرت انگیز نہیں۔ نشے کا استعمال تو کوٹھوں پر بہت عام تھا۔ بہت سی طوائفیں نشے کی عادی تھیں اور ان کے کوٹھے پر رہنے والے مرد بھی اور آنے والوں میں سے بھی بہت سے لوگ نشے کے عادی ہوتے تھے۔ جہاں تک سگریٹ کا تعلق تھا تو طوائفوں کی بھاری تعداد ایسی تھی جو سگریٹ پیتی تھی۔

ان حالات میں اگر چودہ سالہ حفیظ کو نشے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی تو یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ کوٹھوں پر پلنے والے کتنے ہی لڑکے ایسے تھے جو کم عمری میں ہی نشے کے عادی ہو جاتے تھے اور پھر مرتے دم تک یہ وبال ان کی جانوں کے ساتھ چمٹا رہتا تھا۔

اور اس لئے حمیداں خوش تھی کہ اس نے حفیظ کو اس فضا سے نکال دیا ہے۔ گو کہ

اس نے بہت دیر کر دی تھی تاہم اب بھی حالات کو سنبھالا جا سکتا تھا۔

"یہاں سے دور رہے گا تو خدا نے چاہا تو ٹھیک رہے گا۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "وہاں ہوسٹل میں سب پڑھنے پڑھانے والے لڑکے ہوتے ہیں۔ پھر ماسٹر لوگ خود موجود ہوتے ہیں۔ وہ بڑی سختی کے ساتھ بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ مجال ہے کہ کوئی لڑکا کوئی گڑبڑ کر سکے۔ وہ ماسٹر کہہ رہا تھا کہ ہوسٹل میں لڑکوں کی ذمہ داری ہوسٹل والوں پر ہوتی ہے اور سب لڑکوں کا برابر سے خیال رکھا جاتا ہے۔ کاش اب وہ کچھ پڑھ لے۔ ہاں اب تو پڑھ لے گا۔ ہوسٹل میں اب گیا ہے۔ اب وہ ضرور پڑھ لے گا۔ وہاں برے لڑکوں کی صحبت سے بھی بچا رہے گا۔"

راتوں کے آخری پہر کے گہرے سناٹے میں جب اکثر اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہوتی اور کوٹھوں کے ہنگامے سرد ہو چکے ہوتے' گھنگھروؤں کی جھنکار' طبلے کی تھاپ' موسیقی کی آواز اور انسانوں کے ملے جلے قہقہوں کی آوازیں ڈوب چکی ہوتیں تو حمیداں کے ذہن میں کچھ دھندلی دھندلی سی شکلیں ابھرتیں۔ وہ اپنی بیٹی کے بارے میں سوچتی جسے وہ چار سال کا چھوڑ کر آئی تھی۔ آج سولہ برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اب تو وہ بیس سال کی ہو چکی ہو گی۔ ضرور اس کی شادی ہو چکی ہو گی۔ بھلا بیس سال کی عمر تک کوئی لڑکی بغیر شادی کے بیٹھی رہ سکتی ہے؟ اسے تو اب بچوں والی ہو جانا چاہئے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے جان اور افسردہ مسکراہٹ پھیل جاتی۔ "ہاں تو وہ بچوں والی ہو چکی ہو گی۔ یعنی یہ کہ میں نانی بن چکی ہوں۔ ہائے میں مر جاؤں' مجھے تو پتہ ہی نہیں اور میں نانی بھی بن چکی ہوں۔"

اور وہ اپنے اس بیٹے کے بارے میں سوچتی جسے وہ ڈیڑھ سال کا چھوڑ کر گھر سے بھاگ گئی تھیں کبھی کبھی تو بیٹے کی یاد میں دل اس قدر شدت کے ساتھ تڑپ اٹھتا تھا کہ وہ اپنے سارے وجود کو پگھلتا ہوا محسوس کرنے لگتی۔ کاش .... ایک بار وہ اسے دیکھ لیتی اور سینے سے لگا لیتی۔

"اب تو اس کی عمر سترہ سال سے زیادہ ہو گی۔" وہ سوچتی۔ "ہائے کیسا ہو گا میرا بیٹا .... نوجوان اور خوبصورت .... وہ بالکل میری شکل کا تھا اور سارے دیکھنے والے یہی کہتے تھے کہ وہ میری شکل کا ہے۔ ہوبہو مجھ جیسا تھا۔ تو اب وہ کتنا بڑا اور کتنا خوبصورت ہو چکا ہو گا۔

دماغ کچھ اور بھٹکتا۔ "نہ جانے احمدا بے چارہ کس حال میں ہو گا۔ قرضے کا خدا

جانے کیا ہوا .... میں تو سب کچھ ادھورا چھوڑ کر بھاگ آئی اور پھر اسے ہی سب کچھ بھگتنا پڑا ہو گا۔ کیا کیا ہو گا' اس نے؟ قرضہ کہاں سے ادا کیا ہو گا؟ بس یہی ہوا ہو گا کہ ملک عطاء اللہ نے اس کی زمین چھین لی ہو گی اور جب زمین ہی چھن گئی ہو گی تو وہ لوگ کہاں سے کھاتے ہوں گے؟ وہی کھیت مزدوری .... جاگیردار ملک عطاء اللہ کی زمینوں پر کام کرتے ہوں گے اور اب تو باپ بیٹے دونوں ہی مل کر کام کرتے ہوں گے اور میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟ میرے بارے میں کیا کہتے ہوں گے؟ ان کے دلوں میں میرے خلاف کتنی نفرت ہو گی .... بیٹا اس وقت تو بہت چھوٹا تھا ڈیڑھ سال کا۔ مگر پھر جب وہ بڑا ہوا ہو گا تو اسے سب کچھ معلوم ہو گیا ہو گا میرے بارے میں .... اور وہ .... وہ میرے منہ پر تھوکتا ہو گا۔"

اور ایسی ہی بے خواب راتوں میں وہ سوچ سوچ کر چپکے چپکے خون کے آنسو روتی تھی کہ وہ تین جوان بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی ان سے کس قدر دور ہے۔ تقدیر نے اسے کس قدر تنہا کر دیا تھا۔ زندگی کے سفر کا آدھے سے زیادہ حصہ بیت چکا تھا۔ کچھ پانے کی حسرت میں اور کھونے کے ملال میں اور اب زندگی کے اس موڑ پر ناکام حسرتوں اور گہرے ملال کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا تھا اور اب اگر امید کی کوئی کرن تھی تو صرف یہ کہ حفیظ کی زندگی سنور جائے اور پھر دونوں ماں بیٹا یہاں سے نکل جائیں لیکن یہ امید بھی کتنی شرمساریوں اور حسرتوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ کیا وہ واقعی حفیظ کو ایک ماں کی پاکیزگی دے سکتی تھی؟

حفیظ صرف چھ ماہ ہوسٹل میں رہ سکا اور اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔ یہ ایک پرائیویٹ اسکول کا پرائیویٹ ہوسٹل تھا اور انتظامیہ کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ جسے چاہے ہوسٹل میں داخلہ دے اور جسے چاہے نہ دے۔ یہ معاملہ صرف انتظامیہ کی اپنی صوابدید کا تھا۔

"ہمیں بہت افسوس ہے محترمہ!" ہوسٹل کے انچارج نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی حمیداں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "ہم آپ کے بیٹے کو ہوسٹل میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم معذرت چاہتے ہیں۔"

"اگر اس نے یہاں کے قاعدے قانون کی خلاف ورزی کی ہے سر جی! تو آپ اسے سزا دیں۔" حمیداں نے پریشان ہو کر کہا۔ "آپ کو اسے سزا دینے کا پورا اختیار ہے۔ میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا ہے سر!"

"نہیں بی بی! یہ بات نہیں ہے۔" انچارج نے ایک لحظے کے لئے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر میز پر رکھی ہوئی فائل کو گھورنے لگا۔ "بات یہ ہے' وہ جی اصل بات یہ ہے کہ ہمارا ہوسٹل معزز خاندانوں کے لڑکوں کی جگہ ہے۔ اس کی نیک نامی پر اگر حرف آئے تو ہمارے لئے مشکلات پیدا ہوں گی۔"

فوری طور پر تو حمیداں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی اور ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے بی بی کہ حفیظ کا خاندانی پس منظر ایسا ہے کہ ہم اسے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔" انچارج نے بہت سنبھل کر اور بڑے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "آپ مہربانی کر کے اسے یہاں سے لے جائیں .... ہوسٹل میں دوسرے لڑکے بھی آتے ہیں۔ ان کے والدین اور سرپرستوں کو اگر پتہ چلے گا تو ...." اور اس کے آگے اس نے کچھ نہیں کہا۔

اور اس کے آگے اسے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سب کچھ واضح تھا۔ حمیداں نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور تھکے تھکے قدموں سے اس کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس نے جب حفیظ کو اس نئے اسکول اور ہوسٹل میں داخل کروایا تھا تو اس کے وہی کوائف لکھوائے تھے جو اس سے پہلے والے اسکول میں درج کروائے تھے اور یہ بات کہیں سے بھی مترشح نہیں ہوتی تھی کہ حفیظ ایک رنڈی کا بیٹا ہے جس کے باپ کا کوئی پتہ نہیں اور جو ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے میں رہتا ہے۔ گھر کا پتہ بھی اس نے دوسری جگہ کا لکھوایا تھا۔

اور جہاں تک خود حفیظ کا تعلق تھا تو اگرچہ حمیداں اپنے اندر کبھی بھی اتنی جرأت پیدا نہیں کر سکی تھی کہ وہ اسے واضح طور پر یہ ہدایت دے کہ وہ اپنے بارے میں اسکول میں کسی کو کچھ نہ بتائے' تاہم حفیظ اپنے آپ کو چھپانے کا ڈھب جانتا تھا۔ ویسے نیلم وغیرہ نے بھی اس کو بتا دیا تھا کہ اسے اپنے بارے میں کیا کہنا چاہئے۔ حفیظ نے اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔

لیکن جس نئے اسکول میں اور وہاں کے ہوسٹل میں حفیظ کو داخل کیا گیا تھا وہاں اسے پہچان لیا گیا تھا۔ اسے ایک "دانشور" نے پہچانا تھا' جس نے اپنے "تحقیقی مقالے" کے لئے مواد جمع کرنے کی غرض سے پچھلے دنوں اس علاقے میں کافی وقت گزارا تھا اور بہت

سی رنڈیوں' بھڑوؤں اور ان کے لواحقین سے گفتگو کی تھی۔ وہ "دانشور" نیلم کے کوٹھے میں بھی گیا تھا اور وہاں اس نے حفیظ کو بھی دیکھا تھا اور اس کی ماں کو بھی۔ اس "دانشور" کا اپنا بیٹا بھی اسی اسکول میں پڑھتا اور اسی ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اتفاق سے وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے ہوسٹل آیا تھا اور اس نے وہاں حفیظ کو بھی دیکھ لیا۔ اس نے حفیظ کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ حفیظ کو یہاں داخل کیا گیا ہے اور یہاں رہتا ہے۔

"دانشور" نے فوراً ہوسٹل کی انتظامیہ کو رپورٹ کرتے ہوئے سخت احتجاج کیا اور کہا کہ شریفوں کے بچے اگر رنڈیوں کے بچوں کے ساتھ پڑھیں گے تو ان کا اخلاق خراب ہو گا۔ ہوسٹل کی انتظامیہ نے خاموشی سے تحقیقات کروائی اور معلوم ہوا کہ "معزز دانشور" نے جو الزام لگایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ حفیظ واقعی ایک طوائف کا بیٹا تھا' جو ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے میں باقاعدہ دھندا کرتی تھی۔

چنانچہ فوراً یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ قبل اس کے کہ یہ بات پھیلے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کا علم ہو' حفیظ کو ہوسٹل سے نکال دیا جائے۔

اور اس طرح حفیظ کو ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ تاہم اتنی رعایت ضرور برتی گئی کہ اسے اسکول سے نہیں نکالا گیا۔

لیکن حفیظ خود ہی اسکول سے نکل گیا۔

ہوسٹل سے واپس آنے کے بعد وہ اسکول نہیں گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے ہوسٹل سے کیوں نکال دیا گیا ہے اور اب وہ اسکول اور ہوسٹل کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ حمیداں نے بہت چاہا کہ وہ اسکول جانا شروع کر دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

حمیداں نے اس سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس اسکول میں نہیں جانا چاہتا تو وہ اس کے داخلے کے لئے کسی اور اسکول میں کوشش کرے' لیکن حفیظ کے تو تیور ہی بگڑے ہوئے تھے۔ وہ اسکول جانے پر راضی ہی نہیں تھا۔ حمیداں غم و غصے کے عالم میں تلملانے لگی۔

"ابھی زیادہ زور مت دو۔" نیلم نے اسے سمجھایا۔ "زبردستی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مرد ذات ہے۔ ایک بار ہتھے سے اکھڑ گیا تو سنبھالنا مشکل ہو گا۔ ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ۔ ہم سب اسے مل کر سمجھائیں گے۔ زبردستی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں' اسکول سے بھاگتا پھرے گا تو کیا حاصل ہو گا؟"

حمیداں دل مسوس کر رہ گئی۔ شدت غم سے اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ جو کچھ وہ سوچتی تھی' معاملات اس کے برعکس رخ اختیار کر جاتے تھے۔ وہ تو حفیظ کو ہوسٹل بھیجنے

کے بعد پوری طرح مطمئن تھی کہ اس نے حفیظ کو یہاں سے' اس ماحول سے الگ کر دیا ہے اور اب نہ صرف یہ کہ وہ پڑھائی کی طرف توجہ دے سکے گا بلکہ حمیداں خود بھی آزادی کا سانس لے سکے گی۔ کوٹھے پر حفیظ کا وجود تو اس کے لئے ہمیشہ خجالت کی ایک زنجیر بنا رہا تھا۔

لیکن اب سب کچھ پہلے ہی جیسا ہو گیا تھا۔ خجالت کی وہ زنجیر اس کے پاؤں میں دوبارہ ڈال دی گئی تھی۔ زندگی کی سختیاں اس کے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

پھر وہی روز و شب تھے' لعنتوں اور نحوستوں' ڈھٹائیوں اور بے غیرتیوں کے مارے ہوئے بے حس روز و شب' سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اندھا اور سب کچھ سنتے ہوئے بھی بہرا بننا پڑتا تھا۔

اسکول کا اگلا سیشن شروع ہونے تک حفیظ گھر پر ہی رہا۔ وہ سارا سارا دن آوارہ گردی کرتا پھرتا اور گھر سے جاتے وقت کبھی بھی اپنی ماں کو نہ بتاتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بس چپکے سے غائب ہو جاتا اور پھر گھنٹوں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کی کتابیں اور کاپیاں وغیرہ گھر کے کونے میں پڑی رہتیں اور وہ انہیں کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ جس دن سے وہ ہوسٹل سے نکل کر گھر آیا تھا اس دن سے آج تک اس نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

سیشن شروع ہونے پر حمیداں نے بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد حفیظ کو ایک اسکول میں داخل کروا دیا لیکن اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلتا اور سارا دن غائب رہتا۔ حمیداں کو اس کے بارے میں خبریں ملتی رہتی تھیں اور وہ خود بھی اس پر سختی کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن کچھ فائدہ نہ تھا۔

حمیداں کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ برابر نشے کے سگریٹ پیتا ہے۔ کئی لوگوں نے اسے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ نہ پیسے ہوں گے نہ نشے کے سگریٹ خریدے گا لیکن وہ نیلم کا لاڈلا تھا۔ جب حمیداں نے اس کا جیب خرچ بند کر دیا تو اس نے نیلم سے پیسے لینے شروع کر دیئے اور نیلم اسے حمیداں سے چرا چھپا کر پیسے دیتی رہتی۔

"خدا کے لئے اسے پیسے مت دیا کرو۔" حمیداں نے بڑے دردناک انداز میں احتجاج کیا۔ "وہ ان پیسوں سے نشہ کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تباہ کر لے گا۔"

"اے تو کیا پیسے پیسے کو ترساؤ گی اسے؟" نیلم اسے سرزنش کرتی۔ "کیا بالکل

کنگالوں کی طرح رہے گا وہ؟"

حمیداں کی اجاڑ زندگی میں سے دو سال کا عرصہ اور گزر گیا اور اس سارے عرصے کے دوران دکھوں کے خشک اور جھلسا دینے والے جھکڑ چلتے رہے۔ حفیظ نے اسکول جانا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا اور اب تو وہ زیادہ تر گھر سے غائب رہتا تھا۔ دن کو بھی اور راتوں کو بھی۔ بلکہ اب تو زیادہ تر راتیں وہ گھر سے باہر ہی گزارتا تھا۔ خدا معلوم کہاں کہاں گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ حمیداں آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی لیکن کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اور پھر ایک دن نیلم کا انتقال ہو گیا۔ وہ بس بیٹھے ہی بیٹھے چل بسی۔ نیلم کی موت نے حمیداں کو ہلا کر رکھ دیا۔ گزرتے ہوئے وقت کا احساس بہت قاتل تھا۔ ہر چیز کی عمر بڑھ رہی تھی۔ حمیداں کے اردگرد ہر چیز بوڑھی ہو رہی تھی۔ وہ خود بھی بوڑھی ہو رہی تھی۔

اس رات حمیداں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ آج اس کے ساتھ کوئی گاہک نہیں تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ گاہک اس کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے تھے لیکن اب تو کتنی ہی راتیں خالی جاتی تھیں' خضاب سے رنگے ہوئے بالوں کی سفید سفید جڑیں ڈھلتی ہوئی عمر کی چغلی کھا رہی تھیں۔ چہرے کے بدلتے ہوئے نقوش اور ماند پڑتی ہوئی رنگت .... کس کس چیز کو چھپایا جاتا؟

حفیظ کوئی چار پانچ دن سے گھر نہیں آیا تھا۔ اب تو اس کا یہی وطیرہ تھا۔ کئی کئی دن کے لئے گھر سے غائب ہو جاتا تھا اور جب آتا تو پیسے مانگتا۔ اب نیلم تو زندہ تھی نہیں' جو اُسے چپکے سے پیسے دے دیتی۔ اب تو اسے ماں سے ہی پیسے مانگنے پڑتے تھے۔

"کچھ پیسے دے دو امی!" اچانک حفیظ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "آج تو جیب بالکل ہی خالی ہو گئی ہے۔"

حمیداں نے آنکھیں اٹھا کر حفیظ کو دیکھا اور اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"کیوں پیدا کیا تھا میں نے اسے؟ کیوں مری جا رہی تھی میں بچہ پیدا کرنے کے لئے؟ کاش میں نے اس وقت نیلم کی بات مان لی ہوتی۔ کتنا کتنا اس نے مجھے سمجھایا تھا کہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کر لوں' میرے دماغ پر تو بھوت سوار تھا۔ میں نے کسی کی سنی ہی نہیں اور اب میں .... اب اس کی سزا بھگت رہی ہوں اور جب تک زندہ ہوں' بھگتتی رہوں گی۔"

اس نے کڑی نگاہوں سے حفیظ کو گھورا۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے بھی میلے تھے۔

"تُو تھا کہاں اتنے دن سے؟" حمیداں نے غرا کر پوچھا۔ "کہاں رہ رہا تھا؟"

"کچھ دوستوں کے ساتھ شیخوپورہ گیا ہوا تھا۔" اس نے لاپرواہی کے ساتھ جواب دیا۔ "لاؤ پیسے دے دو' نیچے کچھ دوست انتظار کر رہے ہیں۔"

"کیا کرے گا پیسوں کا؟ نشے کے سگریٹ پیئے گا؟ نشہ کرے گا؟" حمیداں نے گرج کر کہا۔ "اس لئے تجھے پیسے چاہئیں؟ جا بھاگ جا یہاں سے' نہیں ہیں میرے پاس پیسے..........."

"نشہ نہیں کروں گا امی!" حفیظ کی آواز میں خوشامد کی جھلک تھی۔ "نشہ نہیں کروں گا۔ آخر اور خرچ بھی تو ہوتے ہیں۔ تم نے تو مجھے پیسے دینے ہی بند کر دیئے ہیں اور اب تو نانی بھی زندہ نہیں ہیں' ورنہ ان سے لے لیتا..........."

"تو جا کے نانی کی قبر پر فاتحہ پڑھ حرام زادے!" حمیداں نے پھنپھناتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس نہیں ہیں تیرے لئے پیسے' جا دفان ہو جا۔"

"اچھا ابھی تو کچھ دے دو امی!" حفیظ نے بھاری اور جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پھر نہیں مانگوں گا۔"

"آخر تُو کچھ کام دھندا کیوں نہیں کرتا؟" حمیداں نے کہا۔ "کتنا چاہا میں نے کہ تُو پڑھ لکھ لے مگر تُو نے تو اسکول پر لعنت بھیج دی۔ اب اگر پڑھتا نہیں تو کوئی کام دھندا ہی کر۔ نشہ کر کر کے مرجائے گا؟"

"پیسے دے دو امی!" حفیظ کی آواز کچھ اور بھاری ہو گئی تھی۔ اس کی سانس بھی بھاری ہو گئی تھی۔ "میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے پیسے دے دو........... میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ہے..........."

"اور میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔" حمیداں نے گرج کر کہا۔ "تُو نے کوئی خزانہ میرے پاس دھر دیا ہے جو مجھ سے پیسے مانگنے آ جاتا ہے۔ جا بھاگ جا یہاں سے۔"

"اچھا بھاگ جاؤں گا۔" حفیظ کے لہجے میں جھلاہٹ اور غصے کے ساتھ ساتھ خوشامد بھی شامل تھی۔ "چلا جاؤں گا۔ تم پیسے تو دے دو۔ زیادہ نہ دو' تھوڑے ہی دے دو۔"

"تاکہ تُو فوراً جا کے نشے کے سگریٹ پینا شروع کر دے۔" حمیداں نے غصے سے کہا۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی اور وہ سخت برہمی کے عالم میں تھی۔

"حرامی .... نشے باز........... جا دفع ہو جا یہاں سے..........."

اور پھر اچانک' بالکل اچانک حفیظ کے تیور بدل گئے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ آنکھیں

جیسے ابلنے لگیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے الگ ہو کر کانپنے لگے' نتھنے پھڑکنے لگے' نرخرہ پھول گیا اور ہاتھ پیر اینٹھنے لگے۔

اگلے ہی لمحے اس نے ایک وحشیانہ چھلانگ ماری اور حمیداں کی گردن کو دونوں ہاتھ میں دبوچ لیا۔

"ہاں' میں نشہ کرتا ہوں۔" اس نے اپنے جسم کی ساری قوت کے ساتھ حمیداں کے گلے کو اپنے دونوں ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔ "میں کرتا ہوں نشہ' میں ہوں نشہ باز .... تُو بھی تو کنجری ہے .... کنجری .... کنجری........."

اور وہ دیوانوں کی طرح' وحشی درندوں کی طرح اس کی گردن کو دبا رہا تھا اس کے منہ سے کف نکلنے لگا تھا اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

حمیداں بری طرح پھڑک رہی تھی اور جدوجہد کر رہی تھی' اذیت کے ان لمحات میں سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو کر کچھ عجب سا معاملہ بن گیا تھا۔ کیا وہ واقعی حفیظ تھا جو اس کی گردن دبا رہا تھا؟ یا کوئی اور تھا؟ حفیظ .... نہیں .... حفیظ .... نہیں تو ....

اس کا دم گھٹ رہا تھا اور گردن ٹوٹی جا رہی تھی۔ یہ شدید ترین اذیت کے لمحات تھے جن سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے وہ اپنے وجود کی آخری توانائیوں تک کو استعمال کر رہی تھی لیکن وہ جو اس کے درپئے آزار تھا وہ بھی تو اس کے اپنے وجود کا حصہ تھا۔

حمیداں کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ ساری زندگی طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتے ہوئے گزری تھی لیکن یہ آخری لمحوں کی اذیت' یہ تو انتہائی درجے کی اذیت تھی۔

ہاں وہ حفیظ تھا .... اس کا اپنا حفیظ .... اس کا اپنا بیٹا .... اور زندگی کی یہ آخری اذیت سب سے زیادہ دہشتناک اور ناقابل برداشت اذیت تھی۔ اس کا اپنا بیٹا اسے قتل کر رہا تھا۔

اس نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن حفیظ پر تو بھوت سوار ہو گیا تھا۔ وہ اندھا اور بہرا ہو گیا تھا۔ وہ نہ تو کچھ دیکھ رہا تھا' نہ سن رہا تھا۔ وہ صرف اپنے ہاتھوں کے دباؤ میں مسلسل اضافہ کئے جا رہا تھا۔

حمیداں کے حلق سے اب گھٹی گھٹی' حیوانی غراہٹوں جیسی آواز نکل رہی تھی اور اس کی جدوجہد کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اس وقت تاجی اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے اپنی آنکھوں سے وہ ناقابل یقین منظر دیکھا۔

حفیظ حمیداں کے سینے پر سوار دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ شدید غیظ

و غضب کے عالم میں اس کا دہانہ چیر کر پھیلا ہوا تھا' دانت بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔

حمیداں کی مزاحمت اپنے آخری مراحل میں تھی اور پھر یہ مزاحمت اچانک ختم ہو گئی۔ حمیداں اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گئی۔

تاجی کے حلق سے نکلنے والی بھیانک چیخ سن کر حفیظ جیسے اپنے ہوش میں آ گیا۔ اس کے ٹوٹ جانے کی حد تک تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اچھل کر اپنی ماں کے جسم کے اوپر سے اتر آیا۔ اس کے غیظ و غضب کے عالم میں مسخ شدہ چہرے پر اچانک ایک خوف اور ہیبت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آگ اگلتی ہوئی آنکھیں ایک دم گدلی گدلی ہو گئیں اور ٹیڑھے ہوتے ہوئے ہاتھ پیر خود بخود سیدھے ہو گئے۔ اس نے دھندلی دھندلی نظروں سے اس منظر کو دیکھا کیونکہ اس کے اردگرد سب کچھ دھندلا رہا تھا۔ اس کی ماں پلنگ پر بے سدھ پڑی تھی اور تاجی دہشت زدہ اس کے پاس کھڑی ہوئی زور زور سے چیخ رہی تھی۔

حفیظ ایک چھلانگ مار کر کمرے سے باہر نکل کر تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

حمیداں کی مردہ آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت تھی۔ زندگی کی آخری خواہش بھی ایک حسرت ناکام ہی بن کر رہ گئی تھی۔ جب کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا تھا' کوئی اسے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر رہا تھا تو اس نے یہ آرزو کی تھی کہ وہ حفیظ نہ ہو' اس کا گلا گھونٹنے والا حفیظ نہ ہو لیکن یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔ آخری لمحات میں اسے یہ یقین کر لینا پڑا کہ ہاں وہ حفیظ ہی تھا۔ اس کا اپنا بیٹا' سگا بیٹا' حفیظ اور پھر اس نے اپنے آپ کو حفیظ کے ہاتھوں قتل ہو جانے دیا اور اس کے کانوں نے حفیظ کی زبان سے نکلنے والا جو آخری لفظ سنا تھا' وہ تھا کنجری اور پھر اسی لفظ کی گونج میں اس کی نبضیں ڈوب گئیں۔

☆======☆======☆

اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حمیداں کو مرے ہوئے پورا ایک سال گزر چکا تھا۔

لاہور سے دور راولپنڈی کے نواح میں واقع سکندر پور نامی گاؤں کے قبرستان میں کرمو نے پھاوڑا ہاتھ سے پھینکا اور اپنے ہاتھ سے ماتھے پر بہتے ہوئے پسینے کو پونچھنے لگا۔

قبر اب تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ کرمو کا بیٹا فضلو بیلچے سے جلدی جلدی مٹی نکال کر باہر ڈال رہا تھا۔

"جلدی کر فضلو جلدی کر۔" کرمو نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "وہاں اب میت تیار ہے۔"

تھوڑی دیر میں اندھیرا ہونے والا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے میت کو دفن کر دیں۔"

"فکر نہ کر بابا!" فضلو نے بیلچہ بھر مٹی باہر ڈالتے ہوئے کہا۔ "بس ذرا سی دیر ہے' قبر تو تیار سمجھو۔ اللہ نے چاہا تو اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہی قبر تیار ہو جائے گی۔"

"اس گاؤں میں تو لوگوں کو مرنے پر بھی کچھ نہیں ملتا۔" کرمو نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "اور دوسری جگہوں پر دیکھو ایک موت ہوتی ہے تو گورکنوں کو کتنی بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں۔ کئی ہفتوں کی چھٹی ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں .... یہاں تو دس موتیں بھی ہو جائیں تو کچھ نہ مل سکے گا۔"

"اپنی اپنی قسمت ہے بابا!" فضلو نے مٹی میں زور سے بیلچہ مارتے ہوئے کہا۔ "کہیں کے مُردے بڑے سخی داتا ہوتے ہیں۔ مر کر بھی دوسروں کا خیال کر جاتے ہیں اور کہیں مُردے صرف گورکنوں کے ہاتھ کو تھکاتے ہیں۔ ہمارے حصے میں تو ایسے ہی مُردے آئے ہیں بابا!"

شام ہونے کو تھی' دن ڈھل رہا تھا اور قبرستان اور اس کے آس پاس کی فضا پر بڑی گہری سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ دھوپ نارنجی رنگ کی ہو کر بہت پژمردہ ہو چکی تھی اور اس میں خزاں کے کملائے ہوئے پھولوں اور پتیوں کی پھیکی اور اداس رنگت شامل ہو گئی تھی۔ قبرستان میں دور تک کچی پکی قبروں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا' ان میں پکی تو کم تھیں البتہ کچی زیادہ تھیں۔

پورے قبرستان میں ان دونوں گورکنوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا جو ایک قبر کھودنے میں مصروف تھے۔ مرنے والے کا نام احمد دین عرف احما تھا اور اس کا آج دوپہر کو ہی انتقال ہوا تھا۔

احما نے اپنے پیچھے دو اولادیں چھوڑی تھیں۔ اس کے بیٹے کا نام تاج دین تھا اور وہ تاجا کہلاتا تھا۔ تاجا سے کوئی ڈھائی سال بڑی ایک بہن تھی جس کی کافی عرصہ ہوا شادی ہو چکی تھی اور وہ کسی دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔

بڑی بُری زندگی بے چارے احما نے گزاری۔ اسے تو مرتے دم تک کوئی سکھ کا لمحہ نصیب نہ ہو سکا۔

برسوں پہلے' بہنوں کی شادی کے لئے جاگیردار سے قرض لیا تھا۔ جسے وہ ہزار کوشش کے باوجود ادا نہ کر سکا اور اس کے عوض جاگیردار نے اس سے اس کی زمین چھین لی۔ احمے کے پاس ذرا سا قطعہ اراضی ہی تو تھا جو اس کی روزی کا سہارا تھا' یہ ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر وہ ایک بے زمین کھیت مزدور بن کر رہ گیا۔ جاگیردار کی زمینوں پر کام تو پہلے بھی کرتا تھا لیکن اس کے

ساتھ ہی اسے اپنی زمین پر محنت کرنے کی انمول خوشی بھی حاصل ہوتی تھی۔ اب وہ سب کچھ ختم ہو گیا اور وہ صرف کھیت مزدور بن کر رہ گیا اور وہ بھی اس طرح کہ اسے اپنے کام کے عوض کوئی اجرت نہیں ملتی تھی' کیونکہ یہ کام تو وہ قرضے کی ادائیگی میں کر رہا تھا۔ ملک صاحب کا اور ان کے منشی فضل دین کا کہنا تھا کہ قرضہ تو ابھی باقی ہے' اسے اپنے کام کے عوض گزارے بھر اناج اور دوسری اشیائے ضرورت مل جاتی تھیں' تاکہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے کنبے والوں کو زندہ رکھ سکے۔ اس کا کنبہ اس کے علاوہ ایک بوڑھی ماں اور دو بچوں پر مشتمل تھا۔

احمے کی بیوی نہیں تھی۔ اسے عورت کے نام سے نفرت تھی۔ اس کی بیوی حمیداں کو جاگیردار نے کام کے لئے دوسرے گاؤں میں واقع اپنی حویلی میں بلوا لیا تھا' تاکہ وہ کام کے ذریعے اپنے شوہر کے قرض کا بوجھ ہلکا کر سکے لیکن وہ حرافہ حویلی کے مالکان کے ڈرائیور رئیس کے ساتھ بھاگ گئی۔ دونوں رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے اور ایسے گئے کہ پھر ان کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ ملک صاحب نے دونوں کو بہت تلاش کروایا۔ دور دور تک بندے دوڑائے' پولیس میں رپورٹ لکھوائی لیکن ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

سکندر پور کے بچے بچے کو معلوم ہو گیا کہ اس کی بیوی حمیداں اپنے میاں اور دونوں بچوں کو چھوڑ کر' ملک عطاء اللہ کے ڈرائیور کے ساتھ کہیں فرار ہو گئی۔ دو بچوں کی ماں' آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔

اور وہ زندگی بھر بیل کی طرح کام کرتا رہا۔ اس کی زندگی میں کوئی چھٹی کا دن نہیں تھا' کوئی آرام کا دن نہیں تھا' بس کام کرتا تھا' رات دن کام اور پھر جیسے جیسے اس کا بیٹا بڑا ہوتا گیا' ویسے ویسے وہ بھی اس کے کام میں شامل ہوتا گیا اور اب باپ بیٹے دونوں مل کر قرضہ اتارنے کی جدوجہد میں شامل ہو گئے تھے۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا' وہ اور اس کا بیٹا تاجا حیوانی مشقت کے بوجھ تلے ہانپتے رہے اور مشقت کرتے رہے' مشقت کرتے رہے اور ہانپتے رہے۔

اور آج احما مر گیا تھا۔ بالکل اچانک' بس بیٹھے بٹھائے اس کے پیٹ میں درد اٹھا اور چند گھنٹے میں وہ چٹ پٹ ہو گیا اور اب اس کی قبر کھودی جا رہی تھی۔ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے اسے دفن کر دینا تھا۔

گاؤں کے مولوی صاحب گزشتہ دن ہی چند روز کے لئے شہر گئے تھے اور اپنی جگہ ایک اور مولوی صاحب کو چھوڑ گئے تھے جو اس گاؤں کے لئے نئے تھے اور ان دنوں گاؤں کی مسجد میں نماز یہی مولوی صاحب پڑھا رہے تھے۔ نماز جنازہ بھی انہی کو پڑھانی تھی۔

عصر کی نماز ہو چکی تھی اور اس کے بعد ہی مرنے والے کی نماز جنازہ بھی پڑھائی جا چکی تھی۔ بس قبر کے مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ کرمو اور اس کا بیٹا فضلو دونوں جلدی جلدی کام کر رہے تھے۔ اندھیرا ہونے سے قبل ہی میت کو دفنا دینا تھا۔

سامنے سے دو افراد آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ کرمو نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ مرنے والے کا بیٹا تاجا' نئے مولوی صاحب کے ساتھ ادھر آ رہا تھا۔ چند منٹ میں وہ دونوں وہاں آ گئے اور مولوی صاحب کھودی جانے والی قبر کا بغور معائنہ کرنے لگے۔

"ہاں' ہے تو ٹھیک ہی۔" مولوی صاحب نے تاجے کی طرف رخ کر کے کہا۔

"ارے' ٹھیک کیوں نہیں ہو گی مولوی صاحب!" کرمو نے اپنے بڑے بڑے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "ساری عمر گزری ہے قبریں کھودتے ہوئے۔ کیا اب بھی قبر کھودنا نہیں آئے گا؟"

مولوی صاحب آہستہ سے مسکرائے اور انہوں نے کرمو کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"بس جی' یہی آخری منزل ہوتی ہے انسان کی۔" مولوی صاحب نے قبرستان میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے اداسی کے ساتھ کہا اور پھر جیسے انہیں اچانک کوئی بات یاد آ گئی۔

"ارے تاجے۔" انہوں نے تاجے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تیری ماں نہیں ہے کیا؟ میں نے تیری ماں کو کہیں نہیں دیکھا؟" میت کو نہلانے اور کفنانے وغیرہ کا سارا کام مولوی صاحب کی ہی نگرانی میں ہوا تھا۔

"میری ماں.........." تاجا ایک دم چونک پڑا اور مولوی صاحب کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے انہوں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

ہاں بھئی' تیری ماں۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "اور کس کی ماں کی بات کر رہا ہوں؟ احمدے کی بیوہ۔"

"میری ماں۔" تاجے کے لہجے میں زہر گھل گیا۔ "میری ماں تو کنجری نکل گئی مولوی صاحب!" وہ ذرا سا رکا۔ "میں ڈیڑھ دو سال کا تھا جب وہ میرے باپ کو اور ہم دونوں بہن بھائی کو چھوڑ کر اپنے ایک آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ مولوی صاحب! تب سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ وہ تو کنجری تھی۔"

مولوی صاحب حیران ہو کر تاجے کی شکل دیکھنے لگے۔

☆======☆======☆

بجلی خانم

کراچی سینٹرل جیل میں 102 خواتین قید ہیں
بعض عورتوں کے ساتھ کمسن بچے بھی ہیں

کراچی (اسٹاف رپورٹر) کراچی سینٹرل جیل میں اس وقت 102 خواتین قید ہیں جن میں زیادہ تر تقریباً بنگلہ دیشی خواتین ہیں۔ ان میں سے بعض قیدی عورتوں کے ساتھ ان کے 20 کم سن بچے بھی ہیں۔ جن میں شیر خوار بچوں سے لے کر 9 سال تک کی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل ہیں۔ جیل میں قید پاکستانی خواتین کی اکثریت حدود آرڈیننس کے مقدمات کے تحت نظر بند ہے جبکہ بنگلہ دیشی خواتین کی اکثریت غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے کے الزام میں قید ہے۔ ان میں سے بعض' خواتین کے خلاف زنا حدود آرڈیننس کے تحت بھی مقدمات قائم کئے گئے ہیں ان میں سے بعض خواتین 9 سال سے جیل میں قید ہیں اور ان کے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں۔

ایک سروے کے مطابق ان قیدی عورتوں کی اکثریت غریب ہونے کی وجہ سے وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ وکلاء برائے انسانی حقوق و قانونی امداد نے ان میں سے بعض قیدی عورتوں کی مختلف عدالتوں سے ضمانتیں کرائی ہیں مگر ضامن نہ ہونے کی وجہ سے وہ ضمانتیں حاصل نہیں کر سکیں اور ضمانت ہو جانے کے باوجود جیل میں ہیں۔ حکومت کے ویمن ڈویژن نے ایسی خواتین کی قانونی مدد کے لئے ایک لیگل ایڈ کمیٹی قائم کی تھی تاہم اس کمیٹی نے کراچی میں اس سلسلے میں ابھی تک کوئی کام نہیں کیا۔ سروے کے مطابق زنا آرڈیننس کے تحت نظر بند عورتوں' خصوصاً لڑکیوں کی ضمانت اس لئے نہیں ہو پاتی کہ ان کے اہل خانہ یا شوہر

ان کی گرفتاری کے بعد ان سے ہر قسم کا ناطہ توڑ لیتے ہیں اور ان کی ضمانت لینا تو درکنار' ان سے جیل میں ملنے کے لئے بھی نہیں آتے۔ کئی سال تک جیل میں رہنے کے بعد وہ پولیس کے دلالوں کی معرفت ضمانت پر رہا ہو کر ان کی داشتہ بن جاتی ہیں۔ جہاں تک بنگلہ دیشی عورتوں کا تعلق ہے تو انہیں ایجنٹ غیر قانونی طور پر بنگلہ دیش سے لے کر آتے ہیں۔ ان ایجنٹوں کے علاوہ ان کا یہاں پاکستان میں کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہوتا جو ان کی ضمانت لے سکے۔ یہ ایجنٹ اس شرط پر ان کی ضمانت لینے کی ہامی بھرتے ہیں کہ وہ رہا ہونے کے بعد ان کے کہنے پر عمل کریں اور عصمت فروشی کا دھندہ اختیار کرلیں۔ یہ عورتیں کچھ عرصے تک مزاحمت کرتی ہیں پھر بعد میں ان ایجنٹوں کی شرائط پر ضمانت پر رہائی قبول کرلیتی ہیں۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی - 3 جنوری 1990ء)

خبر تو آپ نے پڑھ لی اور یہ خبر اپنے اندر کم از کم ایک سو دو داستانوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور پھر ان ایک سو دو داستانوں سے وابستہ جو دوسرے بہت سارے کردار ہوں گے' ان کی بھی اپنی الگ الگ داستانیں ہوں گی۔ کتنی داستانیں ہیں' بے شمار' ان گنت' ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ آوازیں دیتی ہوئی' ہمیں اپنی طرف بلاتی ہوئی' اپنے آپ کو ہم سے چھپائے ہوئے بھی اور ہم پر منکشف ہونے کے لئے آمادہ بھی۔

میں آپ کو یہ ساری کی ساری ایک سو دو داستانیں تو نہیں سنا سکتا۔ شاید کبھی موقعہ ملے تو ان میں سے کوئی ایک آدھ کہانی اور آپ کے گوش گزار کر دوں۔ فی الوقت تو میں آپ کو ان ایک سو دو کہانیوں میں سے صرف ایک کہانی سناؤں گا۔

یہ بجلی خانم کی کہانی ہے .... لیکن تب اس کا نام بجلی خانم نہیں تھا۔

اس کا اصل نام تو ماجدہ تھا لیکن ماجدہ اسے شاید ہی کوئی کہتا ہو گا۔ سب لوگ اسے بجی کہتے تھے۔

برسوں پہلے کی بات ہے' جب نارتھ ناظم آباد اور نیو کراچی میں آبادی کم تھی اور بہت سارے بڑے بڑے پلاٹ' جو سرکاری' نیم سرکاری' بلدیاتی یا نجی ملکیت کے تھے' خالی پڑے ہوئے تھے لیکن خالی نہیں تھے۔ ان پلاٹوں پر کچی بستیاں موجود تھیں۔ ایسی کچی بستیاں جو کراچی کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک' سینکڑوں کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں اور جہاں لاکھوں انسان زندگی کے دکھ بٹورتے اور سکھ کی تلاش میں بھاگ بھاگ کر ہانپتے نظر آتے ہیں۔

نارتھ ناظم آباد اور نیو کراچی کے درمیان ایسے ہی ایک بہت بڑے سے میدان میں' جو کئی ایکڑ پر مشتمل تھا' ایک وسیع و عریض کچی بستی آباد تھی۔ اس کو مکمل طور پر کچی بستی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں سارے مکانات کچے نہیں تھے۔ یہاں بہت سارے پکے مکانات بھی موجود تھے اور کچھ مکانات تو ایسے بھی تھے جن کے مکینوں نے باقاعدہ آر سی سی کی چھتیں بھی ڈلوا لی تھیں۔ ویسے زیادہ تر مکانات تو ایسے تھے جن کی دیواریں

سیمنٹ اور ریت کے بلاکوں کی بنی ہوئی تھیں اور چھتیں تو سیمنٹ کی چادروں کی تھیں' یا ٹین کی چادروں کی اور ان کے علاوہ چٹائی اور بانسوں کی جھگیاں بھی بڑی تعداد میں اس بستی میں موجود تھیں۔

پلاٹ تو کسی اور کا تھا لیکن فی الوقت اس پر ہزاروں انسانوں کی ایک "ناجائز" بستی موجود تھی۔ جو ایک طویل عرصے سے وہاں رہتے بستے چلے آرہے تھے۔

یہ چھوٹے چھوٹے' گھٹے ہوئے' تنگ و تاریک اور زندگی کی جملہ سہولتوں سے محروم مکانات ان ہزاروں مکینوں کے خاموش اور بے زبان رازداں تھے جنہیں ان کی دیواروں اور چھتوں نے پناہ دے رکھی تھی۔ پیدائش سے لے کر موت تک کے ہزاروں راز' ہر قسم کے راز' جن میں مسرت و آسودگی کی کم اور آلام و صدمات کی زیادہ آمیزش تھی' ان نیم تاریک مکانوں میں ابھرتے تھے' پیدا ہوتے تھے اور پھر وہیں دم توڑ دیتے تھے۔

جس دن سے یہ بستی آباد تھی' اس دن سے آج تک اس میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی' سوائے اس کے کہ جو زمین خالی تھی' اس پر بھی رہنے والوں نے کچے پکے مکانات تعمیر کر لئے تھے یا جھگیاں کھڑی کر لی تھیں اور اس طرح بستی کے پھیلاؤ اور اس کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی تبدیلی برسہا برس کے دوران یہاں رونما نہیں ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حرکت اور تبدیلی کا عمل اس بستی کی دہلیز تک آ کر رک جاتا ہے اور اندر قدم بڑھاتے ہوئے جھجکتا ہے' کچھ دیر تک مشتبہ انداز میں اندر جھانکتا رہتا ہے اور اس کے بعد خاموشی سے واپس چلا جاتا ہے۔

مکانوں اور جھگیوں کے دروازوں پر اسی طرح پھٹے پرانے ٹاٹ کے پردے لٹکے رہتے تھے۔ گلیوں میں آوارہ اور بدقماش کتوں کے غول اِدھر سے اُدھر دوڑیں لگایا کرتے' مکانوں کے دروازوں کے آگے بدبودار' سیاہ پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں میں طرح طرح کے کیڑے کلبلاتے رہتے اور یہاں کی ہوا ہر طرح کی بدبوؤں سے بوجھل' دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی' ایک مکان سے دوسرے مکان تک تیرتی ہوئی اور مزید بدبوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی' گزرتی چلی جاتی۔

اس بوجھل ہوا میں صرف بستی میں پھیلی ہوئی بدبوئیں ہی شامل نہیں ہوتی تھیں' اس میں انسانی زبان سے ٹپکنے والے طرح طرح کے زہر بھی شامل ہوتے تھے' وہ زہر جو مایوسی' محرومی' افسردگی' پسماندگی' جہالت اور افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جھلاہٹ' غصے' تندخوئی' بدخواہی' کمینگی' نفرت اور غیظ و غضب کے عالم میں ایک انسان کے

ہونٹوں سے ٹپکتے ہیں اور دوسرے انسان کے سینے میں اتر کر وہاں قہر آلود ہلاکت کی ایک نئی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔

بستی میں یہ سب کچھ ہی ہوتا رہتا تھا لیکن بستی والوں کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔ یہ سب کچھ جو ان کے اردگرد تھا' یہ ان کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ اس سب کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ انہیں اب اس میں کوئی چونکا دینے والی' کوئی لرزا دینے والی بات نظر نہیں آتی تھی۔ بس' زندگی ایسی ہی تو ہے اور شاید اسے ایسا ہی ہونا بھی ہے۔ اس سے مختلف زندگی کس قسم کی ہوتی ہے' ان کے تجربوں میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی۔

ماجدہ کا باپ ناظم آباد کے ایک ہوٹل میں تندور پر روٹیاں لگانے کا کام کرتا تھا اور اسے علی الصباح ہی گھر سے روانہ ہو جانا پڑتا تھا' کیونکہ روٹیاں لگانے سے پہلے تندور کی روزانہ کی صفائی اور تیاری وغیرہ کا کام بھی تو کرنا پڑتا تھا۔ اس کا نام عبدالشکور تھا۔

صبح ہوتے ہی ماجدہ کے گھر میں بیزاری' برہمی اور کدورتوں کی دھند میں لپٹی ہوئی آوازوں کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ شروع ہو جاتی جو بعض اوقات کچھ دیر کے بعد زیادہ شدت اختیار کر لیتی اور بعض اوقات ذرا ہی دیر بعد ختم ہو جاتی۔

ماجدہ کے گھر میں تقریباً ہر صبح کا آغاز جھگڑے سے ہی ہوتا تھا۔ یہ کوئی زور دار اور طوفانی قسم کے جھگڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ سب کچھ تو جیسے زندگی کے معمولات میں شامل ہو گیا تھا اور روزمرہ کی سرگرمیوں کا جزو بن گیا تھا۔ ابا کو جانے کی جلدی ہوتی تھی۔ تھوڑی سی دیر ہو جانے کی صورت میں بس کی لائن بہت لمبی ہو جاتی تھی اور پھر بہت دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اماں ناشتہ تیار کرنے میں ذرا سستی دکھاتیں تو ابا غرانے لگتے۔

"ارے کیا دوپہر کر دو گی چائے بنانے میں؟" ابا جھلاہٹ کے ساتھ کہتے۔ "اب تک تو مجھے بس اسٹاپ پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ کتنی دیر اور لگاؤ گی؟"

"ارے کر تو رہی ہوں اور کیا اپنے ہاتھ پیر جھونک دوں چولہے میں؟" اماں غرا کر جواب دیتیں اور ابا کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آتا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے اماں کو گھورتے اور جواب میں کچھ سخت سُست کہتے۔ اماں بھلا کہاں چپ رہنے والی تھیں۔ وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا جب تک کہ ابا گھر سے نکل نہ جاتے۔

ابا کے گھر سے چلے جانے کے بعد مجی کی باری آتی۔

"ارے اٹھے گی نہیں موت پیٹی۔" اماں اس کی کمر پر دوہتڑ مار کر چلاتیں۔ "یہ وقت ہونے کو آیا اور تُو ابھی تک سانڈنی کی طرح پڑی ہوئی سناہی ہے .... سو سو کے نیستی پھیلا رہی ہے منحوس .... آگ لگے تیری نیند کو .... اٹھ حرام خور.........."

دوسرے دوہتڑ سے پہلے ہی مجی اٹھ جاتی اور پھر گھر کے کام کاج کا ایک طویل اکتا دینے والا' بے کیف اور بوجھل سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس میں باہر سے بالٹیاں بھر بھر کر پانی لانا' گھر میں جھاڑو لگانا' برتن دھونا' مرغیوں کا ڈربہ کھول کر انہیں باہر نکالنا' بکری کو چارہ ڈالنا اس کا دودھ دوہنا اور اسی قسم کے درجنوں کام شامل تھے جنہیں کرتے کرتے اسے دوپہر ہو جاتی۔ اس دوران اماں باورچی خانے کا کچھ کام کرنے کے ساتھ ساتھ محلے میں پڑوس کے دو چار چکر بھی لگا آتیں اور بہت ساری خبروں سے لدی پھندی واپس گھر آتیں۔ کون سی لونڈیا کس لونڈے کے ساتھ آنکھ لڑا رہی ہے' شبن حلوائی نے کل اپنی بیوی کو اس بات پر کتنا مارا کہ وہ ایک نوجوان پھیری والے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ محلے کی کون سی ایسی خبر تھی جو اماں کو نہیں معلوم رہتی تھی اور پھر دوسری عورتوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بان کی کھری چارپائیوں پر بیٹھ کر' دھیرے دھیرے' سرگوشیوں میں وہ ساری باتیں ہوتی رہتی تھیں جو گھر میں کنواری لڑکیوں کی موجودگی میں باآواز بلند نہیں کی جا سکتی تھیں۔

رات کو ابا تھکے ماندے گھر آتے تو پھر وہ جلدی سو جاتے۔ وہ صرف صبح کا ناشتہ گھر پر کرتے تھے۔ دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا وہ اسی ہوٹل میں کھاتے تھے جہاں وہ کام کرتے تھے لیکن رات کے اس تھوڑے سے وقت میں بھی ابا اور اماں کے درمیان کچھ نہ کچھ لوٹ پلٹ ہوتی ہی رہتی تھی۔ مجی کو ہمیشہ ایسا لگا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے۔ وہ تو صرف ایک دوسرے کو بھگت رہے تھے۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنا ان کی مجبوری تھی' کیونکہ ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ایک بات اور بھی تھی جسے مجی نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ذرا سی تکلیف پر مضطرب بھی ہو جاتے تھے۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب اماں کو سخت بخار آیا تھا اور وہ تین دن تک نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی رہی تھی۔ تب ابا تین دن تک کام پر نہیں گئے تھے اور اس دوران انہوں نے کئی بار مجی کو اس بات پر بُری طرح مارا تھا کہ وہ ماں کے پاس بیٹھنے کے بجائے اِدھر اُدھر بھاگ گئی تھی۔ ابا سارا وقت اماں کے پلنگ کے پاس بیٹھے رہتے اور صرف ڈاکٹر کے پاس دوا لینے' یا

کوئی سودا سلف لینے باہر جاتے۔

اسی طرح جب ایک بار ابا کا ہاتھ تندور میں جل گیا تھا اور وہ کئی دن تک شدید تکلیف میں مبتلا رہے تھے تو اتنی ہی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ تکلیف میں خود اماں مبتلا رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ڈھیروں آنسو بہے تھے اور جب وہ ابا کے جلے ہوئے ہاتھ پر مرہم لگاتی تھیں تو ان کے ہاتھ اس قدر نزاکت اس قدر آہستگی اور احتیاط کے ساتھ چلتے تھے گویا وہ پھولوں کی بے حد نازک ڈالیوں کو چھو رہی ہوں اور ذرا سے دباؤ سے ان کے ٹوٹ کر بکھر جانے کا اندیشہ ہو۔ ہاں' اس گھرانے کے شب و روز میں یہ سب کچھ موجود تھا۔ تضادات سے بھرپور زندگی' پُرپیچ' ژولیدہ' یہاں ایسی ساعتیں بھی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ایسی ساعتیں بھی تھیں جب میاں بیوی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔

آسودگی اور طمانیت سے محروم زندگی کی تہہ در تہہ سلوٹوں میں خوشیوں کی تلاش کا عمل بہرحال جاری تھا اور بھاری سے بھاری' بوجھل سے بوجھل آلام سے بھرپور ساعتوں میں بھی اس عمل کی کوئی نہ کوئی جھلک نظر آ جاتی تھی' اگرچہ فضاؤں میں زہر گھلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اسی ماحول اور انہی فضاؤں میں مجی پلی بڑھی۔ تعلیم سے وہ تقریباً بے بہرہ تھی۔ ان کے علاقے میں اس وقت دور دور تک لڑکیوں کا کوئی اسکول نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو بھلا جانے کون دیتا؟ گھر کے کام کاج میں اماں کی مدد کون کرتا؟

خدا بھلا کرے محلے کی ایک استانی جی کا' وہ گھروں گھروں جا کر لڑکیوں کو اردو اور قرآن شریف پڑھا دیا کرتی تھیں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ کسی ایک گھر میں محلے کی چار پانچ لڑکیوں کو ایک ساتھ بلا لیتیں اور پھر ان کو اکٹھا پڑھا دیا کرتیں۔ مجی نے بھی ان استانی جی سے قرآن شریف پڑھنا اور معمولی اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ میلاد شریف پڑھ سکتی تھی۔ اسے میلاد شریف سننا اور پڑھنا بہت پسند تھا۔ میلاد اکبر کی کتنی ہی نعتیں اس نے سن سن کر زبانی یاد کر لی تھیں اور مناجات کے تو بہت سے شعر اسے یاد تھے۔ جب میلاد پڑھنے والیاں

مومنو! وقت رحمت رب ہے
اب وہ مانگو جو دل کا مطلب ہے

پڑھنا شروع کرتیں تو اس سے آگے کے شعر خود بخود مجی کی زبان پر آ جاتے۔

مجی کی شادی تو اسی وقت طے ہو گئی تھی جب اس کی عمر دس سال کی تھی اور اب وہ وقت قریب آ رہا تھا جب اس کی شادی ہو جاتی اور وہ رخصت ہو کر اپنی سسرال چلی جاتی۔

☆======☆======☆

"کیوں بے' تُو پھر گیا تھا رئیسہ کی طرف؟" عبدالصمد نے اپنے بیٹے عبدالرزاق کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے' دھاڑ کر کہا۔ اس کی آواز ایسی تھی کہ اس چھوٹے سے گھر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجتی چلی گئی۔

"نہیں تو ابا!" عبدالرزاق نے فوراً کہا۔ "مَیں .... مَیں رئیسہ کے پاس تو نہیں گیا تھا .... کسی نے.........."

"سالے اتنے جوتے ماروں گا کہ بھیجا پلپلا ہو جائے گا۔" عبدالصمد نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "ابے شرم نہیں آتی بے غیرت' وہ عمر میں تجھ سے ایک آدھ سال بڑی ہی ہو گی' ایک بچے کی ماں ہے اور تُو .... سالے بے حیا' بے غیرت' مجنوں کی اولاد بنا ہوا اس کے گھر کے چکر لگاتا ہے؟ یاد رکھنا سالے خاں' مار مار کے ساری مستی نکال دوں گا۔ میرے ساتھ کوئی حرامی پن نہیں چلے گا۔"

"ارے تم تو خواہ مخواہ گرم ہو رہے ہو ابا!" عبدالرزاق نے دفاعی انداز میں کہا۔ "میں کہہ تو رہا ہوں کہ میں وہاں.........."

"نہیں گیا تھا' ایں؟" عبدالصمد گرجا۔ "اور میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ یعقوب چچا نے خود تجھے رئیسہ کے گھر کے دروازے پر دستک دیتے اور پھر اندر جاتے دیکھا تھا۔ کہہ دے .... کہہ دے کہ وہ سفید بالوں والا بڈھا جھوٹ بول رہا تھا۔ اسے مجھ سے جھوٹ بول کر انعام ملے گا۔"

"تو اس گھر میں صرف رئیسہ تو نہیں رہتی ابا!" عبدالرزاق نے کہا۔ "آخر اور لوگ بھی تو رہتے ہیں۔ بلکہ اصل میں تو وہ رئیسہ کا گھر ہی نہیں ہے۔ وہ تو صابر بھائی کا گھر ہے۔ مَیں کوئی رئیسہ کے پاس تھوڑی گیا تھا' میں تو صابر بھائی.........."

"باپ لگتا ہے تیرا صابر؟" عبدالصمد دھاڑا۔ "کیوں گیا تھا تُو صابر کے گھر پر؟"

"وہ .... پرسوں شام کو ذرا دیر کے لئے سائیکل کرائے پر لی تھی۔" عبدالرزاق نے جلدی سے کہا۔ "اس کا کرایہ دینے گیا تھا۔"

"سالے مجھے اُلو بنانے چلا ہے؟" عبدالصمد نے اس کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا' لیکن عبدالرزاق جلدی سے ایک طرف کو ہو گیا۔ "اسے .... کرائے کے پیسے اس کی دکان پر جا کر نہیں دے سکتا تھا؟ اس کے لئے گھر جانا ضروری تھا؟"

"ارے چلو جانے دو۔" عبدالصمد کی بیوی اور عبدالرزاق کی ماں شاکرہ نے اپنے شوہر کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ "جب وہ کہہ رہا ہے کہ رئیسہ کے پاس نہیں گیا تھا' بلکہ اس کے بہنوئی صابر کے پاس گیا تھا تو پھر صابر کے پاس ہی گیا ہو گا' تم تو لٹھ لے کر ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔"

"ارے تم نہیں جانتی ہو اسے۔" عبدالصمد نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "اس سالے کی رگ رگ سے تو مَیں واقف ہوں' ایک نمبر کا حرامی ہے سالا' بہت مستی سوجھنے لگی ہے نامراد کو۔ ننگا کر کے اتنا ماروں گا کہ ساری بدمعاشی بھلا دوں گا۔"

ماں آڑے آئی تو عبدالرزاق کو موقع ملا اور وہ جلدی سے گھر سے باہر سٹک گیا۔ اب اسے اس وقت تک واپس نہیں آنا تھا جب تک کہ ابا سو نہ جائیں اور ابا تو کافی جلدی سو جاتے تھے۔

"ان بڑے چاچا یعقوب کو بھی دنیا کا اور کام نہیں ہے۔" گھر سے باہر نکل کر عبدالرزاق نے سخت ناگواری' کبیدگی اور اذیت کے ساتھ سوچا۔ "ہر وقت بس اسی تاک جھانک میں لگے رہتے ہیں کون کہاں آ رہا ہے' کہاں جا رہا ہے .... ہنھ.........."

کل پورے ایک ہفتے کے بعد تو وہ رئیسہ کے گھر گیا تھا۔ پچھلے ہفتے بھی جب وہ وہاں گیا تو ابا کو معلوم ہو گیا تھا اور انہوں نے اسے مارتے مارتے چھوڑا تھا اور ساتھ ہی تنبیہہ بھی کر دی تھی کہ آئندہ ادھر کا رخ نہ کرے ورنہ وہ اس کا حشر خراب کر دیں گے اور وہ ابا سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ نوجوان تھا' کام کرتا تھا' والدین پر بوجھ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس میں اتنی ہمت آج تک پیدا نہیں ہو سکی تھی کہ وہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا۔ باپ آج بھی اس پر اسی طرح حاوی تھا جس طرح بچپن اور لڑکپن میں حاوی رہا تھا اور آج بھی جب اس کے باپ کو چاچا یعقوب کے ذریعے اس کے گزشتہ روز رئیسہ کے گھر جانے کی خبر ملی اور باپ نے اس کو لعنت ملامت کی تو وہ صرف معذرت خواہانہ رویہ ہی اختیار کر سکا۔ اس کے اندر اتنی جرأت نہ تو تھی اور نہ ہو سکی کہ وہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہتا کہ "ہاں' میں رئیسہ کے گھر گیا تھا۔ میں رئیسہ سے ملنے اس کے گھر تھا' کیونکہ رئیسہ مجھے پسند ہے .... ہاں رئیسہ مجھے اچھی لگتی ہے اور

میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں.........." وہ اپنے باپ کے سامنے یہ الفاظ کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اگر وہ اس بارے میں سوچتا بھی تو اس کے سارے وجود پر ایک عجب قسم کی شرمساری سی طاری ہو جاتی' جیسے وہ کوئی جرم کر رہا ہو' ندامت کا ایک انجانا سا احساس اس کی روح کو بوجھل کر دیتا۔

عبدالصمد اور اس کا خاندان بھی اسی بستی کے ایک حصے میں رہتے تھے جس بستی کا ہم ابھی تفصیلی ذکر کر چکے ہیں۔

☆======☆======☆

صبح ہونے کے کچھ دیر کے بعد' گھر کے ضروری کاموں سے فرصت پاتے ہی نادرہ نے برقعہ سر پر رکھا اور سیدھی صابر حسین کے گھر کی راہ لی۔ یہ برقعہ بھی محض ایک تکلف تھا اور صرف اس لئے جسم پر ڈالا جاتا تھا کہ یہ لباس کا ایک حصہ بن چکا تھا اور اس کے بغیر گویا لباس مکمل نہیں ہوتا تھا۔ نادرہ کا منہ پورا کھلا ہوا تھا اور ہوا سے پھڑپھڑاتا ہوا برقعے کا بڑا حصہ اس کے جسم سے الگ ہو کر جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔

نادرہ' عبدالصمد کے پڑوس میں ہی رہتی تھی اور اس کا شوہر بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ آج کل وہ صبح ہی صبح اپنے اوزار سنبھال کر نکل جاتا تھا۔ فیڈرل بی ایریا میں بننے والے کسی بڑے سے مکان میں اسے لکڑی کا کام ملا ہوا تھا۔ نادرہ کے گھر میں اس کے شوہر کے علاوہ ایک بوڑھی نانی تھیں اور ایک بیمار ماموں۔ نانی اور ماموں پہلے نادرہ کی ماں کے ساتھ رہتے تھے لیکن ماں کے مرنے کے بعد نادرہ کے شوہر نے ان دونوں کو اپنے پاس ہی بلایا تھا اور وہ سب ایک ساتھ رہتے تھے۔ ماموں کے پاس اچھے خاصے پیسے تھے اور نادرہ کے میاں نے بڑی خوشی کے ساتھ انہیں اپنے پاس رکھا تھا۔

نادرہ اور رئیسہ میں بہت دوستی تھی۔ اگرچہ نادرہ رئیسہ سے عمر میں چند سال بڑی تھی لیکن دونوں کا برسوں پرانا ساتھ تھا' دونوں اسی بستی کی گلیوں میں کھیل کود کر جوان ہوئی تھیں اور پہلے نادرہ کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد رئیسہ کی شادی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی قابل اعتماد اور رازدار سہیلیاں تھیں اور دونوں کو ایک دوسرے کی ہر بات معلوم رہتی تھی۔

کل رات کو نادرہ نے عبدالصمد کے گھر میں ہونے والی گفتگو صاف طور پر سن لی تھی اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ایک دیوار بیچ تو گھر تھا اور دیواریں بھی کون سی اونچی اونچی تھیں۔ ایک طرف کوئی ذرا زور سے چھینکتا یا کھانستا بھی تھا تو دوسری طرف

اس کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

نادرہ نے عبدالصمد اور اس کے بیٹے عبدالرزاق کے درمیان ہونے والی گفتگو نیز عبدالرزاق کی ماں کی باتیں' سب کچھ سنا تھا اور اس کا جی چاہا تھا کہ پیر سے جوتی اتار کر عبدالرزاق کے سر پر اتنی جوتیاں لگائے' اتنی جوتیاں لگائے کہ اس نامراد ہیجڑے کا دماغ درست ہو جائے۔ یہ بھی کوئی آدمی تھا۔ آخ تھو۔

اور اب وہ گزشتہ رات کی اس گفتگو سے رئیسہ کو آگاہ کرنے کے لئے بے چین تھی۔

وہ جب رئیسہ کے گھر پہنچی' جو دراصل رئیسہ کی بڑی بہن حنیفہ اور اس کے شوہر صابر حسین کا گھر تھا' تو صابر حسین اسے گھر سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔

"السلام علیکم صابر بھائی!" اس نے صابر کو دیکھ کر کہا۔ "کیا دکان جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔" صابر حسین نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "دکان جا رہا ہوں اور تم آج یہ صبح ہی صبح کہاں نکل پڑیں؟"

"میں ذرا رئیسہ کے پاس آئی تھی۔" نادرہ نے کہا۔ "ایک سویٹر کا نمونہ پوچھنا تھا۔"

"اچھا.......... اچھا.......... جاؤ۔" صابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رئیسہ گھر پر ہی ہے' وہ بے چاری کہاں جائے گی۔"

صابر حسین چلا گیا اور نادرہ گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی اسے رئیسہ کی بڑی بہن حنیفہ نظر آئی اور ان دونوں کے درمیان سلام دعا ہوئی۔ اسی وقت رئیسہ بھی ایک طرف سے نکل کر سامنے آ گئی۔

"کون ہے؟" رئیسہ کسی کے بولنے کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

"ارے تم ہو نادرہ! آج تو تم بڑے سویرے سویرے نکل پڑیں' خیریت تو ہے؟"

"ابھی صابر بھائی دروازے پر ملے تھے۔" نادرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "انہیں بھی اس بات پر تعجب ہوا تھا کہ میں صبح صبح کہاں نکل پڑی اور اب تم بھی یہی بات کہہ رہی ہو۔ بھئی' کوئی ایسی صبح بھی نہیں ہے' اب تو آدھی دنیا اپنے اپنے کام پر جا چکی ہے۔ میں خود گھر کا کتنا بہت سا کام نمٹا کر آ رہی ہوں۔"

"اچھا.......... اچھا آؤ.......... میرے ساتھ آؤ۔" اور رئیسہ اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئی۔

"آیا تھا وہ پرسوں یہاں؟" کمرے میں جاتے ہی نادرہ نے رازدارانہ انداز میں رئیسہ سے پوچھا۔

"ہاں' آیا تھا۔" رئیسہ نے فوراً کہا اور حیرت سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "مگر تم کو کیسے معلوم؟"

"کل رات کو اسے خوب گالیاں پڑیں۔" نادرہ نے کہا اور گزشتہ رات کی ساری گفتگو سے اسے آگاہ کیا۔ "مَیں تو اسی طرف تھی اور وہ لوگ اپنے گھر کے آنگن میں تھے۔ عبدالصمد نے اسے خوب لتاڑا۔ بہت بُرا بھلا کہا اور بار بار یہ کہا کہ جوتے مار مار کر اس کا دماغ درست کر دے گا .... یعقوب چاچا نے عبدالصمد کو بتایا تھا کہ وہ پرسوں یہاں آیا تھا۔ عجیب ہیں یہ بڑے میاں بھی۔ آخران کو اِدھر کی اُدھر لگانے کی کیا پڑی رہتی ہے؟"

"بڑھاپے میں آدمی کو اس قسم کے کاموں کے علاوہ اور کام ہی کیا رہ جاتا ہے؟" رئیسہ نے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "لیکن ان کی بات کو چھوڑو' وہ نہ بتاتے تو کوئی اور بتا دیتا۔ عبدالصمد کو معلوم تو ہو جاتا نا؟ کوئی ڈھکی چھپی بات تو تھی نہیں۔"

"کیا کہتا تھا؟" نادرہ نے پوچھا۔ "تم سے تنہائی میں کچھ بات ہوئی؟"

"میں نے تو زیادہ موقع نہیں دیا۔" رئیسہ نے کہا۔ "لیکن وہ خود ہی گھس آیا میرے کمرے میں .... وہی اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گیا .... ابا نہیں مانتے .... اماں نہیں مانتیں .... کوئی نہیں مانتا .... سخت پریشان ہوں کیا کروں .... تمہارے بغیر رہ بھی نہیں سکتا .... تم سے دور رہ کر زندہ بھی نہیں رہ سکتا .... وغیرہ وغیرہ۔"

"میں کہتی ہوں تم اسے آنے کیوں دیتی ہو؟" نادرہ نے چڑ کر کہا۔ "ایسے آدمی سے تو بات ہی مت کرو .... کسی کام کا نہیں ہے' ایسا آدمی۔ مجھے تو اس سے کوئی امید نہیں ہے۔"

"مجھے بھی کوئی امید نہیں ہے۔" رئیسہ نے تھکے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔ "پہلے بھی مجھے کوئی خاص امید نہیں تھی اور اب تو بالکل بھی امید نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں گھر پر آئے لیکن آپا اور صابر بھائی اسے آنے دیتے ہیں۔"

"وہ شاید ابھی تک پُرامید ہیں؟" نادرہ نے کہا۔

"ہاں نادرہ!" رئیسہ نے کہا۔ "وہ ابھی تک پُرامید ہیں اور یہ آس لگائے بیٹھے ہیں

کہ عبدالرزاق میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکے۔ ان لوگوں کی دلی خواہش یہی ہے کہ یہ معاملہ بن جائے۔ مگر معاملے صرف خواہشوں سے تو نہیں بنتے نا نادرہ! میں آپا اور صابر بھائی کی مشکل کو سمجھتی ہوں .... میں ہوں میرا بچہ ہے .... ہم دو فالتو آدمی اس گھر میں رہ رہے ہیں۔ آپا اور صابر بھائی کے بوجھ میں تو اضافہ ہوا ہے لیکن وہ مجبور ہیں۔ اس بوجھ کو اٹھا کر پھینک بھی تو نہیں سکتے .... اسی لئے ان کی خواہش بھی ہے اور کوشش بھی کہ میرا کہیں ٹھور ٹھکانہ ہو جائے اور میں ان کے گھر سے چلی جاؤں .... اس لئے وہ اس کو گھر میں آنے جانے سے بھی نہیں روکتے .... گو کہ میں بار بار آپا کو بتا چکی ہوں کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے مگر وہ لوگ اگر اپنے آپ کو دھوکہ دینے پر تلے بیٹھے ہیں تو پھر بھلا میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"وہ کچی مٹی کا بنا ہوا آدمی ہے رئیسہ!" نادرہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "بارش کا ایک معمولی سا چھینٹا بھی برداشت نہیں کر سکے گا اور بہہ جائے گا۔ اس پر بھروسہ مت کرنا۔ میں خاص طور سے تم کو یہی بتانے کے لئے آئی تھی کہ کل رات کو بھی اپنے باپ کے آگے وہ کیسا بکری کی طرح منمنا رہا تھا۔"

"وہ صرف منمناتا ہی ہے نادرہ!" رئیسہ نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں میرے سامنے منمناتا ہے اور وہاں اپنے ماں باپ کے سامنے منمناتا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ خدا نے اسے انسان کے بجائے بکری بنایا ہوتا۔"

نادرہ کو ہنسی نہیں آئی۔ رئیسہ کو بھی اپنی بات پر ہنسی نہیں آئی۔ اس نے یہ الفاظ مضحکہ خیز انداز میں نہیں' بلکہ گہری افسردگی کے ساتھ' صدمے سے بوجھل اور درد میں بھیگی ہوئی آواز میں کہے تھے جس میں ناکام آرزوؤں کی مدھم مدھم سرسراہٹ بھی شامل تھی۔

"لینا دینا کچھ نہیں اور خواہ مخواہ کے لئے تمہاری بدنامی ہو رہی ہے۔" نادرہ نے کہا۔ "ایسے آدمی کے پیچھے خوار ہونے سے کیا فائدہ؟"

"میں آج آپا سے بات کروں گی۔" رئیسہ نے کہا۔ "ان سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اس کو گھر میں نہ آنے دیا کریں اور میں اگر ان پر اتنی ہی بوجھ بن گئی ہوں تو میں بنّو خالہ کے پاس لانڈھی ...."

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو رئیسہ!" نادرہ نے اسے ڈانٹا۔ "آپا اور صابر بھائی سے ایسی کوئی بات نہ کہنا۔ انہیں بہت تکلیف ہوگی' وہ اگر تمہارے لئے کچھ سوچ رہے ہیں تو

اس میں صرف ان ہی کی نہیں، تمہاری غرض بھی تو شامل ہے۔ بلکہ تم ان سے کچھ مت کہو۔ میں خود ہی آپا سے بات کرتی ہوں۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ کل رات کو ان لوگوں کے گھر میں کیا کیا باتیں ہوتی رہی تھیں اور عبدالصمد نے اپنے بیٹے کو کیا کچھ کہا ہے۔"

"انہیں یہ ضرور بتانا کہ جواب میں عبدالرزاق نے اپنے باپ سے کیا کہا۔" رئیسہ نے ایک بے جان اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں انہیں سب کچھ بتاؤں گی۔" نادرہ نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ میں اب ذرا ان ہی کے پاس جا رہی ہوں۔ کچھ دیر وہیں رہوں گی اور ان سے باتیں کروں گی۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ رئیسہ کے پاس سے اٹھ کر اس کی بڑی بہن حنیفہ کے پاس چلی گئی جو دوسرے کمرے میں موجود تھی۔ رئیسہ اپنے کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو چارپائی پر گرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

☆======☆======☆

رئیسہ کو اپنی ماں کی شکل واضح طور پر یاد نہیں تھی، بس ایک ہلکی سی شبیہہ تھی، جو بڑی کوشش کے بعد ذہن کے پردے پر ابھرتی تھی .... ہلکی سانولی رنگت اور گول چہرے والی ایک عورت، جس کے بھرے بھرے گالوں کے اوپر اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی لیکن بے حد چمکدار اور روشن روشن معلوم ہوتی تھیں اور شاید .... شاید اس کا دہانہ چھوٹا سا تھا .... اس کے علاوہ اسے اپنی ماں کے بارے میں اور کچھ نہیں یاد تھا۔

ہاں، ایک منظر اسے بہت اچھی طرح یاد تھا۔ اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور چٹائیوں کی چھت والے ایک کمرے میں بچھے ہوئے لکڑی کے تخت پر ایک لاش رکھی ہوئی تھی جو سر سے پاؤں تک سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ منظر رئیسہ کے ذہن پر ایسی شدت اور گہرائی کے ساتھ مرتسم ہوا تھا کہ آج تک جوں کا توں برقرار تھا۔ سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی، تخت پر پڑی ہوئی ایک لاش .... چٹائیوں کی چھت والا کمرہ جس کی دیواریں بھی چٹائیوں اور بانسوں کی بنی ہوئی تھیں۔ باہر سے بوندوں کے گرنے کی آواز آ رہی تھی اور کوئی کہہ رہا تھا .... "دفنانے میں جلدی کرنا چاہئے، کہیں بارش نہ آ جائے۔"

رئیسہ نے جب ہوش سنبھالا تو جس ہستی کو اپنے سب سے زیادہ قریب پایا وہ اس کی بڑی بہن حنیفہ تھی جو عمر میں اس سے کوئی دس سال بڑی تھی۔ ابا تو نہ جانے کب کے مر کھپ گئے تھے۔ اماں بھی اس وقت اس دنیا سے چل بسیں جب رئیسہ بالکل نا سمجھ

تھی۔

رئیسہ اور حنیفہ کے سگے چچا چچی نے دونوں لڑکیوں کی اس وقت تک پرورش کی جب تک کہ حنیفہ کی شادی نہیں ہو گئی۔ چچا چچی نے حنیفہ کے لئے ایک اچھا رشتہ تلاش کیا تھا۔ اس نوجوان کا نام صابر حسین تھا اور وہ سائیکلوں کی مرمت کی ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ کھانے بھر کے پیسے تو نکل ہی آتے تھے۔

اور پھر جب صابر اور حنیفہ کی شادی ہو گئی اور حنیفہ رخصت ہو کر اپنے شوہر صابر حسین کے گھر اسی بستی میں آ گئی تو اس کے کچھ عرصے کے بعد رئیسہ کو بھی حنیفہ نے اپنے ہی پاس بلا لیا۔ اس کے شوہر صابر حسین کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صابر حسین کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ان دونوں بہنوں کا ان چچا چچی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور وہ دونوں اب عنقریب کوئٹہ جانے والے تھے جہاں ان کا داماد ریلوے میں ملازم تھا اور اُس کا اصرار تھا کہ وہ دونوں کوئٹہ چلے آئیں، جہاں ان لوگوں کے پاس بہت بڑا گھر تھا اور ساری سہولتیں موجود تھیں۔

چنانچہ رئیسہ، اپنی بہن حنیفہ کے گھر آ گئی۔ جدائی کے ایک قدرے مختصر سے عرصے کے بعد دونوں بہنیں ایک بار پھر آپس میں مل گئی تھیں اور ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہی تھیں لیکن قدرے بدلے ہوئے حالات میں، اب وہاں ایک نیا چہرہ بھی موجود تھا، صابر حسین کا چہرہ اور دو چہرے درمیان میں سے غائب ہو گئے تھے .... چچا اور چچی کے چہرے۔

یہ زندگی کا ایک نیا رنگ تھا جو اپنے ساتھ نئی امنگ بھی لایا تھا۔ رئیسہ اپنی بہن اور بہنوئی کے درمیان گہری محبت کو دیکھتی اور اس سے خوش ہوتی۔ صابر حسین بہت غریب تھا، اس کی آمدنی بہت محدود تھی لیکن اس کے باوجود وہ حنیفہ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور حنیفہ بھی خوش رہنے کی کوشش کرتی تھی اور ان دونوں کو خوش دیکھ کر رئیسہ بھی خوش رہتی تھی جو بھی روکھی سوکھی میسر تھی وہ تینوں مل کر اس میں شریک ہوتے تھے۔

"بس کسی طرح خدا مجھے اتنا دے دے کہ میں سائیکلوں کی مرمت کی اپنی دکان کھول لوں۔" صابر حسین اکثر گہری آرزومندی کے ساتھ کہتا۔ "کام تو مجھے ایسا آتا ہے کہ اچھے اچھے میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بھلا سائیکل کا کون سا کام ایسا ہے جس سے میں پوری طرح واقف نہ ہوں لیکن مشکل یہ ہے اپنی دکان نہیں ہے۔ آج اگر اپنی دکان ہوتی تو چوگنی کمائی ہوتی۔"

"اللہ نے چاہا تو دکان بھی اپنی ہو جائے گی۔" حنیفہ اس کے جواب میں کہتی لیکن اس نے اپنے شوہر کی صرف زبانی حوصلہ افزائی پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ اس نے عملی طور پر بھی اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔

عورتوں اور وہ بھی خاص طور سے اَن پڑھ عورتوں کے لئے روزی کمانے کے ذرائع کس قدر محدود اور مختصر ہیں۔ اس کا حقیقی اندازہ حنیفہ کو اس وقت ہوا جب اس نے سنجیدگی کے ساتھ کچھ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ جھاڑو برتن' گھروں میں ماما گیری' آیا گیری' اوپر کے کام اور انہی جیسی چیزوں کے علاوہ اور کیا رکھا تھا لیکن حنیفہ اس قسم کا کوئی کام نہ تو کرنا چاہتا تھی اور نہ اس کا شوہر اسے اس کی اجازت دیتا' چنانچہ کافی سوچ بچار اور تلاش و جستجو کے بعد اس نے کپڑے سینے کا کام شروع کیا اور اس کام میں جلد ہی اسے اچھے خاصے پیسے ملنے لگے۔ ناظم آباد کے ایک درزی سے اس کا باقاعدہ معاہدہ ہو گیا اور وہ حنیفہ کو مردانہ اور زنانہ کُرتے اور دوسرے کپڑے سینے کے لئے دینے لگا۔ کچھ اپنے محلے سے بھی کام اسے مل جاتا تھا۔

پیسے اگرچہ کم تھے لیکن بہرحال تھے اور حنیفہ ایک ایک پائی بچاتی رہی تھی۔ گھر کا خرچہ اس نے اسی طرح چلایا جس طرح کہ پہلے چلتا تھا اور اپنی کمائی کا ایک پیسہ بھی گھر کے کاموں میں خرچ نہیں ہونے دیا۔ وہ اس ساری کی ساری رقم کو بڑی حفاظت اور احتیاط کے ساتھ جمع کر رہی تھی۔ اس کی یہ جان توڑ جدوجہد کئی برس تک جاری رہی۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب اس نے اپنے شوہر کو اس قابل بنا دیا کہ وہ خود اپنی سائیکلوں کی دکان کر سکے اور اس کامیابی میں صرف حنیفہ کا ہی حصہ نہیں تھا اس میں بہت کچھ حصہ رئیسہ کا بھی تھا۔ اگر بڑی بہن رئیسہ کا سہارا بنی تھی تو رئیسہ نے بھی بہن اور بہنوئی کے حالات کی بہتری اور استحکام میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ حنیفہ کے ساتھ مل کر کپڑے سلواتی تھی' برابر سے اس کی مدد کرتی تھی اور گھر کے دوسرے کام بھی کرتی تھی۔ حنیفہ کی گود میں چھوٹا بچہ بھی تھا۔ اس کے بھی ہزاروں کام ہوتے تھے۔ اگر رئیسہ کا ساتھ نہ ہوتا تو حنیفہ کے لئے یہ سب کچھ کر لینا اتنا آسان نہ ہوتا۔

ان تینوں کی زندگی میں وہ دن ایک اہم یادگار کی حیثیت رکھتا تھا جس دن صابر حسین نے سائیکلوں کی مرمت کی اپنی دکان قائم کر لی۔ یہ دکان اسی بستی کے ایک کونے پر تھی اور اوّل دن سے ہی ان کے لئے خوش قسمتی کا ستارہ بن گئی۔ صابر حسین واقعی سائیکلوں کے کام کا زبردست ماہر تھا اور جلد ہی اس کی دکان خوب چلنے لگی۔ اس کو بہت

کام ملنے لگا۔ لوگوں کے پاس سائیکلوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اسی تناسب سے صابر حسین کی دکان کے کام میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے اچھا کام جما لیا۔

گھر میں حنیفہ نے اپنا سلائی کا کام ترک نہیں کیا۔ رئیسہ کی مدد سے اسے اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ آرڈر کے خاصے کپڑے سی دیا کرے اور یوں حنیفہ بھی گھر کی آمدنی میں اضافہ کرتی رہی اور اس کے ساتھ ہی بالواسطہ طور پر رئیسہ بھی' جو سلائی کے کام میں حنیفہ کی مدد کرنے کے علاوہ گھر کا سارا کام کاج بھی سنبھالتی تھی جس کے نتیجے میں حنیفہ کو کچھ زیادہ وقت مل جاتا تھا۔

اس طرح اس مختصر سے خاندان نے اپنے حالات کو کافی بہتر بنا لیا۔ وہ اس بستی کے ان لوگوں میں شامل تھے جن کے مالی حالات اتنے زیادہ خراب نہیں تھے اور جو آسودگی کے ساتھ روٹی کھا سکتے تھے۔

رئیسہ بڑی ہوتی جا رہی تھی بلکہ بڑی ہو چکی تھی۔ وہ اب شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھی اور حنیفہ سے زیادہ خود صابر حسین کو اس کی فکر تھی۔ جوان لڑکی کو گھر میں رکھنا ایک مستقل بوجھ اور مسلسل آزمائش کے مترادف تھا۔ صابر حسین اس بوجھ کو جلد از جلد اتار کر سبکدوش ہو جانا چاہتا تھا اور آزادی کا سانس لینا چاہتا تھا۔

اگلے سال تک صابر حسین کی دکان اتنی زیادہ چلنے لگی کہ اسے دو لڑکے ملازم رکھنے پڑے۔ انہی میں سے ایک لڑکا نصیر نامی تھا۔

نصیر کے والدین عرصہ ہوا' فوت ہو چکے تھے اور وہ اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ رہتا تھا جو اس پیرانہ سالی کے باوجود گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیتی تھی۔ نصیر نے ساتویں جماعت تک تعلیم بھی پائی تھی اور وہ پہلے کسی دفتر میں چپڑاسی تھا لیکن پھر وہ دفتر ہی ختم ہو گیا اور نصیر کچھ دن تک اِدھر اُدھر بے روزگار گھومنے کے بعد ایک سائیکلوں کی دکان پر کام کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس نے سارا کام سیکھ لیا اور پورا کاریگر بن گیا۔ اس کو پیسے بھی اچھے خاصے ملنے لگے' جو اس کے اور دادی کے گزارے کے لئے کسی نہ کسی طرح کافی ہو جاتے تھے۔ زندگی کی گاڑی بہرطور کسی نہ کسی طرح گھسٹ ہی رہی تھی۔

صابر حسین کی دکان میں جب کام زیادہ بڑھا اور اسے اپنے علاوہ مزید کاریگروں کو دکان میں رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سب سے پہلے وہ نصیر کو اپنی دکان پر لے آیا۔ نصیر کو وہ پہلے سے بخوبی جانتا تھا اور اس کے کام سے بھی واقف تھا' اس نے نصیر کو اس کی

موجودہ اُجرت سے ڈیوڑھی اُجرت کی پیشکش کی اور نصیر بخوشی اس کے پاس آ گیا۔ نصیر کے بعد صابر حسین' محمد عالم نامی ایک اور لڑکے کو بھی اپنی دکان پر لے آیا اور ان دونوں لڑکوں کے آ جانے سے دکان خوب زور و شور سے چل پڑی۔ پہلے تو صابر حسین اکثر کام واپس کر دیا کرتا تھا کیونکہ اس کے پاس ٹائم نہیں ہوتا تھا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرتا تھا۔

دُکان گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور دونوں لڑکے' نصیر اور عالم' اکثر کسی نہ کسی کام سے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔

نصیر کو صابر حسین زیادہ پسند کرتا تھا اور اس پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ نصیر کی آمدورفت گھر میں زیادہ تھی اور پھر کچھ دنوں کے بعد تو یوں ہوا کہ دوپہر کا کھانا گھر سے لانے کی ڈیوٹی مستقل طور پر نصیر کی ہی لگ گئی۔ صابر حسین نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ تینوں کے لئے دوپہر کا کھانا گھر سے ہی منگواتا تھا اور اس طرح کافی سہولت ہو جاتی تھی۔

نوعمر رئیسہ نے جب شروع شروع میں نصیر کو دیکھا تو اسے دبلا پتلا' سبک ناک نقشے اور پھولے پھولے روکھے اور گھنے بالوں والا یہ لڑکا بڑا اچھا لگا۔ اس کی آنکھوں میں کیسی چمک اور کیسی نرمی تھی اور جب وہ اس کی طرف دیکھتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے نکلنے والی نرم اور میٹھی روشنی کی کرنیں سیدھی اس کے دل میں اترتی جا رہی ہیں۔ کتنا اچھا تھا وہ' ان میلے کپڑوں میں' پھٹے پرانے جوتوں میں تیل اور مٹی میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ' چہرے پر جابجا تیل اور مٹی کے سیاہ داغ دھبے لئے ہوئے وہ کتنا اچھا تھا.......... اس سارے میل کچیل اور خستہ حالی کے باوجود وہ رئیسہ کو .... کسی شہزادے کی طرح نفیس' خوبصورت' دلکش اور پیارا لگتا۔

یہ کون سا جذبہ تھا جو اس کے دل میں اس لڑکے کی جانب سے پیدا ہو رہا تھا' وہ کیوں چاہتی تھی کہ نصیر بار بار اس کی نظروں کے سامنے آئے اور وہ اس سے جی بھر کر باتیں کرے؟ اس کی نظریں دوپہر کو' کھانے کے وقت' دروازے پر کیوں لگی رہتی تھی اور اس کے کان اس مخصوص دستک کے کیوں منتظر رہتے تھے؟

رئیسہ خود حیران تھی' یہ سارے جذبے اس کے لئے بالکل نئے اور انجانے تھے۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔

اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے ویسے ویسے ان جذبوں میں شدت' گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی۔ نصیر کا تصور اس کے دل و دماغ پر ایک مدہوش کن نشہ آور کیفیت بن کر

طاری ہونے لگا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس میں ڈوب کر وہ باقی سب کچھ بھول جاتی تھی' اپنے آپ کو بھی بھول جاتی تھی اور پھر جب سب کچھ یاد آتا تھا تو پھر سب کچھ ہی بہت اچھا لگتا تھا۔ ساری دنیا بہت اچھی لگتی تھی' زندگی اچانک کس قدر خوبصورت ہو گئی تھی' اس میں کتنے بہت سے رنگ اتر آئے تھے۔ یہ رنگ کہاں سے آ گئے تھے؟ رنگوں کی ایک پوری کہکشاں تھی جو کسی نامعلوم آسمان سے اتر کر چپکے سے اس کی زندگی کے سادہ اور بے رنگ افق پر چھا گئی تھی۔

اب وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ مل کر ایک جذب و کیف کے عالم میں دوپہر کا کھانا تیار کرتی اور پھر اسے ناشتے دان میں رکھ کر ان ساعتوں کا انتظار کرتی جب نصیر وہاں آنے والا ہوتا اور پھر جب نصیر آ کر چلا جاتا' ناشتے دان ساتھ لے جاتا تو رئیسہ ان بیش قیمت ساعتوں کے ایک ایک ریزے کو بڑی احتیاط کے ساتھ چُن کر اپنے دل میں' اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لیتی۔

نصیر نے جب صابر حسین کے گھر آنا جانا شروع کیا تو حنیفہ سے تو بلا جھجک' بلا تکلف' بڑے اطمینان سے باتیں کر لیتا تھا اور اسے "بھابی بھابی" کہہ کر مخاطب کرتا تھا لیکن صابر بھائی کی سالی سے آنکھ ملاتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ حنیفہ تو اس سے بہت بڑی تھی اور ایک طرح سے اس کے لئے بزرگ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن رئیسہ .... رئیسہ سے وہ بدکتا تھا۔

لیکن آہستہ آہستہ رئیسہ اس کے دل و دماغ پر چھاتی گئی۔ اسے خود تو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ لمحہ کب اور کس وقت آیا تھا جب وہ رئیسہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ شاید وہ ایک واضح اور متعین لمحہ نہیں تھا۔ وہ تو لمحات کا ایک تسلسل تھا' ساعتوں کا ایک تواتر تھا' جس کے دوران ایک بالکل انجان اور اجنبی وجود' اس کے اپنے وجود کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا اور اس کی ہستی کا ایک ایسا حصہ بن گیا جسے وہ اپنے آپ سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نصیر کی زندگی میں ایک ایسا نشاط آفریں اور کیف آور انقلاب برپا ہو گیا تھا کہ اس کے شب و روز کا رنگ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ اب اگر دنیا کی ساری زبانوں میں کوئی سب سے زیادہ خوبصورت لفظ تھا تو وہ رئیسہ تھا.......... دنیا کی کسی بھی زبان میں اس سے زیادہ خوبصورت لفظ موجود نہیں تھا' اس لفظ کے زبان پر آتے ہی جیسے ساری کائنات مسکرانے لگتی تھی اور دنیا میں اگر کوئی سب سے زیادہ خوبصورت شے تھی تو وہ رئیسہ تھی۔ رئیسہ

سے زیادہ اچھا اور کون ہو سکتا تھا؟ کیا بھلا یہ ممکن بھی تھا' بھلا کوئی رئیسہ سے بھی زیادہ اچھا ہو سکتا تھا؟ نہیں .... رُوئے زمین کی حسین ترین' جمیل ترین' عزیز ترین ہستی اگر تھی تو وہ رئیسہ تھی .... رنگوں' خوشبوؤں اور نرم ہوا کے جھونکوں سے بنی ہوئی رئیسہ۔

رئیسہ اور نصیر کی ایک دوسرے کے لئے وارفتگی اور شیفتگی حنیفہ اور صابر حسین کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ انہوں نے جلدی ہی محسوس کر لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرنے لگے ہیں۔

صابر حسین اور حنیفہ کے لئے یہ صورت حال ناپسندیدہ نہیں تھی۔ آخر رئیسہ کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہی تھی اور حنیفہ سے زیادہ صابر حسین کی یہ خواہش تھی کہ رئیسہ کی شادی جلد از جلد ہو جائے تاکہ اسے اس کی ذمہ داری سے نجات مل جائے اور وہ کھل کر' آزادی کا سانس لے سکے۔

نصیر سے زیادہ اچھا لڑکا رئیسہ کے لئے اور کون ہو سکتا تھا؟ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کا کوئی لمبا چوڑا خاندان نہیں تھا بلکہ فی الحقیقت تو اس کا کوئی خاندان ہی نہیں تھا۔ لے دے کے ایک بوڑھی دادی تھی اور بس۔ اس طرح رئیسہ کے لئے سسرال کا کوئی جھنجٹ نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ نصیر ایک ہوشیار کاریگر تھا' برسر روزگار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہنر تھا۔ وہ کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا تھا۔ جب تک شہر میں سائیکلوں کا وجود تھا' تب تک نصیر بھوکا نہیں رہ سکتا تھا اور اب تو صرف سائیکلوں کی مرمت کا کام نہیں رہا تھا۔ اب تو کرائے پر سائیکلیں دینے کا کاروبار بھی بہت ترقی کر رہا تھا۔ خود صابر حسین کی دکان میں سائیکلوں کے کرائے سے ملنے والی رقم آمدنی کا بڑا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

نصیر اور رئیسہ کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور نہ ہی کوئی الجھن پیدا ہوئی۔ سارے ہی معاملات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا گئے اور رئیسہ' نصیر کی دلہن بن کر اس کے گھر چلی گئی' جہاں نصیر کی ایک بوڑھی دادی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

ان دونوں کو ایسا لگتا تھا جیسے دنیا میں اب مانگنے اور خواہش کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو مل گئے تھے اور یہ ان کی مسرتوں کی معراج تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گم ہو گئے جیسے قدرت نے انہیں صرف ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا ہو۔ غربت' تنگ دستی اور مالی کم مائیگی کے باوجود انہیں اپنی زندگی خوشیوں سے بھرپور معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے' ایک دوسرے کے شریک زندگی تھے۔ ان کے لئے ایک دوسرے کا وجود ایک دوسرے کی رفاقت' دنیا کی

سب سے بڑی رحمت تھی۔

شادی کے بعد کا تین سال کا عرصہ اس قدر تیزی سے گزر گیا کہ انہیں ان گزرتے ہوئے لمحات کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ہر چیز' ہر بات' بالکل تازہ' بالکل حالیہ معلوم ہوتی تھی' گھر میں اس عرصے کے دوران کئی اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔

نصیر کی دادی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور اب اس گھر میں ان دونوں کے علاوہ ایک ننھا سا وجود اور بھی موجود تھا۔ عدیل اس وقت سال بھر کا بھی نہیں تھا جب دادی جان کا انتقال ہو گیا اور اب اس گھر میں ان دونوں میاں بیوی کے علاوہ ایک بوڑھے وجود کی بجائے' ایک تازہ اور نوخیز وجود کلکاریاں مارتا پھرتا تھا۔ رئیسہ کو اپنی دنیا ایک چھوٹی سی جنت معلوم ہوتی تھی اور وہ اس جنت میں گم تھی۔ خدا نے ایک دل پسند شوہر دینے کے علاوہ اسے ایک بیٹا دے دیا تھا .... بس اب اور کیا چاہئے؟

لیکن رئیسہ کی یہ خوشی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ ایک دن ایک ایسا خوفناک بھونچال آیا جس نے سب کچھ منہدم کر کے رکھ دیا اور رئیسہ کی زندگی میں سے ساری روشنیاں چھن گئیں۔

اس روز رات کے وقت اچانک نصیر کو بخار چڑھ آیا۔ بخار خاصا تیز تھا۔ تاہم' بخار ہی تو تھا۔ کوئی ایسی خطرے کی بات نہیں تھی۔ بخار تو لوگوں کو آتا ہی رہتا ہے .... رئیسہ نے بھی یہی خیال کیا کہ بخار ہے اتر جائے گا اور اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ صرف بخار نہیں ہے' یہ موت کا بلاوا ہے۔

صبح ہوتے ہوتے نصیر کا بخار اس قدر تیز ہو گیا کہ اس کا جسم آگ کی طرح پھنکنے لگا اور اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ رئیسہ سخت پریشان ہو گئی اور وہ پڑوسیوں کی مدد سے نصیر کو فوراً ہسپتال لے گئی۔ اس نے ایک لڑکے کو صابر حسین کے پاس بھی بھیج دیا۔ صابر حسین سیدھا ہسپتال آ گیا۔

ڈاکٹروں کی کوشش کے باوجود نصیر جانبر نہ ہو سکا اور اس نے اسی شام دم توڑ دیا۔ وہ ایک بار جب بے ہوش ہوا تو پھر اس کو ہوش نہیں آیا۔ بخار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کا دماغ بے کار ہو گیا تھا۔

یہ ایک ایسا ناقابل یقین سانحہ تھا جس نے رئیسہ کے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ زندگی ابھی تو جیسے شروع ہی ہوئی تھی' ابھی تو شادی کو بمشکل تین سال گزرے تھے' ابھی تو بہت لمبا سفر باقی تھا جسے ان دونوں کو ایک ساتھ طے کرنا تھا لیکن وہ تو اتنی جلدی

ساتھ چھوڑ گیا.......... اس نے تو چند قدم کی رفاقت کے بعد ہی منہ موڑ لیا اور اسے اس سنگلاخ راستے پر بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ گیا۔

رئیسہ کی آنکھوں میں اب دنیا اندھیر ہو گئی تھی اور ہر چیز اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ نیستی......... نیستی......... نیستی......... ہر طرف صرف نیستی کا راج تھا۔

جب حواس کچھ بجا ہوئے اور وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو اس پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ مرنا چاہے بھی تو نہیں مر سکتی کیونکہ اسے اپنے بیٹے کے لئے' اپنے عدیل کے لئے زندہ رہنا تھا.......... اور پھر......... پھر......... اپنے لئے بھی......... زندہ رہنے کی خواہش تو بہرحال اپنے آپ کو منوا ہی لیتی ہے۔

ایک بار پھر وہ اسی بستی میں' اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر واپس آ چکی تھی' جہاں اس نے پہلی بار نصیر کی شکل دیکھی تھی۔ اب تو وہ سب کچھ ایک واہمہ معلوم ہوتا تھا اور اس گھر کی دہلیز پر اس ٹوٹے ہوئے خواب کی راکھ پڑی ہوئی تھی۔

وقت گزرتا گیا اور آہستہ آہستہ رئیسہ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ زندہ رہنے کی خواہش بڑی ظالم شے ہے اور آسانی سے انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ رئیسہ بھی اس خواہش کے ہاتھوں مجبور تھی اور پھر......... عدیل کا مسئلہ بھی تو تھا۔

اسے بیوہ ہوئے ایک سال کا عرصہ گزرا تھا کہ اچانک عبدالصمد قصاب کے بیٹے عبدالرزاق نے اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

☆======☆======☆

عبدالرزاق کو یہ نہیں معلوم کہ اچانک یہ سب کچھ کس طرح شروع ہو گیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا اور آج سے برسوں پہلے اس کی شادی اس کی چچازاد بہن ماجدہ کے ساتھ طے ہو گئی تھی۔ ماجدہ کا باپ عبدالشکور' عبدالرزاق کے باپ عبدالصمد کا سگا چھوٹا بھائی تھا اور ماجدہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ عبدالصمد اور اس کی بیوی سلطانہ' دونوں ماجدہ کو بہت پسند کرتے تھے اور اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ماجدہ کی عمر ابھی دس سال ہی کی تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹے عبدالرزاق کے ساتھ اس کی بات پکی کر دی اور یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں ماجدہ اور عبدالرزاق کی مرضی و منشا کا کوئی دخل نہیں تھا' وہ دونوں تو بچے تھے۔

لیکن بچے ہمیشہ بچے ہی نہیں رہتے۔ وہ دونوں نوجوان ہو گئے اور دونوں کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ایک دن ان کی شادی ہونے والی ہے۔ مگر عبدالرزاق نے اپنے دل میں

ماجدہ کے لئے کوئی خاص جذبہ کبھی محسوس نہیں کیا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ خاص جذبہ کون سا ہوتا ہے' کیسا ہوتا ہے' جو ایک مرد کے دل میں ایک عورت کے لئے پیدا ہوتا ہے۔

عبدالرزاق کے دل میں جب یہ جذبہ پیدا ہوا تو وہ ماجدہ کے لئے نہیں تھا' ماجدہ کے لئے تو اس کا دل بالکل خالی' بالکل سپاٹ رہا تھا۔ یہ جذبہ تو ایک بیوہ لڑکی کے لئے پیدا ہوا' جو ایک بچے کی ماں بھی تھی۔

رئیسہ کو وہ اس کی شادی سے پہلے سے جانتا تھا اور دیکھتا تھا لیکن تب ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اب کیا ہو گیا تھا؟ رئیسہ تو وہی تھی لیکن وہ اسے اتنی اچھی کیوں لگنے لگی تھی؟ عبدالرزاق کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور کسی کے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جذبوں کے نزول' فروغ اور ان کی ایک خاص انداز کی صورت پذیری کی بیشتر اوقات کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ ایسا ہی کچھ عبدالرزاق کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

صابر حسین اور حنیفہ نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ عبدالرزاق' رئیسہ میں دلچسپی لینے لگا ہے اور انہوں نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی' انہیں معلوم تھا کہ عبدالرزاق کی شادی اپنی چچازاد بہن ماجدہ کے ساتھ طے ہے اور یہ کہ عبدالرزاق کی عمر رئیسہ سے کچھ کم ہے لیکن بہرحال' اپنے بارے میں آخری فیصلہ کرنے کا حق تو عبدالرزاق کو ہی حاصل تھا۔

وہ دونوں دل سے یہ چاہتے تھے کہ رئیسہ کی دوسری شادی ہو جائے تاکہ وہ ایک نئی زندگی شروع کر سکے۔ بیوگی کی زندگی میں اس کے لئے محرومیوں کے سوا اور کیا رکھا تھا؟

عبدالرزاق اچھا لڑکا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ گوشت کی دکان پر بیٹھتا تھا اور خود بھی کماتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو علیحدہ دکان کر کے خود اپنا کام بھی شروع کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کم از کم ایک ہنر تو تھا۔

عبدالرزاق کے اندر اتنی ہمت تو کسی طرح پیدا ہو ہی گئی کہ اس نے رئیسہ کو یہ بتا دیا کہ وہ اسے بہت پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواہشمند ہے۔

رئیسہ نے اس صورت حال کو ایک خاص مجبوری کے تحت قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دنیا میں اس کا بہن اور بہنوئی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ صرف انہی کے پاس رہ سکتی تھی لیکن ان دونوں کے بھی تو اپنے بہت سے مسائل تھے۔ بچے تھے' جو اب بڑے

ہو رہے تھے اور انہیں زیادہ جگہ کی اور زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ اخراجات تو بڑھ ہی رہے تھے اور پھر وہ رئیسہ کا اپنا بیٹا تھا اور اسے بھی ایک مضبوط اور پائدار سہارے کی ضرورت تھی۔ اگر عبدالرزاق اسے اور اس کے بیٹے کو یہ سہارا فراہم کر دیتا تو زندگی ایک بار پھر بہتری کی طرف مائل ہو سکتی تھی۔ رئیسہ کے لئے عبدالرزاق محض ایک عام نوجوان تھا' جس کے ساتھ رئیسہ کا کسی قسم کا کوئی قلبی تعلق نہیں تھا لیکن اگر وہ اس کا اور اس کے بچے کا سہارا بن سکتا تھا تو وہ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی۔ معاملہ صرف قبول اور برداشت کرنے کا تھا' یہ دل و نظر کا معاملہ نہیں تھا۔

لیکن جب عبدالصمد کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے عبدالرزاق نے بیوہ رئیسہ میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے اور وہ اس کے گھر کے چکر کاٹنے لگا ہے تو اس نے عبدالرزاق کو اس بری طرح لتاڑا اور اس کو ایسی سرزنش کی کہ وہ زرد پتے کی طرح کانپنے لگا۔ عبدالصمد ایک بہت سخت گیر اور درشت مزاج آدمی تھا۔ عبدالرزاق اس کی اولاد تھا اور اس کے نزدیک اولاد کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی ساری خوشیوں کو اپنے والدین کی یکطرفہ پسند و ناپسند پر قربان کر کے اپنے آپ کو محض ایک پالتو مویشی بنائے رکھے۔

اور عبدالرزاق تھا بھی ایسا ہی۔ اپنے سخت گیر باپ کے برعکس جو ہر معاملے میں اپنے مؤقف پر سختی کے ساتھ ڈٹے رہنے کا عادی تھا' عبدالرزاق ایک کمزور ارادے کا آدمی تھا۔ وہ کبھی بھی اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پیدا کر سکا کہ اپنے باپ کے سامنے زبان کھول سکے اور اسے صاف صاف بتا سکے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

اس کے بجائے وہ رئیسہ کے پاس آ کر ٹسوے بہانے لگتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور یہ سب کچھ کہتے وقت اس پر واقعی رقت طاری ہو جاتی۔

لیکن رئیسہ کو اس کے اس قسم کے رویے سے سخت اذیت پہنچتی۔ اگر وہ واقعی اسے اپنانے کا خواہشمند تھا تو اپنے اندر اتنا حوصلہ کیوں نہیں پیدا کر سکتا تھا کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے وہ کر گزرے۔

صابر حسین اور حنیفہ کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا لیکن انہیں اپنی مشکلات کا بھی اندازہ تھا۔ رئیسہ بیوہ تھی اور ایک بچے کی ماں تھی۔ اسے دوسرا رشتہ کوئی آسانی سے تو نہ مل جاتا اس لئے وہ لوگ عبدالرزاق کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اسے بار بار سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ ہر بار ریت کی دیوار کی طرح

دھسک جاتا تھا۔

رئیسہ نے تو عاجز آ کر اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے اور یہاں نہ آیا کرے لیکن صابر حسین اور حنیفہ ابھی تک آس لگائے بیٹھے تھے کہ شاید اس مٹی کے آدمی میں جان پڑ جائے اور وہ ہمت سے کام لے کر کچھ کر گزرے۔

"ایک بار' وہ ہمت کر کے رئیسہ سے نکاح کر لے' تو بس پھر سمجھو کہ معاملہ ختم ہو گیا۔" حنیفہ اپنے شوہر سے کہتی۔ "پھر عبدالصمد چاہے اس کی ہڈیاں بھی توڑ ڈالے تو کیا ہوتا ہے؟"

"وہ بدبخت اس کے لئے تیار بھی ہو۔" صابر حسین نے بیزاری سے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ اس کا باپ ماجدہ کے ساتھ اس کی شادی کر دے گا اور یہ اُلو کا پٹھا سر پر سہرا باندھ کر' دولہا بن کر' خوشی خوشی نکاح پڑھوا لے گا۔ چوں بھی نہیں کرے گا۔"

بات اگرچہ بہت زیادہ عام نہیں ہوئی تھی' تاہم بستی کے کافی لوگوں کو اس کا علم تھا کہ عبدالصمد قصاب کا بیٹا عبدالرزاق' سائیکل والے صابر حسین کی بیوہ سالی کے چکر میں ہے جبکہ اس کی شادی اس کی چچازاد بہن ماجدہ عرف مجی کے ساتھ طے ہے اور یہ خبر عبدالشکور' اس کی بیوی رانی بیگم اور مجی تک بھی پہنچ چکی تھی' تاہم عبدالصمد نے اپنے بھائی اور اس کے گھر والوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ عبدالرزاق کی شادی اگر کسی سے ہو گی تو صرف اور صرف ماجدہ سے ہے اور اس کے علاوہ کہیں نہیں۔

"حکم عدولی کرے گا تو ٹکڑے کر کے ڈال دوں گا' کتوں کے آگے۔" اس نے گرج کر کہا تھا۔ "کون بیوہ' کون رئیسہ' سب بکواس ہے۔ صابر حسین سے اس کی دوستی ہے۔ کبھی کبھی وہاں چلا جاتا ہے۔ بھلا بچے والی بیوہ سے اس کی شادی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟"

"کر کے تو دیکھے کہیں اور شادی۔" ماجدہ خاموشی سے' اپنے دل میں کہتی۔ "اپنی اور اس کی جان ایک کر دوں گی۔ سمجھ کیا رکھا ہے حرامی نے۔ آخر منگیتر ہے میرا .... میرے ساتھ اس کی بات طے ہو چکی ہے۔ اس حرامزادی رئیسہ کا تو میں گلا گھونٹ دوں گی۔"

☆======☆======☆

"میں نے آپا کو بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔" نادرہ نے رئیسہ کے کمرے میں واپس آتے ہوئے کہا۔ "انہیں میں نے سمجھا دیا ہے کہ اس آدمی سے بھلائی کی کوئی امید نہ

رکھیں۔ یہ تو بالکل بے جان آدمی ہے .... ہیجڑا سالا۔" نادرہ نے غصے کے عالم میں عبدالرزاق کو گالی دی۔

"اونہہ .... لعنت بھیجو۔" رئیسہ نے آہستہ سے کہا۔ "بس آپا سے کہہ دو کہ اسے منہ نہ لگایا کریں۔"

"میں نے کہہ دیا ہے۔" نادرہ نے کہا۔ "اور انہوں نے اتفاق بھی کرلیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب بہت جلد ماجدہ اور عبدالرزاق کی شادی ہو جائے گی۔ عبدالصمد اب زیادہ انتظار کرنے والا نہیں۔"

"اچھا ہے' ہو جائے' پاپ کٹے۔" رئیسہ نے کہا۔ "خواہ مخواہ میری جان کو اٹکا ہوا ہے نامراد۔"

نادرہ دوپہر تک رئیسہ کے ساتھ ہی رہی۔ اس نے دوپہر کا کھانا انہی لوگوں کے گھر کھایا اور پھر واپس اپنے گھر آ گئی۔ یہاں بھی بے شمار کام اس کے انتظار میں پڑے ہوئے تھے۔

☆======☆======☆

اس واقعے کے چند ماہ بعد ہی عبدالرزاق اور ماجدہ کی شادی ہو گئی۔ صابر حسین کی پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ اس "الو کے پٹھے" نے سہرا سر پر باندھ کر' دولہا بن کر' خاموشی سے نکاح پڑھوا لیا اور ماجدہ بنت عبدالشکور کو اپنی زوجیت میں قبول کر لیا۔

عبدالرزاق کوئی مزاحمت نہیں کر سکا۔ اس کا دل اندر سے خون کے آنسو روتا رہا لیکن وہ' وہ سب کچھ کرتا رہا جس کے لئے اس کا باپ اسے حکم دیتا رہا۔ اس کی اپنی اوقات ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کی نہیں تھی۔ وہ دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکا' نہ ابھی' نہ اس سے پہلے کبھی۔ وہ تو بس اندر ہی اندر گھٹ سکتا تھا' چپکے چپکے رو سکتا تھا' تنہائی میں آنسو بہا سکتا تھا اور بس' اپنے باپ کے آگے دم مارنے کی ہمت اس میں کہاں تھی۔

"لعنت ہو ایسے زنخے پر۔" حنیفہ نے اس شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کم بخت تو بالکل ہی موم نکلا۔ کس مزے سے شادی کر کے بیٹھ گیا۔"

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اس کی بات پر بھروسہ مت کرو۔" صابر حسین نے غم و غصے کے ساتھ کہا۔ "ایسے لوگ تو بے پیندے کے لوٹے ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ سالا یہاں کے چکر لگاتا تھا .... بلاوجہ ہمیں بدنام کیا۔"

☆======☆======☆

عبدالرزاق کی شادی تو ضرور ماجدہ کے ساتھ ہو گئی اور ماجدہ اس کی دلہن بن کر اس کے گھر میں آ گئی لیکن یہ سب کچھ عبدالرزاق کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ وہ اس کو روکنے کی ہمت تو نہیں کر سکا تھا لیکن اس نے اس سب کو دل سے' خوشی سے' قبول بھی نہیں کیا تھا اور مجی اس بات کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

وہ یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھتی تھی کہ اس کا شوہر اس کا اپنا نہیں ہے۔ عبدالرزاق کے رویے میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اس نے دل سے ماجدہ کو نہیں اپنایا ہے۔

"جب تک وہ حرامزادی ڈائن موجود ہے' میرا شوہر میرا اپنا نہیں ہو سکے گا۔" مجی جل کر دل ہی دل میں کہتی۔

اس کے اپنے دل میں عبدالرزاق کی طرف سے پہلے سے گرہ موجود تھی اور شادی کے بعد یہ گرہ اور زیادہ پختہ ہوتی گئی۔ وہ اس کے ہر عمل کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھتی اور رئیسہ کا آسیب رات دن اس کے سر پر منڈلایا کرتا۔

مجی کے والدین کے درمیان آپس میں روزانہ ہی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ بڑی تُو تُو میں میں اور چیخ پکار ہوتی تھی لیکن ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا تھا کہ ابا کسی دوسری عورت کے پھیر میں پڑ گئے ہوں' یا ابا کو اماں سے اس قسم کی کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔

یہاں اس گھر میں' کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ عبدالرزاق اس سے ایک بار بھی نہیں لڑا تھا۔ لڑنا تو دور کی بات رہی' اس نے تو اونچی آواز میں مجی سے بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ تو اس کے ساتھ اس طرح پیش آتا تھا جیسے وہ اس گھر میں آنے والی ایک معزز مہمان ہو اور اس کا احترام عبدالرزاق پر واجب ہو۔

مجی اس قسم کے رویوں کی' اس فضا کی' اس ماحول کی بالکل عادی نہیں تھی۔ اسے یہ سب کچھ ایک دم مصنوعی اور بالکل جھوٹا لگتا تھا۔ وہ عبدالرزاق کی بیوی تھی' کوئی محترمہ و معظمہ قسم کی شے تو نہیں تھی جس کے سامنے اس قدر باادب باملاحظہ اور ہوشیار رہا جائے۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے' ویسے ویسے مجی کو اس بات کا قوی احساس ہوتا گیا کہ اس کے اور عبدالرزاق کے درمیان روز اوّل سے جو خلیج حائل ہے' وہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ عبدالرزاق اس پر کوئی ظلم نہیں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرتا تھا۔ اگر

وہ ایسا کرتا تو مجی اس سے خوش ہوتی لیکن یہاں تو بس ایک بیگانگی کا عالم تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے پُر تکلف اجنبی ہوں۔

اسی کے ساتھ ساتھ مجی کے دل میں رئیسہ کے لئے نفرت کا لاوا اور زیادہ شدت کے ساتھ پکنے لگتا۔ یہ سب کچھ اسی منحوس کا کیا ہوا تو تھا۔ اگر وہ بیچ میں موجود نہ ہوتی تو اس کا شوہر اس سے یوں دور دور نہ رہتا۔ کیا خبر کم بخت ماری نے کوئی تعویذ وغیرہ کروا دیا ہو .... کوئی سفلی عمل کروایا ہو۔

مجی، رئیسہ کی طرف سے غافل نہیں تھی اور اس نے پہلے ہی یعقوب چچا کو کام سے لگا رکھا تھا۔ اس نے انہیں ایک نیا ململ کا کُرتہ سی کر دیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ وہ رئیسہ کے گھر پر نظر رکھا کریں اور اگر کبھی بھی عبدالرزاق کو وہاں جاتے دیکھیں تو اسے ضرور اطلاع کر دیں۔

"میں تو تمہارے کہے بغیر بھی نظر رکھتا ہوں بیٹی!" یعقوب چچا نے صاف ستھرے، سفید کُرتے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں نے اسے وہاں جاتے ہوئے دیکھا تو میں تم کو ضرور بتا دوں گا۔"

شادی کی تاریخ طے ہو جانے کے بعد صابر حسین اور حنیفہ نے عبدالرزاق کو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے گھر بالکل نہ آیا کرے۔ رئیسہ تو اس کے سامنے ہی نہیں آتی تھی اور اب اس بات کو کافی دن گزر گئے تھے۔ عبدالرزاق نے رئیسہ کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی اور اس کی آنکھیں رات دن بس ایک ہی وجود کو تلاش کرتی رہتی تھیں .... کوئی امید کا لمحہ .... کوئی دیدار کی مختصر سی ساعت .... بس، لحظہ دو لحظہ کی ملاقات .... بیگانوں کی طرح .... اجنبیوں کی طرح .... یوں ہی سہی .... اور اس کا دل بھر آتا .... وہ اپنے سینے کے اندر اٹھنے والے طوفان کو بڑی مشکل سے روک پاتا۔

اور پھر ایک دن درد ناقابل برداشت ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اگر وہ رئیسہ سے نہیں ملا تو اس کا کلیجہ شق ہو جائے گا اور اس کی جان نکل جائے گی۔ اپنے آپ کو ہزارہا روکنے کی کوشش کے باوجود اس کے قدم رئیسہ کے مکان کی طرف اٹھنے لگے۔ اس پر ایک خود فراموشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ اسے تو ہوش اس وقت آیا جب اس نے اپنے آپ کو رئیسہ کے دروازے پر کھڑے پایا اور اگلے ہی لمحے وہ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

دور گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے یعقوب چچا نے عبدالرزاق کو رئیسہ کے گھر کے اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ ابھی کوئی دس منٹ پہلے وہ صابر حسین اور حنیفہ کو، بچوں کے ساتھ، گھر سے باہر جاتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ رئیسہ گھر میں اکیلی تھی اور اب عبدالرزاق، وہ وہیں جم کر کھڑے ہو گئے۔ "دیکھنا ہے کہ کتنی دیر تک اندر رہتا ہے۔"

رئیسہ عبدالرزاق کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے اس کے آنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ اب یہاں کیا لینے آ سکتا تھا؟

"آپا اور صابر بھائی گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

"میں .... رئیسہ .... میں تم سے ملنے آیا ہوں۔" عبدالرزاق نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں بے بسی اور شکست خوردگی کا درد گھلا ہوا تھا۔ "بس تھوڑی سی دیر تمہارے پاس........."

"خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ عبدالرزاق!" رئیسہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "رحم کرو ہمارے حال پر۔ کیوں تم نے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے؟ آخر تم ہمارے گناہ کیوں نہیں بخش دیتے؟ جاؤ........." اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

"بس ذرا سی دیر .... چند منٹ رئیسہ .... صرف چند منٹ تمہارے پاس بیٹھ کر تم سے تھوڑی سی باتیں کرنا چاہتا ہوں .... اس کے علاوہ مجھے بھلا اور کیا چاہئے؟ میں تو برباد ہو چکا ہوں........."

"تمہیں کسی نے برباد نہیں کیا ہے۔" رئیسہ نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "اپنی بربادی کے تو تم خود ہی ذمہ دار ہو، تم تو انسان ہی نہیں ہو۔"

"ذرا ایک منٹ کے لئے دروازہ کھول کر میری بات سن لو رئیسہ!"

وہ تقریباً پندرہ منٹ تک دروازے کے باہر موجود رہا اور رئیسہ کی خوشامد کرتا رہا، گڑگڑاتا رہا کہ وہ دروازہ کھول دے لیکن رئیسہ نے اسے دھتکار دیا۔ صاف کہہ دیا کہ وہ وہاں سے چلا جائے اور آئندہ کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرے۔

ساری ناکام منت سماجت کے بعد، بالآخر وہ وہاں سے چلا آیا اور گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا......... اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

اس وقت چچا یعقوب کے پاؤں حرکت میں آ گئے' وہ دیر نہیں کرنا چاہتا تھے۔

عبدالرزاق نے پورے بیس منٹ رئیسہ کے گھر میں گزارے تھے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ رئیسہ گھر میں اکیلی تھی۔

یعقوب چچا جلدی جلدی چلتے ہوئے عبدالصمد کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجی سے ملنا ان کے لئے کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ وہ اپنا ایک پرانا کرتہ ساتھ لیتے گئے تھے جو ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا' وہ انہوں نے اسے سینے کے لئے دیتے ہوئے کہا۔ ”کوئی گھنٹہ بھر تک اکیلے رہے ہیں وہ دونوں گھر میں' صابر حسین اور اس کی بیوی تو بچوں کو ساتھ لے کر کہیں گئے ہوئے تھے۔ عبدالرزاق وہاں پہنچا۔ رئیسہ گھر میں اکیلی تھی۔ کوئی گھنٹہ بھر تک وہ وہاں رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ دونوں کی پہلے سے ملی بھگت تھی۔ بس موقع کی تلاش میں تھے دونوں .... موقع ملتے ہی وہ وہاں پہنچ گیا۔“

”گھر میں اکیلی رئیسہ تھی؟“ مجی کی آواز بھرا رہی تھی۔ ”اور آپ نے اپنی آنکھوں سے رزاق کو وہاں جاتے دیکھا اور وہ کوئی گھنٹے بھر تک وہاں اس کے ساتھ رہا؟“

”ہاں بیٹی .... اللہ معاف کرے۔“ یعقوب چچا نے کہا۔ ”گھنٹہ بھر سے کم تو کیا رکا ہو گا وہ وہاں۔“

یعقوب چچا' بیس منٹ کی مدت کو ایک گھنٹے پر پھیلا کر وہاں سے چلے آئے اور مجی کے دل و دماغ میں الاؤ بھڑکنے لگا۔ بس بہت ہو چکا' اب یہ سب کچھ اس سے برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا تھا۔ ”یہ چھنال ایسے نہیں مانے گی۔“ اس نے دانت پیس کر دل ہی دل میں کہا۔ ”جب تک اس کے منہ پر اس کی ذلت نہیں کی جائے گی' اس کا دماغ درست نہیں ہو گا۔“ آگ کی ایک لپٹ تھی جو پیروں سے شروع ہوئی اور سر تک جا پہنچی۔ اس لپٹ نے مجی کے سارے وجود کو جھلسا کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی' اس کی سانسوں سے آگ بہہ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں شعلے لپک رہے تھے۔

اس نے رئیسہ کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ نہیں .... وہ اس عورت کو اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی تھی کہ وہ اس سے اس کے شوہر کو چھین لے .... اس کے گھر کو چھین لے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ رئیسہ کے گھر جانے کے لئے نکل کھڑی ہوئی اور تیزی سے اس طرف روانہ ہو گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ رئیسہ کے گھر کے دروازے پر دستک دے

رہی تھی۔

عبدالرزاق جب رئیسہ کے گھر سے بے نیل و مرام باہر نکلا' تو وہ وہاں سے بہت دور نہیں گیا۔ وہ کچھ فاصلے پر ہی موجود تھا' غم سے نڈھال صدمے کے بوجھ تلے دبا ہوا' ٹوٹا ہوا' شکستہ و ریختہ' وہ اپنی کم نصیبی' بزدلی اور تیرہ بختی کا ماتم کرنے میں مصروف تھا۔

عبدالرزاق کے جانے کے بعد رئیسہ نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور اب کافی دور کھڑا ہوا عبدالرزاق صرف اس بند دروازے کو ہی دیکھ سکتا تھا۔

اور تب عبدالرزاق کی نگاہوں نے ایک حیران کن مگر تشویش انگیز منظر دیکھا۔ اس نے مجی کو رئیسہ کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہاں کیا لینے جا رہی تھی؟ کیا کام تھا اسے وہاں کسی سے؟ وہ تو ان لوگوں کے گھر نہیں جاتی تھی؟

مجی اندر داخل ہوئی تھی کہ حنیفہ اور صابر حسین بھی بچوں کے ساتھ واپس آ گئے۔ وہ لوگ کوئی زیادہ دور نہیں گئے تھے' بس بستی کے بازار تک گئے تھے' بچوں کو کچھ چیزیں دلانے۔

لیکن ان لوگوں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہاں معرکہ شروع ہو گیا تھا۔ مجی' رئیسہ کے سامنے کھڑی ہوئی' خونی نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

”کیوں میرے میاں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے حرامزادی؟“ مجی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر' رئیسہ پر گرج رہی تھی۔ ”تجھے شرم نہیں آتی مردار؟ ایک کو تو کھا چکی' اب اور کتنوں کو کھائے گی؟“

”چلی جاؤ .... چلی جاؤ یہاں سے۔“ رئیسہ نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہارے میاں سے کچھ نہیں لینا ہے۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔“

”ارے اگر واسطہ نہیں ہے تو اس کو اکیلے میں بلا بلا کر چھنالا کیوں کرواتی ہے؟“ مجی کی آواز پورے زور و شور کے ساتھ دور دور تک گونج رہی تھی۔ ”میرے مرد کے علاوہ تجھے دنیا بھر میں اور کوئی مرد نہیں ملتا؟“

”زبان سنبھال کر بات کر چڑیل' بے غیرت' بے حیا۔“ غم و غصے کے عالم میں رئیسہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں لعنت بھیجتی ہوں تیرے میاں پر .... تھوکتی بھی نہیں ہوں اس کی شکل پر .... نکل جا یہاں سے۔ جا چلی جا .... تو گھر میں گھسی کیوں؟“

نفرت اور قہر و غضب کی ایک بجلی تھی جو کڑکڑا کر مجی کے اوپر گری اور اس نے آن

کی آن میں اسے جلا کر رکھ دیا۔ اس کے ہوش و حواس جواب دے گئے۔ قریب ہی ایک ہاون دستہ پڑا ہوا تھا' جس میں بھاری آہنی موسل رکھا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر وہ موسل اٹھایا اور پوری طاقت سے رئیسہ کے سر پر دے مارا۔ یہ ایک بالکل جنونی کیفیت تھی۔ مجی کو خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ وہ تو اس وقت سب کچھ بھول چکی تھی' بس قہر کا ایک جہنم تھا جو اس کے وجود کے اندر دہک رہا تھا۔

"ہائے۔" رئیسہ کے حلق سے نکلنے والی کراہ اس قدر دردناک تھی کہ اس کی گونج دور دور تک سنائی دی اور ٹھیک اسی وقت حنیفہ اور صابر حسین گھر کے اندر داخل ہوئے۔

"ارے مار دیا۔" حنیفہ حواس باختہ ہو کر اپنے حلق کی پوری طاقت کے ساتھ چیخی۔

"ارے لوگو دوڑو.......... میری بہن کا خون ہو گیا.......... ہائے میرے مولا.........."

آن کی آن میں وہاں پہنچنے والوں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ رئیسہ خون میں لت پت فرش پر پڑی ہوئی تھی اور مجی اس کے سامنے آہنی موسل ہاتھ میں لئے کھڑی تھیں جبکہ ہاون دستہ اس سے کچھ فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔

مجی بالکل حواس باختہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں کیا کہ موسل کو ہاتھ سے پھینک ہی دیتی۔ جو کچھ ہوا وہ غیر ارادی طور پر اور ایک وحشت کے عالم میں ہوا تھا اور اب وہ موسل ہاتھ میں لئے رئیسہ کے پھٹے ہوئے سر کو دیکھ رہی تھی جس میں سے ڈھیروں خون بہہ رہا تھا۔

پولیس کے آنے سے پہلے ہی رئیسہ نے دم توڑ دیا۔ پولیس آئی تو مجی کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے خلاف صابر حسین اور حنیفہ کے علاوہ' محلے کے ان تمام لوگوں نے بھی بیان دیا تھا جو حنیفہ کی چیخیں سن کر وہاں آ گئے تھے۔

اور ان لوگوں کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا جو مجی کے خلاف گواہی دے رہا تھا۔

یہ شخص دھاڑیں مار مار کر' دیوانہ وار رو رہا تھا اور ساری بستی کے لوگ اس پاگل کو دیکھ رہے تھے جو ایک ایسی عورت کی موت پر رو رہا تھا جس سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔

یہ شخص عبدالرزاق تھا.......... مجی کا میاں.......... اس نے پولیس کو بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے مجی کو رئیسہ کے گھر میں جاتے دیکھا تھا اور رئیسہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ کیونکہ صابر حسین اور حنیفہ اور بچے تو دیر میں آئے تھے اور اس نے ان لوگوں کو آتے دیکھا تھا۔

"اس کو عدالت میں بیان دینے سے روکنا۔" مجی کے باپ عبدالشکور نے اپنے بھائی عبدالصمد سے' سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر اس نے عدالت میں بھی یہی بیان دے دیا تو مجی کے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"ہو جانے دو چچا!" عبدالرزاق نے دھاڑ کر کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج پہلی بار اسے بولنے کی قوت میسر آئی ہے۔ "مجی کے لئے مشکل پیدا ہوتی ہے تو ہو جانے دو.......... مجی نے رئیسہ کو قتل کیا ہے.......... ہاں.......... اس نے قتل کیا ہے۔ اس کو پھانسی پر چڑھنا چاہئے۔"

"ابے.......... ابے.........." عبدالصمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اپنے "بے زبان" بیٹے کی طرف دیکھا جس کی زبان آج یکایک کھل گئی تھی۔ "ابے.......... وہ تیری بیوی ہے سالے.......... مجی تیری گھر والی.........."

"میں نے مجی کو طلاق دی۔" عبدالرزاق پوری آواز کے ساتھ' وحشت اور جنون کے عالم میں چلایا۔ "میں نے مجی کو طلاق دی۔ میں نے مجی کو طلاق دی.......... طلاق دی.......... طلاق دی.......... طلاق دی.........." اور پھر وہ رک کر ہانپنے لگا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔

"کیا بکتا ہے خبیث؟" عبدالصمد خوف و دہشت اور غیظ و غضب کے عالم میں بڑے زور سے دھاڑا لیکن خبیث کو جو بکنا تھا' وہ بک چکا تھا' تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب اسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔

عبدالصمد پتھر کا بنا ہوا بے حس و حرکت' اس بے زبان جانور کو دیکھ رہا تھا جس کی آج تک یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اس کے سامنے زبان کھولے۔ اس بے زبان جانور کو آج اچانک زبان مل گئی تھی اور اس کی زبان نے تلوار بن کر اس رشتے کی ڈور کو کاٹ پھینکا تھا جو عبدالصمد اور دوسرے اس پر زبردستی مسلط کرتے چلے آئے تھے۔

مجی کو جب پولیس نے حوالات میں لے جا کر بند کر دیا تو وہ شدید ترین خوف' سراسیمگی' بدحواسی' دہشت اور صدمے کا شکار تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا' کیوں ہو گیا تھا' کیسے ہو گیا تھا' اس کا ارادہ تو رئیسہ کو قتل کرنے کا نہیں تھا.......... نہیں نہیں.......... اس نے تو اپنی زندگی میں آج تک کسی کو قتل نہیں کیا تھا.......... قتل.......... نہیں.......... قتل تو بڑی بھیانک چیز ہے' وہ بھلا کسی کو کیوں قتل کرتی؟ اس نے تو غصے میں موسل اٹھا کر ویسے ہی رئیسہ کے سر پر مار دیا تھا' اس کو کیا معلوم تھا کہ وہ مر جائے گی۔

لیکن اب تو رئیسہ مر گئی تھی' مجی کو اپنے چاروں طرف بھیانک سیاہ سناٹوں کی زہرناک گونج سنائی دے رہی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ قتل کا انجام وہ جانتی تھی۔ اسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ بچاؤ کا بھلا کیا راستہ ہو سکتا تھا؟ اس کے اعصاب پر مُردنی طاری ہونے لگی۔ دنیا ختم ہو رہی تھی۔

وہ حوالات میں ہی تھی جب اسے اطلاع ملی کہ اس کے شوہر نے اس کو طلاق دے دی ہے اور یہ خبر اس کے اعصاب پر بجلی بن کر گری۔ یہ تو وہ بخوبی جانتی تھی کہ عبدالرزاق کبھی بھی اس کا نہیں تھا۔ وہ اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں تھا۔ وہ تو کبھی اس کا بن ہی نہیں سکتا تھا لیکن پھر بھی' ان دونوں کے درمیان قانون اور مذہب کا قائم کردہ ایک بندھن تو موجود تھا اور اسی بندھن کے سہارے تو وہ عبدالرزاق پر اپنا حق جتاتی تھی اور آج عبدالرزاق نے وہ بندھن بھی توڑ دیا تھا اور اس کو ٹھوکر مار دی تھی۔

مجی بالکل مردہ ہو کر رہ گئی۔ آن کی آن میں سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔ کس قدر تیزی کے ساتھ ساری تبدیلیاں نمودار ہوئی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر تنہا اور بے سہارا اور شدید خوف و دہشت کا شکار پا رہی تھی۔

حوالات کی رات .... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دنیا کی آخری رات ہو اور اب کوئی صبح نہیں ہو گی .... بس یہ رات اسی طرح چلتی رہے گی اور پھر ایک دم سے سب کچھ ہوا میں اڑ جائے گا۔ نہ یہ حوالات کی عمارت رہے گی' نہ وہ خود رہے گی نہ یہ دنیا رہے گی۔ سارا کچھ ختم ہو جائے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا' رات گزر گئی کیونکہ اسے تو گزر ہی جانا تھا۔ ہر رات کی طرح یہ رات بھی گزر گئی اور زخموں سے چُور چُور' خون میں بھیگی ہوئی' کراہتی اور سسکتی ہوئی صبح طلوع ہوئی' جو مجی کی زندگی کی اب تک کی سب سے زیادہ دردناک صبح تھی۔

مجی تو ادھر حوالات میں بند تھی اور ادھر اس کے والدین اور ساس سسر' جو کہ اس کے سگے چچا چچی بھی تھے' سخت عذاب اور آزار کا شکار تھے۔ ان پر ایک ساتھ کئی مصیبتیں نازل ہو گئی تھیں۔

یہ صرف مجی کے ہاتھوں رئیسہ کے قتل کا ہولناک واقعہ ہی نہیں تھا' یہ عبدالرزاق کی طرف سے مجی کو دی جانے والی طلاق کا بھی معاملہ تھا اور یہ رئیسہ کے لئے عبدالرزاق کی اندھی محبت کا بھی معاملہ تھا۔ عبدالصمد کی اپنے بیٹے کے ہاتھوں شکست اور عبدالرزاق کی شخصیت کے ایک نئے رنگ کے نمودار ہونے کا بھی معاملہ تھا اور ان

سارے معاملات نے مل کر ان لوگوں کو پاگل کر ڈالا تھا۔

صابر حسین اور حنیفہ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے اور لوگوں کو بتاتے تھے کہ مرحومہ نے اور خود ان دونوں نے بھی عبدالرزاق کو سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا کہ وہ ان کے گھر نہ آیا کرے اور خود عبدالرزاق ان کی ان باتوں کی تصدیق کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے گھر میں اس کے داخلے پر پابندیاں لگا رکھی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ بہت دنوں کے بعد وہاں اس لئے گیا تھا کہ وہ رئیسہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن رئیسہ نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور وہ اس کے پاس سے چلا آیا تھا۔ پھر کافی دیر کے بعد اس نے مجی کو رئیسہ کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ رئیسہ اس وقت گھر میں اکیلی ہے اور پھر صابر حسین اور حنیفہ بچوں کے ساتھ آ گئے اور اسی وقت اندر سے رئیسہ کی بھیانک چیخ سنائی دی۔

عبدالرزاق نے لوگوں کو اور پولیس کو بھی یہی سب کچھ بتایا تھا جو کہ سچ تھا اور وہ چیخ چیخ کر اس سچ کا اعلان کر رہا تھا۔ عبدالصمد دم بخود تھا' اس کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ عبدالرزاق کو یہ سب کچھ کہنے سے روکے۔ عبدالشکور نے اپنے طور پر اسے روکنے کی کوشش کی تو عبدالرزاق آگ بگولہ ہو گیا۔

"وہ بڈھا حرام زادہ .... وہ لالچی کتا' یعقوب چچا .... میں خوب جانتا ہوں .... وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور بدمعاشی سے باز نہیں آتا۔ اسی نے مجی کو میرے وہاں جانے کی اطلاع دی ہو گی۔ میں نے اسے ادھر جاتے دیکھا تھا۔"

یعقوب چچا پر سخت بدحواسی کا عالم طاری تھا۔ وہ اپنے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور باہر نکلنے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ غیظ و غضب اور دیوانگی کا مارا ہوا عبدالرزاق کہیں ان پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ عبدالرزاق تو کسی کے سنبھالے سنبھل ہی نہیں رہا تھا۔

پولیس نے مجی کا ریمانڈ لے کر کیس کی تحقیقات شروع کر دی تھیں۔ کیس تو بہت مضبوط تھا۔ مجی کو موقعۂ واردات پر' آلہ قتل کے ساتھ ہی پکڑا گیا تھا اور بہت سارے عینی شاہد موجود تھے۔ سب سے اہم گواہ تو خود ملزمہ کا شوہر تھا جس نے فوری طور پر اس کو طلاق بھی دے دی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد پولیس نے' مجی کو حوالات سے جیل بھیج دیا اور یہ ایک عجیب و غریب دنیا تھی۔ خوف سے سہمی ہوئی مجی کا بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر

بھاگ جائے، کہیں بھی چلی جائے، کسی بھی جگہ چلی جائے لیکن یہاں سے نکل جائے۔ یہ تو اس قدر خوفناک جگہ تھی کہ اس نے اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کیسی کیسی عورتیں یہاں موجود تھیں .... اور ان میں سے بعض کی نگاہیں .... اس پر لرزہ طاری ہونے لگتا۔

"قتل کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے؟" مجی کے بارے میں یہ بات اس کی بیرک کی تمام انڈر ٹرائل عورتوں کو معلوم تھی۔ وہ سب اسے حیرت اور دلچسپی کے ساتھ دیکھتی تھیں اور کرید کرید کر اس سے پوچھتی تھیں کہ کیا ہوا تھا۔ مجی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ان سے کیا کہے .... وہ ان سب سے بھاگنا چاہتی تھی۔ اسے اس فضا سے، اس ماحول سے بڑی سخت وحشت ہو رہی تھی۔ یہ تقدیر نے اسے کہاں لا ڈالا تھا؟

اس بیرک میں جتنی بھی عورتیں تھیں، وہ سب انڈر ٹرائل تھیں اور ان میں طرح طرح کے الزامات میں ماخوذ، طرح طرح کی عورتیں تھیں لیکن قتل کے الزام میں ماخوذ عورتیں چند ایک ہی تھیں اور مجی ان میں سے ایک تھی اور سب سے کم عمر قتل کی ملزمہ، اس لئے وہ ساری عورتوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ عورتوں کو اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ اس نے اتنی کم عمری میں ایک دوسری عورت کو قتل کر ڈالا۔

بیرک کی زندگی بڑی ذلت آمیز تھی۔ جیل کی سپاہی عورتیں قیدی عورتوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ بغیر گالی کے تو بات نہیں کرتی تھیں اور حکم عدولی پر بری طرح زد و کوب کرتی اور سزا بھی دیتی تھیں۔ مجی یہ سب دیکھ دیکھ کر کانپتی رہتی تھی اور دل ہی دل میں اس لمحے کو کوستی تھی جب اس نے اس وقت رئیسہ کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہاں انڈر ٹرائل عورتوں میں مجی کو ایسی ایسی عورتوں کے حالات کا علم ہوا کہ ان کی داستانیں سن کر اس کے ہوش اڑ گئے اور اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ انسانی دکھوں کی نوعیت کس قدر گوناگوں اور ان کا دائرہ کس قدر غیر معمولی طور پر وسیع و بسیط ہوتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات رشیدہ نامی ایک عورت سے ہوئی، جس کا تعلق پنجاب سے تھا اور جو کام کاج کے سلسلے میں کراچی آئی تھی اور گزشتہ آٹھ برس سے جیل میں بند تھی۔ اس پر چوری کا الزام تھا اور وہ اسی الزام کے تحت گرفتار ہوئی تھی لیکن اسے آج تک عدالت میں پیش ہی نہیں کیا گیا تھا۔

"تو تمہارے گھر والوں نے باہر سے کوئی کوشش نہیں کی؟" مجی نے خوف سے زرد

پڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"میرے گھر والوں میں میری ایک بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں۔" اس نے کہا۔ "جب میں پنجاب سے کراچی آئی تھی تو میں نے اس کو ایک خط لکھوا دیا تھا جس میں اس جگہ کا پتہ لکھا دیا تھا جہاں میں کام کرتی تھی۔ مجھے اس کا کبھی کوئی خط نہیں ملا۔"

وہ نیم دیوانی عورت سکھاں تھی جسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کب سے جیل میں ہے، کیوں ہے اور اس کا قصور کیا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ سکھاں کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کس الزام میں یہاں آئی تھی۔ جیل اب گویا اس کا گھر تھا۔ اس کو یہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس کا اصل گھر کہاں تھا اور وہ وہاں سے کس طرح نکلی۔ نیلم تھی، جسم فروش عورت، جسے پولیس نے حدود آرڈیننس کے تحت اس لئے پکڑ رکھا تھا کیونکہ اس نے پولیس کے نئے انچارج کو بھتے کی اضافہ شدہ رقم دینے سے انکار کر دیا تھا۔

"جلد ہی چھوٹ جاؤں گی۔" اس نے مجی کو بتایا تھا۔ "باہر میرے آدمی نئے انچارج سے معاملہ کر رہے ہیں۔ پہلی ہی پیشی میں معاملہ ختم ہو جائے گا۔ جیب میں پیسہ ہو تو پھر حدود آرڈیننس کیا چیز ہے؟"

مجی ایک ننھے منے کنویں سے نکل کر جیسے ایک سمندر میں آ گئی تھی۔ دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے، کس طرح ہوتا ہے، لوگ کس کس انداز میں زندگی گزارتے ہیں، اس کا اسے ایک نیا عرفان، ایک نیا شعور حاصل ہو رہا تھا۔ یہ جیل کی بیرک نہیں تھی۔ یہ تو ایک تماشہ گاہ عالم تھی، جہاں ہر لمحہ بدلتے ہوئے منظر روح فرسائی کے نئے اسباب مہیا کرتے تھے۔

مجی پر بہت دنوں تک مقدمہ چلتا رہا۔ کچھ عرصے کے لئے بمشکل اس کی ضمانت ہو سکی تھی اور وہ گھر آ گئی تھی لیکن اپنی سسرال نہیں۔ اس کی اب کوئی سسرال نہیں تھی۔ اس کے شوہر نے اس کو طلاق دے دی تھی۔ مجی اپنے والدین کے گھر تھی۔

عبدالرزاق کے قطع تعلق کر لینے کے بعد، عبدالصمد اور اس کی بیوی کے رویے میں بھی سرد مہری پیدا ہو گئی تھی۔ مجی اب ان کی بہو نہیں تھی۔ وہ صرف ان کی بھتیجی تھی۔ ایک قاتلہ بھتیجی اور وہ اس کے لئے کچھ زیادہ نہیں کر سکتے تھے۔

مجی کے والدین تو بہت ہی غریب تھے۔ وہ مقدمے کے اخراجات کے بمشکل متحمل ہو سکتے تھے۔ ایک معمولی سا وکیل تھا، معمولی سی فیس لے کر کیس لڑنے والا .... مجی کی ضمانت بھی بہت عرصے تک نہیں ہو سکتی تھی۔

مجی جب ضمانت پر کچھ دنوں کے لئے گھر آئی تو اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اس

کے لئے دنیا بدل چکی ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں اس کے لئے ایک تحقیر آمیز تجسّس تھا۔ اس سے ملنے کے لئے آنے والی عورتیں اس کو ایسی نظروں سے دیکھتیں جیسے وہ اچانک کسی دوسری دنیا کی مخلوق بن گئی ہے اور وہ پہلے والی مجی نہیں ہے۔ ان کی نگاہیں اس کے جسم کو یوں ٹٹولتیں جیسے یہ دیکھ رہی ہوں کہ مجی اتنے دن تک جیل میں رہنے کے بعد اپنے جسم کا کتنا حصہ وہاں گنوا آئی ہے اور وہ جب ہمدردی کے انداز میں بھی اس سے بات کرتیں تو مجی کو ایسا لگتا جیسے وہ اس پر ہنس رہی ہوں' اس کو تضحیک و طنز کا نشانہ بنا رہی ہوں۔

یہ زندگی بھی جیل کی زندگی سے کم اذیت ناک نہیں تھی۔ خود والدین بھی تو اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ میاں نے طلاق دے دی تھی' قتل کا مقدمہ جان کو لگا ہوا تھا' ساری بستی میں بدنامی اور ذلت ہو چکی تھی۔ مجی اپنے والدین کے لئے اور خود اپنے لئے بھی' ایک مدفاضل بن گئی تھی۔ اس کی کسی کو بھی ضرورت نہیں تھی۔

مجی پر قتل کا جرم تقریباً ثابت تھا اور عدالت نے اس کو سات سال قید بامشقت کی سزا دے دی۔ اس کے ساتھ سزا میں قدرے رعایت اس وجہ سے کی گئی کیونکہ اس نے یہ قتل بالارادہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ اس کے وقتی اشتعال کا نتیجہ تھا' جیساکہ گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہو رہا تھا۔

جب مجی کو سزا سنائی گئی تو وہ عدالت میں ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ نہیں سہار پا رہی تھیں اور دو پولیس والیاں اسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ کمرہ عدالت میں مجی کے عزیز و اقارب میں سے صرف اس کے والدین موجود تھے۔ عبدالصمد اور اس کی بیوی نے تو ایک عرصے سے اس مقدمے میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دی تھی۔

سات سال .... مجی کے دماغ میں سنسنی ہو رہی تھی .... سات سال تک اسے جیل میں رہنا ہو گا اور باہر کی دنیا سے مکمل طور پر کٹ کر اس اذیت ناک ماحول میں زندگی گزارنی ہو گی جہاں کا ایک ایک لمحہ خوف' دہشت' بے یقینی اور جبر کی گہری کثیف دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

اب جبکہ وہ دوبارہ جیل آئی تو اس کی حیثیت بدل چکی تھی۔ پہلے وہ ایک انڈر ٹرائل قیدی تھی اور اب وہ ایک سزایافتہ مجرمہ تھی۔ سات سال قید بامشقت کی سزایافتہ اور اس کے ساتھ ہی بہت ساری تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ اس کو جیل کا لباس پہنا دیا گیا اور اب

اسے اپنے گھر کے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے اپنے کپڑے اتروا کر جیل کے گودام میں رکھوا دیئے گئے۔ مشقت تو اس کو اس وقت بھی کرنی پڑتی تھی جب وہ انڈر ٹرائل تھی' باوجود اس کے کہ اس کو سزا نہیں ہوئی تھی اور اب تو باقاعدہ مشقت اس کو ایک فریضے کے طور پر تفویض کر دی گئی۔ یہ مشقت اسے ہر حال میں روزانہ کرنی ہی تھی۔

جیل کا کھانا اس قدر بُرا اور خراب ہوتا تھا کہ نوالے اس کے حلق سے نہیں اترتے تھے لیکن اب تو آنے والے طویل عرصے تک یہی کھانا کھانا تھا۔

"کاش .... کاش .... اس وقت مجھ پر وہ جنون نہ طاری ہوتا۔" وہ راتوں کی تنہائی میں بلک بلک کر روتی اور اپنے آپ سے کہتی۔ "کاش .... اس وقت وہ منحوس ہاون دستہ وہاں موجود نہ ہوتا .... کاش .... رئیسہ بچ جاتی .... اگر وہ صرف زخمی ہو جاتی تو بھی مجھے اتنی لمبی سزا نہ ہوتی۔ اب میں کیا کروں .... میں کیا کروں .... میں کیا کروں.........." اس کا دل خون ہو کر آنسوؤں کی شکل میں بہنے لگتا لیکن اب تو یہ سب کچھ بیکار تھا۔ یہ سارے پچھتاوے بے فیض تھے اور جو کچھ ہو چکا تھا' اسے مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ رئیسہ مر چکی تھی۔ اس کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی اور یہ ایک خوفناک اور دردانگیز حقیقت تھی اور اس حقیقت کے بھاری پتھر اب مجی کے جسم کو کچل رہے تھے .... ان سے مفر ناممکن تھا۔

قید کی مدت کے پہلے سال کے دوران عبدالرزاق اور اس کے گھر والوں نے تو کبھی بھول کر بھی اس کو اپنی شکل نہیں دکھائی۔ عبدالرزاق سے تو خیر اسے امید ہی نہیں تھی لیکن تایا اور تائی .... ان دونوں نے بھی کیسی آنکھیں پھیرلی تھیں .... بس صرف ابا اور اماں ہر ماہ ملنے کے لئے آتے رہے۔ ان دونوں کے لئے بھی یہ آسان نہیں تھا کیونکہ اس روز ابا کو خاص طور سے چھٹی کرنی پڑتی تھی اور چھٹی کرنے کا مطلب تھا ایک دن کی تنخواہ سے محروم ہو جانا۔

اگلے سال کے شروع میں اماں اکیلی آنے لگیں' کیونکہ ابا بہت سخت بیمار ہو گئے تھے۔ وہ کام پر بھی پابندی سے نہیں جا رہے تھے۔ پھر ایک روز دو ماہ کے ناغے کے بعد اماں آئیں تو وہ انہیں دیکھتے ہی سکتے میں آ گئی۔ اماں تو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نکیلی نظر آ رہی تھیں اور ان کی آنکھیں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ اماں نے اسے روتے ہوئے بتایا کہ ابا کا پچھلے ماہ انتقال ہو گیا۔ انہیں

گردے کی شدید تکلیف ہو گئی تھی۔ وہ دو ہفتے سول ہسپتال میں رہے اور پھر وہاں ختم ہو گئے۔

مجی دھاڑیں مار مار کر روئی اور دوسری قیدی عورتوں نے اسے تسلی دی۔

"اگر تمہارے گھر والوں نے بروقت اطلاع دی ہوتی اور باہر سے کوشش کی ہوتی تو تمہیں اپنے باپ کی صورت دیکھنے کی اجازت مل سکتی تھی۔" ایک وارڈر نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"ہمارے ہاں یہ سب کرنے والا کون ہے بھیا؟" مجی نے روتے ہوئے کہا۔ "کوئی پڑھا لکھا تو ہے نہیں اور میرا تو کوئی بھائی بھی نہیں۔ بس لے دے کے ایک اماں ہیں اور ہے ہی کون میرا۔"

وارڈر نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیسی جوان اور دلکش لڑکی تھی .... بڑے اچھے پیسے مل سکتے تھے مگر فی الحال تو ممکن نہیں تھا۔ ابھی تو اس کو بڑی سزا کاٹنی تھی۔ تب تک وہ نہ جانے کیسی ہو جائے گی اور تب تک میں خود کہاں ہوں گا۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "مگر مال بہت اچھا ہے اور سب سے زیادہ مزے کی بات تو یہ ہے کہ تقریباً لاوارث ہے .... اگر اسے سزا نہ لگ گئی ہوتی یا کچھ عرصے کے بعد رہا ہونے والی ہوتی تو.........."

اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی، افسران کے ایما پر جیل سے نہ جانے کتنی لاوارث اور نیم لاوارث عورتوں کو جسم فروشی کی منڈیوں میں بھیج چکے تھے۔ وہ تو ایسا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے جب انہیں کوئی ایسی قیدی عورت دستیاب ہو جسے وہ اپنی مرضی کا تابع بنا سکیں اور جس کے گوشت کو عیاشی کی دکانوں پر بیچ کر اپنی جیبیں بھر سکیں۔

لیکن مجی کے ساتھ فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ مجی کی رہائی کا وقت ابھی بہت دور تھا لیکن ابھی سے کئی نظریں مجی کے اوپر لگی ہوئی تھیں۔ جس طرح مردار خور گدھ، اس زندہ انسان کا پہلے ہی سے پیچھا کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کے بارے میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا اور کسی وقت گر کر مر جائے گا۔

یہ لوگ جیل میں ان تمام قیدی لڑکیوں اور نوجوان اور جوان عورتوں کے بارے میں خاص طور سے ساری معلومات رکھتے تھے جن کے وارثوں کو ان سے دلچسپی نہیں ہوتی تھی یا جو لاوارث یا نیم لاوارث ہوتی تھیں۔ یہ عورتیں تو روپے کی اچھی خاصی کان ہوتی تھیں

اور ان سے خوب مالی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

مجی بھی تقریباً ایک ایسی ہی عورت تھی لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

مجی کو جیل میں دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ابا تو کب کے دنیا سے سدھار گئے تھے اور اب اماں اکیلی رہ گئی تھیں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا جو دکھ بٹاتا، سہارا دیتا، تسلی کے دو حرف ہی کہتا۔ ایسا کوئی نہیں تھا۔ سارے دکھ اپنے ہی تھے اور انہیں تنہا رہ کر ہی برداشت کرنا تھا۔ تنہائی .... تنہائی .... وحشت ناک تنہائی .... اماں کے مقدر کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

اور پھر ایک دن یہ تنہائی اماں کو کھا گئی۔ وہ اس قدر خاموشی سے اس دنیا سے کوچ کر گئیں کہ کسی کو بروقت ان کے مرنے کی اطلاع بھی نہیں مل سکی۔ وہ تو صبح کو اس وقت معلوم ہوا جب دودھ والا دروازہ پیٹ پیٹ کر عاجز آ گیا اور کسی نے گھر کا دروازہ نہیں کھولا۔

رات کو سوتے میں نہ جانے کس وقت ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی اور جگہ جگہ ٹوٹے ہوئے بانوں کی جھلنگی چارپائی پر ایک میلی چادر کے نیچے، ان کا مردہ جسم اکڑ کر سخت ہو چکا تھا۔

مجی کو اپنی ماں کی موت کی اطلاع ایک خط کے ذریعے ہوئی۔ یہ خط اس کے تایا عبدالصمد نے اس کو بھجوایا تھا اور اس میں اس کی ماں کی اچانک موت کی اطلاع دیتے ہوئے، یہ لکھا تھا کہ گھر کا جو بھی ساز و سامان تھا اسے اس نے فی الحال اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور جب مجی رہا ہو کر آئے گی تو وہ یہ ساری چیزیں اس سے لے سکتی ہے۔

دامان ابد تک مرے صدمات کا عالم .... مجی پر ایک اور کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ آزار اور اذیت کی جس دنیا میں وہ رہ رہی تھی، وہاں اسے بس ایک ہی امید تھی۔ باہر سے آنے والی کوئی اچھی خبر .... گو کہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ بھلا اس کے لئے باہر سے آنے والی اچھی خبر کون سی ہو سکتی ہے؟ باپ تو مر ہی چکا تھا۔ ماں بے چاری، تنہا دکھوں کی ماری، نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے، کسی نہ کسی طرح زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہی تھی۔ تو بھلا وہ کون سی خوشخبری لے کر آ سکتی تھی؟ یہ تو زندگی کا وہ مرحلہ تھا جہاں ساری خوشخبریوں کے دروازے بند ہو چکے تھے لیکن پھر بھی نہ جانے وہ کون سی امید کی کرن تھی جو اس کے دل میں ابھی اپنی ماں کی طرف سے روشن رہتی تھی اور جب بھی اماں اس سے ملاقات کے

لئے آتیں تو وہ منتظر رہتی کہ وہ اس کو کوئی اچھی خبر سنائیں گی۔ کون سی اچھی خبر؟ اسے خود نہیں معلوم تھا لیکن وہ اپنے دل میں اس ننھی سی شمع کو بجھنے نہیں دیتی تھی۔ کوئی خبر .... کوئی اچھی سی خبر........ کوئی خوشی کی خبر........ لیکن اب تو زندگی میں ایسا کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ سب کچھ تو ختم ہو چکا تھا۔ اماں آتیں تو ان کے پاس خوشی کی کوئی خبر نہ ہوتی۔ پھر ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا اور وہ چلی جاتیں اور اس دن سے' اسی لمحے سے' مجی ایک بار پھر انتظار کی ایک نیم خوشگوار' نیم پُراسرار کیفیت میں مبتلا ہو جاتی۔ اگلی بار جب اماں آئیں گی تو ان کے پاس ضرور کوئی اچھی خبر ہو گی........ باہر کی دنیا کی اچھی خبر۔

اور جب اسے اپنے تایا کا خط ملا تو ہر امید کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ تنہائی کے شدید اور بھیانک احساس نے اسے ایک دم سے نگل لیا۔ اب تو دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں رہا تھا' کوئی بھی نہیں' وہ بالکل اکیلی تھی۔

کاش .... کاش اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی........ عبدالرزاق کے ساتھ اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی۔ اس سے تو وہ رحمت حلوائی کا بیٹا منیر ہزار درجہ اچھا رہتا' جو دن بھر میں کئی بار طرح طرح کے بہانوں سے اس کے گھر کے چکر لگاتا تھا اور جب وہ اس کی طرف دیکھتا تو مجی کو ایسا لگتا جیسے اس کی آنکھوں سے رس ٹپک رہا ہو اور وہ گھبرا کر اس کے سامنے سے ہٹ جاتی یا پھر دوسری طرف دیکھنے لگتی۔ منیر کی نظروں میں کوئی ایسی بات تھی جس کی وہ تاب نہیں لا پاتی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے ان نظروں کی مٹھاس اسے اپنے اندر جذب کر لے گی اور اس کے وجود کو فنا کر کے رکھ دے گی۔ عبدالرزاق کی نظروں میں اس نے یہ مٹھاس کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہاں تو کوئی مٹھاس' کوئی رس' کوئی آنچ' کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک سپاٹ بیگانگی تھی۔ جیسی کہ ہر اجنبی شخص کی آنکھوں میں ہوا کرتی ہے۔

"جانے میں بھی کس کے لئے مر گئی۔" اس کے کلیجے میں اکثر ہوک اٹھا کرتی۔ "اس بدنصیب کے لئے جو کبھی بھی میرا نہ تھا' جو کبھی بھی میرا نہ ہو سکا اور جس نے اس وقت مجھے کتے کی طرح دھتکار دیا جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس کی اور اس کے گھر والوں کی اور ان سب نے مجھ سے ناطہ توڑ لیا۔ اف .... میں کس قدر اکیلی ہوں........ کس قدر اکیلی ہوں۔"

تنہائی کا یہ خوفناک زہر' اماں کی موت کے بعد اس کے وجود کو بڑی تیزی کے ساتھ چاٹنے لگا۔

اب کوئی آنے والا نہیں تھا........ اب اسے کسی کا انتظار نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اس کی کوئی ملاقات نہیں آئے گی۔ کوئی آنے والا اب نہیں رہا تھا۔ ابا اور اماں کے سوا اور کون تھا؟ سو وہ دونوں بھی اب جا چکے تھے .... اب کچھ باقی نہیں بچا تھا .... باہر اندھیرا تھا .... اس اندھیرے میں دور دور تک امید کی کوئی کرن موجود نہیں تھی۔ باہر سے اب کوئی اچھی خبر آنے والی نہیں تھی۔ باہر بھی اندھیرا تھا اور اندر بھی اندھیرا تھا اور خود اس کے اپنے وجود کے اندر بھی اندھیرا تھا .... اندھیرا ہی اندھیرا .... اور یہ اندھیرا اس کو مٹائے ڈال رہا تھا۔ اس کو کھائے جا رہا تھا۔

برسوں گزر گئے اور مجی اس اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں جیسے ڈوب کر رہ گئی تھی۔ رہائی میں اب زیادہ دن باقی نہیں تھے۔ کافی معافیاں مل چکی تھیں اور بس اب کچھ دن کی بات تھی کہ اس کو رہائی کا پروانہ ملنے والا تھا۔

"لیکن وہ رہا ہونے کے بعد کہاں جائے گی اور کیا کرے گی؟" متوقع رہائی کی خوشی کے ساتھ ہی' یہ سوال ایک سیاہ ناگ کی طرح اپنا پھن پھیلا کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا اور اپنی زہریلی آنکھوں سے اسے گھورنے لگتا۔ یہ سوال اسے بہت کچھ سوچنے کی اور بار بار سوچنے کی دعوت دیتا تھا۔

"گھر تو موجود ہے .... خالی ہو گا .... اور گھر کا سارا سامان تایا ابا کے پاس ہو گا .... وہاں جا کر دیکھوں گی .... گھر کا سارا سامان واپس لا کر اسے ٹھیک ٹھاک کروں گی .... پھر کوئی کام دھندا دیکھوں گی .... اب تو اس کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ آخر ہزاروں عورتیں اس شہر میں کام کرتی ہیں۔ میں بھی کروں گی تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ اور اگر کام نہیں کروں گی تو کھاؤں گی کہاں سے؟"

خالی ڈھنڈار زندگی آگے پڑی تھی۔ جس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف خلا ہی خلا تھا .... زندگی' ہر قسم کی امنگوں اور جذبوں سے خالی' چولہے کی ٹھنڈی اور بے مصرف راکھ جیسی زندگی .... اور وہ اس زندگی کو اپنانے پر' اسے گزارنے پر مجبور تھی۔

☆======☆======☆

"حنیف!" جیل کے ایک افسر' کرم خان نے اپنے ماتحت ہیڈ کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جو مجی ہے نا' ماجدہ ولد عبدالشکور .... آج سے تقریباً چھ ماہ بعد رہا ہونے والی ہے۔ میں نے اس کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اس میں ابھی بہت جان ہے .... چلے گی .... یہ ان عورتوں میں سے ہے جن کا کوئی وارث نہیں ہے ....

ماں باپ دونوں مر چکے ہیں۔ برسوں کے دوران کوئی ملاقات نہیں آئی .... ذرا اس کے پتے پر جا کر خاموشی سے اس کے بارے میں معلوم تو کرو............ میرے خیال میں تو اس کے پاس واپسی کا اب کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔“

”وہ پہلے سے میری نظر میں ہے سر!“ حنیف نے جواب دیا۔ ”سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ معافیاں وغیرہ نکال کر سزا کافی کم ہو گئی۔ اب اس کی رہائی قریب ہے اور میں پہلے ہی اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔ اس کے گھر کے پتے پر بھی جا چکا ہوں............“ اور وہ اپنے سرغنے کو یعنی اپنے افسر کو‘ اس کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔ کرم خان بڑے غور سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

”پھر تو کام بن گیا۔“ کرم خان نے اس کی بات سن کر ایک حیوانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ مسکراتے وقت اس کا منہ اس طرح ٹیڑھا ہو گیا تھا جیسے کوئی کتا مزے دار ہڈی چباتے ہوئے اپنے منہ کو ایک طرف جھکا لیتا ہے اور اسے بار بار جھٹکے دینے لگتا ہے۔

”بنا ہی سمجھئے سر!“ حنیف کی بے درد آواز متوقع کامیابی کی بدبودار کیچڑ میں لت پت تھی۔ ”میں تو کافی عرصے سے اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔“

”بس اپنا کام کئے جاؤ۔“ کرم خان نے کہا۔ ”چڑیا اڑ کر کہیں اور جانے نہ پائے۔“

”نہیں سر!“ حنیف نے کہا۔ ”جال کے پھندے مضبوط ہونے چاہئیں۔ بھلا چڑیا بھاگ کر کہاں جا سکتی ہے؟ آپ دلشاد سے بات کر لیجئے۔“

”اس کی کوئی جلدی نہیں ہے۔“ کرم خان نے کہا۔ ”جب وقت آئے گا تب دلشاد سے بھی بات کر لیں گے۔ ابھی تو کئی ماہ باقی ہیں .... تم اپنا کام تو جاری رکھو۔“

☆======☆======☆

”ارے کیسی ہے تو مجی!“ حنیف نے بڑی نرم و مہربان آواز میں مجی سے پوچھا۔ مجی اس وقت فیکٹری میں کھانے کے وقفے کے دوران کھانا ختم کر کے دوبارہ کام پر بیٹھنے کی تیاری کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں حوالدار جی!“ مجی نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ”اللہ کا شکر ہے۔“

حنیف کی تجسس آمیز اور ناقدانہ نظریں مجی کے جسم کے ایک ایک حصے کے گوشت کو تول رہی تھیں اور اس بات کا حساب کر رہی تھیں کہ اس گوشت میں ابھی کتنا کساؤ موجود ہے اور منڈی میں اس کی کتنی قیمت لگ سکتی ہے۔

اگرچہ زندگی نے‘ جیل کے اندر بھی اور جیل کے باہر بھی‘ مجی کو آسیب وقت کا ایک

شکار گزیدہ بنا کر رکھ دیا تھا لیکن پھر بھی اس کی عمر ابھی زیادہ نہیں تھی۔ وہ اب بھی ایک بھرپور جوان عورت تھی اور اس کے چہرے میں‘ اس کے جسم میں نسوانی کشش موجود تھی۔

”تھوڑی سی صفائی ستھرائی‘ رنگ پالش کی ضرورت ہے۔“ حنیف نے دل میں سوچا۔ ”بس‘ ایک دم چمک اٹھے گی اور پھر تو خوب چلے گی۔“

وہ مجی کے فی کلو گوشت کی قیمت میں سے اپنے حصے کا حساب کتاب کرنے لگا۔

”تیری رہائی بہت قریب آ رہی ہے مجی!“ حنیف نے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”بس تھوڑے سے دن باقی ہیں مگر جائے گی کہاں؟ تیرے تو والدین بھی اب اس دنیا میں باقی نہیں ہیں۔“

”گھر تو ہے حوالدار جی!“ مجی نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”ایک بار گھر پہنچ جاؤں گی تو پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“

”اللہ تجھے خوش رکھے بی بی!“ حنیف نے کہا۔ ”بس یہاں سے جانے کے بعد کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ دوبارہ یہاں آنا پڑے۔ غلطی انسان ہی سے ہو جاتی ہے۔ ایک بار غلطی ہو گئی............ معاف کرنے والا اللہ ہے۔“

”ہاں حوالدار جی! معاف کرنے والا اللہ ہے۔“ مجی نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا۔ اسے حوالدار کے رویے میں ہمدردی کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

اور اس دن کے بعد سے حوالدار حنیف کا رویہ اس کے لئے کچھ زیادہ ہی نرم و مہربان ہوتا گیا اور اگر مجی اس بات کو محسوس کر سکتی تو اس کو اندازہ ہوتا کہ حوالدار حنیف پچھلے خاصے عرصے سے اس پر کچھ زیادہ مہربان ہو رہا تھا لیکن مجی نے اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

”سن بی بی!“ اس روز حوالدار حنیف نے مجی سے کہا۔ ”اگر رہائی کے بعد تجھے کوئی پریشانی ہو‘ کوئی مشکل ہو‘ تو میں تجھے ایک پتہ دوں گا۔ میری بہن کے گھر کا پتہ ہے۔ سیدھی وہاں چلی آنا۔ وہ بڑی نیک اور خدا ترس عورت ہے۔ اس نے اس سے پہلے بھی جیل سے رہا ہونے والی کئی بے سہارا اور لاوارث عورتوں کو سہارا دیا ہے اور ان کی مدد کی ہے۔ وہ تیری بھی ضرور مدد کرے گی۔ بلکہ اگر تُو کہے گی تو میں خود تجھ کو اپنے ساتھ اپنی بہن کے گھر لے چلوں گا۔“

”تم مجھے بہن کا صرف پتہ دے دینا حوالدار جی!“ مجی نے اس کی پیشکش سے بہت

زیادہ متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ حوالدار حنیف ابھی پچھلے کچھ ہی دنوں سے یہاں آیا تھا اور اس کا رویہ خاص طور سے مجی کے ساتھ تو بہت اچھا تھا۔ ساری دنیا سے کٹ کر ایک علیحدہ چہار دیواری میں بند ہو جانے کی اذیت اور صعوبت کے علاوہ جو بے توقیری' تذلیل' تحقیر اور توہین ایک عام قیدی کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے' مجی اس سے خوب واقف تھی اور ہر دم ٹھکرائے جانے کا احساس اس کے رگ و پے میں اتر چکا تھا۔ ان گزشتہ برسوں کے دوران اس کی آنکھوں نے اس چہار دیواری کے اندر کیسے کیسے بھیانک تماشے نہیں دیکھے تھے اور اب تو آنکھوں میں جیسے کچھ اور دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں رہا تھا۔ مگر حوالدار حنیف اسے دوسروں سے قدرے مختلف نظر آ رہا تھا۔ ہمدردی کرنے والے بعض لوگ اس سے پہلے بھی ملے تھے لیکن حنیف کے رویے میں کچھ ایسی خاص بات تھی جو دل کو اس کی طرف کھینچتی تھی۔ اس کے طرز عمل میں خلوص اور بے لوثی کی جھلک نظر آتی تھی۔ آخر پانچوں انگلیاں ایک سی تو نہیں ہوتیں۔

"میں .... میں .... ویسے بھی تمہاری بہن سے ملنا چاہوں گی حوالدار جی!" اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہاں سے جانے کے بعد کچھ کام دھندا کرنا چاہتی ہوں۔ محنت مشقت .... آخر پیٹ کا عذاب تو انسان کے ساتھ لگا ہی ہوا ہے نا؟"

"ہاں مجی تُو ٹھیک کہتی ہے۔" حنیف نے کہا۔ "میں تجھے اپنی بہن کا پتہ دے دوں گا۔ اس سے ضرور مل لینا۔ وہ تجھے بہت اچھا کام دلوا دے گی۔ وہ اب تک کتنی ہی بے سہارا عورتوں کو کام دلوا چکی ہے اور اب وہ آرام کی زندگی گزار رہی ہیں۔ دیکھو نا' ایک عورت کے لئے اور وہ بھی تیری جیسی جوان عورت کے لئے جیل سے باہر نکل کر عزت کی زندگی گزارنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے .... لوگوں کی زبانیں.........."

"ہاں حوالدار جی!" مجی نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ "میں سمجھتی ہوں .... واقعی' یہ سب کچھ بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"میری بہن تیری ہر مشکل کو آسان کر دے گی' مجی!" حنیف نے کہا۔ "بس ایک بار اس سے مل کر دیکھ لینا۔"

☆======☆======☆

"کل مجی کی رہائی ہے حنیف!" کرم خان نے حنیف سے کہا۔ "تم نے سارا کام پکا کر لیا ہے نا؟"

"میں کوئی کچا کام نہیں کرتا ہوں سر!" حنیف نے کسی حریص کتے کی طرح دانت نکالتے ہوئے کہا۔ جس کے منہ میں کوئی ہڈی دیکھ کر پانی بھر آیا ہو۔ "میں نے سب کچھ ٹھیک کر لیا ہے۔ سارا معاملہ تیار ہے۔ وہ کہیں اور جا ہی نہیں سکتی سر .... اس کا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ آخر جائے گی کہاں؟ اس کا گھر.......... ہی ہی ہی.........." وہ کسی عفریت کی طرح ہنسا۔

"دلشاد کو میں نے اس کے بارے میں بتا دیا ہے۔" کرم خان نے کہا۔ "وہ اس کا انتظار کرے گی۔"

"میں ان شاء اللہ خود ہی اس کو لے کر وہاں پہنچوں گا سر!" حنیف نے کہا۔ "خوشی خوشی جائے گی .... آپ یوں سمجھ لیجئے کہ خدا نے اسے ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے .... ویسے دلشاد کتنے پر.........."

"اس کی فکر مت کرو۔" کرم خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ سالی اگر زیادہ نخرے بازی کرے گی تو ہم مجی کو لاہور بھجوانے کا بندوبست کر دیں گے لیکن اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ دلشاد نے ابھی اس کو دیکھا نہیں ہے۔ جب دیکھ لے گی تو پھر وہ اس کو چھوڑے گی نہیں۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" حنیف نے کہا۔

"اور تم اطمینان رکھو.........." کرم خان نے اس کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"شکریہ سر!" حنیف نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

مجی کو جس وقت جیل سے رہا کیا گیا تو اس کو حوالدار حنیف کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ اس نے اس کو کافی تلاش کیا لیکن وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ پھر اس کے پوچھنے پر کسی نے اس کو یہ بتایا کہ حوالدار حنیف آج چھٹی پر تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" مجی نے کہا۔ "اس کا دیا ہوا پتہ تو میرے پاس موجود ہے .... اس کی بہن' دلشاد بیگم کا پتہ .... پہنچ جاؤں گی .... کسی' دن جا کر اس نیک دل عورت سے مل لوں گی .... ابھی سب سے پہلے تو گھر کی کچھ خیر خبر لینا چاہئے۔"

اور گھر کی یاد کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہہ نکلے۔ نہ جانے

وہ کچا پکا' چھوٹا سا مکان اب کس حال میں ہو گا .... کتنے برس گزر گئے .... نہ جانے کتنا حصہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہو گا .... جب وہ وہاں سے باہر نکلی تھی تو اماں تھیں۔ ابا تھے' ان کی طویل رفاقت' ان کے آپس کے جھگڑے' ان کی بیزاری اور برہمی اور ان کی یگانگت اور بے چینی وہ سب کچھ تھا......... اور اب کیا تھا......... اب تو وہاں خاک ہی اڑ رہی ہو گی۔ اماں اور ابا تو کب کے خود بھی خاک ہو چکے تھے۔

اسے اپنے گھر کا راستہ بخوبی یاد تھا۔ اس کے ذہن میں باہر کی ساری دنیا اسی طرح محفوظ تھی جس طرح وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی اور جب وہ جیل کی چہار دیواری سے باہر نکلی تو یہاں کا منظر تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ آج سے برسوں پہلے تھا۔

لیکن وہ اس جگہ جا کر بھٹک گئی جہاں اس کا گھر ہوا کرتا تھا۔ نارتھ ناظم آباد اور نیو کراچی کے درمیان' وہ ایک بہت بڑا میدان' جس میں وہ بستی آباد تھی' اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"شاید میں غلط جگہ پر آ گئی ہوں۔" اس نے رکشہ سے اترنے کے بعد' اِدھر اُدھر اچھی طرح سے دیکھتے ہوئے سوچا لیکن نہیں' وہ غلط جگہ پر نہیں آئی تھی۔ وہاں موجود کچھ بہت اچھی طرح جانی پہچانی پرانی عمارتیں اس امر کو یقینی بنا رہی تھیں کہ وہ صحیح جگہ پر آئی ہے لیکن بستی کہاں غائب ہو گئی؟

جس جگہ پر بستی ہونی چاہئے تھی' وہاں دور دور تک فلیٹوں کے ڈھانچوں کے بلاک نظر آ رہے تھے۔ کئی منزلہ عمارتوں کا ایک سلسلہ تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا اور یکایک اس پر انکشاف ہوا کہ یہی تو وہ جگہ تھی' یہی تو وہ میدان تھا جس میں اس کی بستی ہوا کرتی تھی اور اب اس بستی کا کوئی وجود نہیں تھا......... یہاں تو فلیٹ بن رہے تھے' ڈھانچے تعمیر ہو چکے تھے اور مزید کام جاری تھا۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ اس بات کی تو اسے کسی نے خبر بھی نہیں دی تھی .... اور خبر دیتا بھی کون؟ برسوں سے تو کوئی اس سے ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ اماں کے مرنے کے بعد باہر کی دنیا سے تو اس کا رابطہ ختم ہی ہو چکا تھا۔

اسے ایک آدمی مزدوروں کو ہدایات دیتا نظر آیا۔ شاید کوئی ٹھیکہ دار وغیرہ تھا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس گئی اور اس سے اس بستی کے بارے میں پوچھنے لگی جو کبھی اس زمین پر موجود ہوتی تھی۔

وہ آدمی اس کے سوال پر چونک پڑا اور حیرت سے اسے گھورنے لگا۔ اس نے سر سے پاؤں تک' بغور اس کو دیکھا۔

"کافی زمانہ ہوا کہ وہ بستی یہاں سے ختم ہو گئی۔" اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ "یہاں تو آپ دیکھ رہی ہیں' فلیٹ اور پلازا بن رہے ہیں۔"

"اور وہ گھر' جو یہاں تھے' وہ لوگ' جو رہتے تھے' وہ کہاں چلے گئے؟" مجی کی آواز ڈوبی جا رہی تھی۔

"ان لوگوں کا اس زمین پر ناجائز قبضہ تھا۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "پھر بھی حکومت نے ان کے ساتھ رعایت کی اور انہیں مختلف جگہوں پر متبادل پلاٹ دے دیئے۔ کچھ لوگوں کو اورنگی ٹاؤن میں زمینیں دے دی گئیں' کچھ کو پورٹ قاسم کے علاقے میں لیکن زیادہ تر لوگ تو اپنی زمینیں بیچ بیچ کر شہر میں ہی کہیں اِدھر اُدھر چلے گئے۔"

آلام کے پیچاک میں وہ بھی گم ہو گیا .... مجی' حیران پریشان' فلیٹوں کے ڈھانچوں کے اس پتھریلے جنگل میں کھڑی ہوئی اپنے گمشدہ گھر کی نشست کو تلاش کر رہی تھی .... تلاش کیا کر رہی تھی .... بس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ گھر کو تو فلیٹوں کے نہ جانے کون سے بلاک نے نگل لیا تھا۔

"آپ کو کس کی تلاش ہے؟" اس شخص نے پوچھا۔ "کس سے ملنے کے لئے آئی ہیں آپ؟"

اسی وقت ایک جانب سے اچانک حنیف نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر تفکر اور ملال کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔

"ارے یہ کیا ہو گیا؟" اس نے مجی کے پاس آ کر درد بھری آواز میں کہا۔ "یہ سب یہ سب کیا ہو گیا؟" اور وہ مجی کو ساتھ لے کر وہاں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ وہ آدمی دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔

"میں آج چھٹی پر تھا۔" حنیف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ آج تیری رہائی ہے' سو میں فوراً ادھر بھاگ آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تو سیدھی یہیں آئے گی' اپنے گھر' پتہ تو مجھے معلوم تھا لیکن یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بستی تو برسوں پہلے ختم ہو گئی اور اس ساری زمین پر دکانیں اور فلیٹ بننے لگے اور پھر میں یہاں تیرے ہی انتظار میں رک گیا۔ یہ تو بہت برا ہوا مجی! تیرا تو اب کوئی گھر ہی نہیں رہا........." وہ اپنی درد بھری آواز میں چھپی ہوئی مسرت کو دبانے کی پوری کوشش کر رہا

تھا۔ اسے تو یہاں تک معلوم تھا کہ عبدالصمد' اس کی بیوی اور اس کا بیٹا عبدالرزاق' پچھلے دو سال سے سرجانی ٹاؤن میں رہ رہے ہیں۔

"میں .... اب کہاں جاؤں؟" مجی فلیٹوں کے ڈھانچوں کی طرف منہ کر کے رونے لگی۔ "میرا تو گھر بھی چھن گیا .... میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں رہا .... تایا اور تائی نہ جانے کہیں چلے گئے۔"

"اب ان کو تلاش کرنا کوئی آسان تھوڑی ہے۔" حنیف نے کہا۔ "اتنی بڑی آبادی والے شہر میں خدا جانے کہاں ہوں گے .... تو اب میرے ساتھ میری بہن کے گھر چل .... پھر کہیں نہ کہیں ان کو ڈھونڈتے ہیں لیکن ایک بات تو بتا دے مجی! اگر وہ لوگ مل بھی گئے تو کیا وہ .... تجھے اپنا لیں گے؟ تجھے رکھ لیں گے اپنے پاس؟"

"معلوم نہیں۔" مجی نے ناامیدی اور بے بسی کے ساتھ جواب دیا۔ "لیکن .... میرے گھر کا سامان .... کچھ .... میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"اچھا چل' تُو میرے ساتھ چل۔" حنیف نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بہن کے گھر چلتے ہیں۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ میں خود یہاں آ گیا۔ میں تو اس لئے آیا تھا کہ تیرا گھر دیکھ لوں اور تیرے تایا سے مل کر اسے ذرا سمجھا دوں کہ تیرے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ مگر یہاں آیا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ تیرا تو گھر ہی غائب ہو گیا۔"

مجی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اس ایک لمحے کی غلطی نے' جنون و غضب کی اس ایک لمحاتی لہر نے اسے اس کے دونوں گھروں سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا تھا .... اس کی سسرال بھی گئی .... اور میکہ بھی گیا اور اب وہ نوتعمیر شدہ گھروں کے اس جنگل میں کھڑی ہوئی' اپنے گمشدہ گھر کی خاک تلاش کر رہی تھی .... لیکن خاک تو ہوا میں منتشر ہو کر ناپید ہو گئی تھی۔

حوالدار حنیف نے اسے ٹیکسی میں بٹھایا اور پھر وہ اسے لے کر شہر کے ایک متمول علاقے میں جا پہنچا۔ ٹیکسی ایک عالیشان کوٹھی کے سامنے رکی' جس کے بند گیٹ کے باہر ایک کلاشنکوف بردار گارڈ کھڑا ہوا تھا' حنیف نے مجی کو ٹیکسی سے اتارا اور گارڈ نے اس کو سلام کر کے گیسٹ کی کھڑکی کھول دی۔

"اس حوالدار کی بہن تو کوئی بہت ہی زیادہ مالدار عورت معلوم ہوتی ہے۔" مجی نے مرعوبیت کے ساتھ سوچا۔ اس قدر شاندار کوٹھی .... یہ ٹھاٹھ باٹھ۔

ان دونوں کے اندر آنے کے بعد گارڈ نے گیٹ کی کھڑکی کو پھر بند کر دیا اور اسی

طرح مستعد باہر کھڑا ہو گیا۔

☆======☆======☆

مجی آگے بڑھتے ہوئے ٹھٹک رہی تھی۔ اس نے آج تک ایسے کسی شاندار مکان میں قدم نہیں رکھا تھا۔ شاید حوالدار کا بہنوئی کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ وہ ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اپنے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"ارے آ جا بھئی آ جا۔" حوالدار حنیف نے اس کی کیفیت کو بھانپ کر اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "اپنا ہی گھر ہے' میری بہن کا گھر ہے' بے کھٹکے چلی آ۔" اور پھر مجی اس کے ساتھ ایک شاندار کمرے میں داخل ہو گئی جو قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ حنیف بھی اس کے ساتھ تھا۔ ذرا دیر کے بعد کمرے کے اندرونی دروازے سے ایک پکی عمر کی' بھاری بھرکم سی' سانولی رنگت کی عورت نکل کر آئی۔ حنیف نے اس عورت کا تعارف اپنی بہن دلشاد کے طور پر کرایا لیکن نہ جانے کیوں' مجی کو وہ عورت کچھ اچھی نہیں لگی۔ وہ جن نظروں سے مجی کو دیکھ رہی تھی ان سے مجی کو ایک خاص قسم کی بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یہ کسی بہن کی نظریں نہیں لگ رہی تھیں۔ یہ تو کچھ عجیب ہی قسم کی نظریں تھیں۔ مجی ان نظروں کا مفہوم بڑی حد تک سمجھتی تھی۔ لمبی مدت کے لئے جیل میں رہنے والی قیدی عورتیں ایک دوسرے کے لئے ان نظروں کا مفہوم خوب سمجھتی تھیں۔ مجی کو بھی جیل میں بارہا ایسی نظروں سے اور ان میں مخفی اشاروں کنایوں سے واسطہ پڑتا لیکن اس خاص قسم کے معاملات میں کبھی کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی۔ تاہم جیل میں یہ سب کچھ حیرت انگیز نہیں تھا۔

اور اب حوالدار حنیف کی بہن دلشاد بیگم بھی اسے کچھ اس ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں اب چلتا ہوں مجی!" حنیف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کئی کام ہیں' ایک آدھ دن میں مَیں پھر چکر لگا لوں گا۔ تُو یہاں بے فکر ہو کر رہنا۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو آپا کو بتا دینا' وہ تیرا پورا پورا خیال رکھیں گی۔"

مجی اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اسے یہاں رہنے کا خیال کچھ زیادہ اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اگر وہ منع کرے تو کس بنیاد پر؟ اور پھر .... اگر یہاں نہیں تو پھر کہاں؟ اس کا تو اب گھر بھی غائب ہو گیا تھا اور تایا اور تائی کا بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ انسانوں کے اس وسیع و عریض جنگل میں وہ انہیں کہاں

تلاش کر سکتی تھی۔

حنیف اس کی کیفیت کو کسی قدر سمجھ رہا تھا۔ "میں تیرے تایا کی تلاش میں لگا ہوا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کسی وقت کچھ پتہ چل جائے۔ تُو اطمینان رکھ۔ جیسے ہی مجھے کچھ پتہ چلے گا تجھے بتاؤں گا۔ خود اسے تیرے پاس لے کر آؤں گا۔" اور پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔ مجی اس سے مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

"تو تیرا میاں کسی اور عورت کے ساتھ پھنسا ہوا تھا اور تُو نے اس عورت کو مار دیا۔" دلشاد بیگم نے سرد اور بے مہر لہجے میں اس سے پوچھا۔ مجی کو اس کے اندازِ گفتگو میں دردمندی کی کوئی جھلک بھی محسوس نہیں ہوئی۔

"بس آپا، غلطی ہو گئی۔" مجی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اس وقت مجھے غصہ آ گیا، اور میں غصے میں اندھی ہو گئی .... میں.........."

"مارنا ہی تھا تو اپنے مرد کو مارا ہوتا بے وقوف عورت!" دلشاد نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اس عورت کو مار کر تجھے کیا ملا؟ وہ مرد حرامی تو پھر بھی تیرا نہ ہو سکا، اس نے تجھے دھتکار دیا۔"

"تو اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔" مجی نے دل ہی دل میں کہا اور دلشاد کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دلشاد کی نظریں اس کے جسم کے ایک ایک گوشے کو اس طرح ٹٹول رہی تھیں کہ مجی کا بے ساختہ ہی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

"کافی دبلی ہو رہی ہے تُو!" دلشاد بیگم نے اس کے بدن پر جگہ جگہ اپنی نظروں کی برچھیاں گاڑتے ہوئے کہا۔ "تھوڑا سا وزن بڑھانے کی ضرورت ہے لیکن زیادہ نہیں، مرد موٹی عورتوں کو پسند نہیں کرتے۔"

مجی کے دماغ میں ایک زور کا جھماکا ہوا اور کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ آنِ واحد میں وہ دلشاد کی نظروں کا مطلب مکمل طور پر سمجھ گئی تھی۔ یہ نظریں اس کے جسم میں اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کچھ تلاش کر رہی تھیں اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

"مرد؟" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "مگر .... مجھے مردوں سے کیا لینا ہے؟"

"روٹی روزی۔" دلشاد نے فوراً جواب دیا۔ "تجھے اب مردوں سے ہی اپنی روٹی روزی حاصل کرنی ہے۔ میں بھی یہی کرتی آئی ہوں اور میرے ساتھ موجود دوسری لڑکیاں بھی .... اور اب تجھے بھی یہی کرنا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" مجی نے تڑپ کر کہا۔ "میں .... میں .... یہ سب نہیں کر سکتی۔ آپ حنیف کو بلا دیں میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"وہ دلاّ اب یہاں نہیں آئے گا۔" دلشاد نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "وہ رقم لے جا چکا ہے۔"

☆======☆======☆

مجی کا موجودہ نام بجلی خانم ہے اور جب وہ اپنے گاہکوں کے سامنے اپنے کپڑے اتارتی ہے تو اس کے لئے اپنی پشت اور کمر پر موجود ان آڑے ترچھے نیلے نشانوں کو چھپانا ممکن نہیں ہوتا جو ہفتوں تک دلشاد بیگم کے چمڑے کے ہنٹروں کی بے رحمانہ اور مسلسل مار کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔

☆====== ختم شد ======☆